ناول
ایوانوں کے خوابیدہ چراغ
نورالحسنین

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

(ناول)

نورالحسنین

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

Aiwanon Ke Khabeeda Chiragh
by Noor-ul-Hasnain
Edition : 2013
Rs.: 380/-

© نور الحسنین

نام کتاب : ایوانوں کے خوابیدہ چراغ
مصنف : نور الحسنین
پتہ : ۳۱-۱۲-۱، برگتی کالونی، گھاٹی، اورنگ آباد
مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پریس، دہلی
سرورق تزئین : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi -110095 (INDIA)
Mob: 9971775969, 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.

انتساب

ملک کی جد و جہدِ آزادی کے اُن تمام
شہیدوں کی یاد میں
اُن کے نام
جو آزادی کے بعد آج تک بھی آسودگیوں کی چاہ میں
جد و جہد کیے جا رہے ہیں۔

نورالحسنین

دو باتیں آپ سے !

میرا نیا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اس کے تعلق سے کسی قسم کا دعویٰ کرنا نہیں چاہتا کہ میرا کام تو صرف لکھنا ہے۔ اسے قبول کرنا یا رد کرنا یہ آپ کا اختیار ہے۔ اس ناول کو لکھنے کا خیال میرے دل میں اس طرح آیا کہ میں ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کی تنقیدی کتاب ''اردو میں بیانیہ کی روایت'' پڑھ رہا تھا۔ اُس میں اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا اتنا بڑا مومنٹ مکمل طور پر ہمارے کسی ناول کا حصہ نہیں بن سکا۔ اسے پڑھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی اور میں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور آٹھ فروری ۲۰۱۲ء کی رات دو بجے اس ناول کی پہلی سطر نے کاغذ کی سطح پر آنکھ کھولی اور آٹھ مئی ۲۰۱۲ء کی رات دو بجے اس ناول کی آخری سطر نے اپنے مکمل ہونے کا اعلان کیا۔ یہ تین ماہ میں نے اسی جنون میں بسر کیے۔ مجھے نہیں معلوم میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اس کا موضوع تاریخی ہے۔ عام طور پر ایسے ناولوں میں عام افراد کی زندگی، ان کی سوچ، اُن کی قربانیاں اور اُن کے معاشرتی رہن سہن پر روشنی نہیں پڑتی اور نا ہی کسی ایسی ناول میں عام آدمی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

میرے اس ناول میں مرکزی کردار وہ عام لوگ ہیں جو اپنے وقت کے تاریخی جبر سے دوچار ہوئے تھے جنھوں نے وقت کے اُس لمحے کو بھوگا بھی تھا، شریک بھی ہوئے تھے اور قربانیاں بھی دی تھیں لیکن مورخ کا قلم صرف شاہان وقت کی افتاد کا ہی نوحہ گر رہا، عام افراد کی زندگیوں سے وہ ایک طرح سے لاتعلق ہی رہا چنانچہ میرے اس ناول میں جو فرضی کردار ہیں وہ اُس زمانے کے عام افراد کی نمائندگی کرتے ہیں اور تاریخی شخصیات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔

اس ناول کو لکھنے کی جسارت کے پیچھے ایک وجہ یہ بھی رہی کے میرے ہمعصروں نے تاریخی موضوعات پر کوئی ناول نہیں لکھا تھا البتہ دیگر سماجی، سیاسی، معاشرتی موضوعات پر اُنھوں نے نہایت اچھے ناول لکھے ہیں جن کی ادب کے میزانوں میں خوب پزیرائی بھی ہوئی۔ جس نے میرے حوصلوں کو بحال کیا اور میں نے اس ناول کو لکھنے کا بیڑہ اُٹھایا، میں نے پوری کوشش کی کہ تاریخی واقعات، کردار، ماحول کی صحیح عکاسی کرسکوں۔ اس کے لیے جس قدر میں مطالعہ کرسکتا تھا، میں نے کیا اور تاریخی واقعات کی صحت کا خیال رکھا۔ ساتھ ہی بعض تاریخی روزناچوں سے خصوصاً قدیم دلّی اور اندرون قلعہ معلّٰی کے شب و روز کے مناظر کا راست استعفادہ بھی اُٹھایا۔ میں اُن تمام مصنفین کا ممنون و مشکور ہوں کہ اگر وہ اُن تاریخی واقعات کے مناظر کو قلمبند نہ کرتے تو شاید آج میں بھی یہ کام نہ کرپاتا۔

میں اپنے ہمعصر مشہور ادیب مشرف عالم ذوقی کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھے پھر سے ناول نگاری کی طرف راغب کیا، میری ہمت بندھائی، مجھے میری صلاحیتوں کا احساس دلایا میں اپنے نوجوان دوست ابوبکر رہبر اور ممتاز محقق اسلم مرزا کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے مجھے اس موضوع پر کتابیں فراہم کیں، اپنے دوست افسانہ نگار عارف خورشید، نوجوان ادیب رحمٰن عباس اور اپنے شاگرد سید امجد الدین قادری کا بھی مشکور ہوں کہ وہی اس ناول کے پہلے قاری رہے ہیں اور مجھے اپنے مشوروں سے نوازتے رہے ہیں، ساتھ ہی اُن تمام احباب

کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کے اصرار نے اس ناول کو مکمل کروایا۔
بہر حال یہ ناول اب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور مجھے آپ کی قیمتی آرا، کا انتظار ہے۔ میں آپ تمام کا بھی پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شکریہ

نورالحسنین

(۱)

رات اپنا ایک پہر گزار چکی تھی اور یہ منچلے داروغہ کی گرفت سے بے نیاز ایک ویران قبرستان کی چار دیواری کے اندر آگ تاپتے ہوئے بیٹھے تھے۔ ماحول پر مکمل تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قبرستان میں موجود جھاڑیاں اور استادہ درخت، بالکل خاموش کھڑے تھے، جیسے کسی آنے والے طوفان سے پہلے سکوت چھا جاتا ہے۔

''اُف کتنی شدید ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔'' تارا بائی نے جلتی لکڑیوں کو اور آگے بڑھایا، اور زور سے پھونک ماری، چنگاریاں جگنوؤں کی طرح اُڑنے لگیں۔ حیدر خان نے دھوئیں کو ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے کُہر میں ڈوبے ہوئے قبرستان پر نظریں ڈالیں، جھاڑیاں اندھیرے میں عجیب شکلیں بنا رہی تھیں۔ اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری،

''ویسے یہ جگہ کافی محفوظ ہے۔''

''ہم نے اسے یونہی تو پسند نہیں کیا ہے حیدر بھائی۔'' پنڈت نے آگ کے شعلوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''یہاں سے ہمیں کوئی گرفتار نہیں کرسکتا۔''

تارا اور حیدر کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہمارے ساتھی ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔؟'' پنڈت نے دونوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آئیں گے۔۔۔ضرور آئیں گے۔۔۔اور کچھ انوکھی خبریں لے کر آئیں گے۔''

''ملک کے عجیب حالات ہو گئے ہیں۔کیا کہتے ہو اس سلسلے میں حیدر بھائی۔؟'' پنڈت نے اپنی کمبل کے سرے کو پیٹھ پر ڈالتے ہوئے سوال کیا،حیدر خان نے اپنی دونوں مُٹھیوں کو تیز تیز کھول بند کیا اور پھر دونوں ہاتھوں کو سختی سے جوڑتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہنا شروع کیا،''سارے ہندوستان میں ایک عام سی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔جیسے کچھ ہونے والا ہے۔''

تارا بائی نے حیرت سے حیدر خان کی طرف دیکھا،''بھگوان جانے کیا ہونے والا ہے۔؟''

''دیکھتی جاؤ۔۔۔!''اس نے پھر ایک بار قبرستان کی طرف نظریں دوڑائیں،اور پھر اُس کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔

''آسمان میں کچھ نہیں ہے حیدر بھائی!یہ جو حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں نا،اس میں کچھ بھی آسمانی نہیں ہے،یہ سب کچھ گوروں کا کیا دھرا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو پنڈت۔''حیدر خان نے پھر ایک بار ٹھنڈی آہ بھری،''وہ دن لد گئے جب چاندنی چوک میں بہاریں آتی تھیں،درگاہ نظام الدین اولیا میں میلہ سا لگتا تھا،جمنا کے کنارے امن وشانتی کے ناقوس گونجا کرتے تھے،لال قلعہ سے نوبتیں جھڑتی تھیں اور جامعہ مسجد کی سیڑھیوں پر کوئی بھوکا نہ سوتا تھا۔''

''سچ کہتے ہو حیدر بھائی۔''تارا نے بھی ایک ٹھنڈی آہ بھری،''یہ گورے آخر ہم لوگوں کو کیا سمجھتے ہیں۔؟ارے ہم کیا کوئی جانور ہیں کہ جس طرح چاہیں ہانک لیں۔''

پنڈت نے کچھ لکڑیوں کو آگ میں جھونکتے ہوئے کہنا شروع کیا،''تارا بہن اب زمانہ بدل رہا ہے۔جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے،جیسے ہم ہندوستانیوں کو اب عقل آنے لگی ہے۔''

''ہاں دل کو بہلانے کے لیے یہ خیال اچھا ہے۔''

''پنڈت کیا جیل کی چار دیواریوں میں تم یہی خواب دیکھتے تھے۔؟''

''خواب۔۔۔؟ حیدر بھائی محسوس تو سبھی کرنے لگے تھے، اور پھر جیلوں میں زیادہ تر کون لوگ تھے۔؟ وہ تھے جنھوں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تھا۔ ہم سب لوگ وہاں پر پرارتھنائیں کرتے تھے کہ بھگوان ان فرنگیوں کو ہمارے ملک سے بھگادے، اُنھیں موت دے، اور ہمیں اُن سے نجات دے۔''

حیدر خان کو ہنسی آ گئی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہوئی۔؟'' پنڈت نے بُرا سا منہ بنایا۔

''بُرا مان گئے پنڈت۔؟'' حیدر خان نے شعلوں کا رُخ پنڈت کی جانب موڑ دیا ایک گرم بھپارہ پنڈت کی طرف لپکا، ''میرے بھائی ابھی کچھ دیر پہلے تم ہی نے تو کہا تھا کہ حیدر بھائی آسمان میں کچھ نہیں ہے۔''

''تو''

''تو بھائی انگریز نہ مرے گا اور نہ اس دیش سے جائیگا۔''

تارا نے تیز نظروں سے حیدر خان کی طرف دیکھا۔

''اُسے ہمیں ہی بھگانا ہوگا۔''

دونوں کی ٹھنڈی آہیں نکل گئیں۔

''پنڈت جیل میں تو میں بھی تھا لیکن میں نے اُن کے مرنے کی دُعائیں نہیں مانگی'' میں وہاں پر فضاء تیار کر رہا تھا، ایسی نفرت کی، جو گوروں کے لیے ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے۔''

''پھر۔''

''لوگ سمجھنے لگے ہیں، لیکن ابھی زبان میں طاقت اور بدن میں گرمی پیدا نہیں ہو رہی ہے، لیکن مجھے یقین ہے۔ یہ سب ہوگا، ایک دن ضرور ہوگا، اس ملک کی کایا پلٹے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک بڑا انقلاب آ جائے۔''

''آہستہ کہو حیدر بھائی۔'' تارا نے دونوں کو اشارہ کیا، ''ہم ویرانے میں ضرور چھپے ہوئے ہیں لیکن پولس چوکی ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

''ہاں بہن۔۔۔!احتیاط بھی ضروری ہے، ورنہ پھر دھر لیے جائیں گے۔'' پنڈت نے دور بہت دور چوکی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، لیکن رات کی سیاہی اور پھر کُہر، اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

''اماں اس قدر ٹھنڈ میں کون ماں کا جنا پہریداری کرے گا۔'' حیدر خان نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''اس ویرانے میں کوئی نہیں آتا، بے خوف رہو۔''

دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''رات بیت رہی ہے، لیکن ابھی تک ہمارا کوئی ساتھی واپس نہیں آیا۔'' تارا کے لہجے میں شدید تشویش تھی۔

''انتظار کرو۔۔۔وہ آئیں گے۔وہ ضرور آئیں گے۔وہ انقلاب کی خبریں لے کر آئیں گے۔'' حیدر خان کے چہرے پر عجیب سی چمک پیدا ہوگئی تھی، اور آگ کی روشنی میں اُس کا چہرا دمک رہا تھا، ''پنڈت مجھے تو ان فرنگیوں سے جیسے نفرت ہوگئی ہے۔اُس روز میرا قصور ہی کیا تھا، یہی نا کہ میں نے گالی کا جواب گالی سے دیا تھا۔'' اُس نے گردن اونچی کی اور اُٹھتے ہوئے دھویں کو آسمان کی طرف جاتا ہوا دیکھنے لگا۔اُس کے دل و دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے، اور پھر جیسے سارا منظر اُس کی آنکھوں میں در آیا۔دور سورج کی روشنی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ چمک رہی تھی۔سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت تھی، اور جیسے ہی اُس کی نظریں گنبد سے ٹکرائیں، ایک سرور اُس پر غالب آنے لگا تھا، اور بے خودی کے عالم میں وہ جھوم اُٹھا، اُس کے قدم وجد کی صورت گردش کرنے لگے،

تیرا رنگ موہے بھایو
تیرا انگ موہے بھایو
تیرا سنگ موہے بھایو

موہے رنگ دینی

ہے ماں

رنگ دینی

مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میرے اطراف لوگ جمع ہونے لگے ہیں۔ میں بے خودی کے عالم میں اُسی طرح جھوم رہا تھا۔

موہے شب رکھیو، موہے شب دینی

موہے رب رکھیو، موہے رب دینی

موہے سب رکھیو، موری دیوانی

موہے کیوں فانی، اے لافانی

موہے رنگ دینی

ہے ماں

رنگ۔۔۔۔۔۔

اچانک میری پیٹھ پر کوڑا برسا، اور ایک قہقہہ سنائی دیا۔ گورا اپنی میم کے ساتھ بگھی میں جارہا تھا اور مجھ پر قہقہہ لگا رہا تھا۔ میں نے اُسے گھور کر دیکھا تو وہ حقارت سے دھاڑہ، ''باسٹرڈ انڈین۔''

جواب میں میں بھی چلایا، ''تم بھی تو سالا حرامی۔۔۔باسٹرڈ کی اولاد ہے۔''

اُس کی جاتی ہوئی بگھی رُک گئی، وہ نیچے کودا۔ اُس کے منہ سے گالیاں برس رہی تھیں۔ میں بھی سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا اور اُس کے ہاتھوں میں ہنٹر لہرا رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہنٹر کو جنبش دی اور اُس کی بدّی بجلی کی طرح میری طرف لپکی، لیکن وہ میری پیٹھ تک پہنچنے کے بجائے، میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ ایک زوردار جھٹکا دیا، اور گورا زمین پر آ رہا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے اُس پر اپنے لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر دی، لیکن اتنی دیر میں

خدا جانے کہاں سے اُس کے سپاہی آ گئے تھے۔ اُنھوں نے مجھے دبوچ لیا۔ میری بُری طرح پٹائی کی، اور مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ تین دن اور تین راتیں میں حوالات میں بند رہا، اور وہاں پر موجود سارے ہی قیدیوں کو اُن گوروں کے ظلم کی داستانیں سنا تا رہا، اور پھر وہاں پر ہم سب نے قسم کھائی تھی کہ اب ہم ان درندوں کا ظلم برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ چوتھا دن جب طلوع ہوا تو میں اور میرے چند ساتھی حوالات سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ داروغہ اور اُس کے ماتحت ابھی تک ہماری تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ میں وہاں سے فرار ہونے کے بعد اپنے گھر بھی نہیں گیا کہ وہاں اب میرا کون تھا؟ بس تب سے بدلے کی آگ سینے میں دبائے بھٹک رہا ہوں۔''

حیدر خان خاموش ہو گیا۔ لیکن اُس کا چہرا اب بھی بہت کچھ بول رہا تھا۔

''یہ صرف تمہاری کہانی نہیں ہے حیدر بھائی۔'' پنڈت نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کُلیا بنائی اور اُس میں زور سے پھونک ماری، گرم ہوا ہاتھوں میں پہنچی، ''ان ماں کے جنوں نے عام شہریوں کی زندگی تاراج کر کے رکھ دی ہے اور انھیں روکنے والا کوئی نہیں ہے۔''

''ہاں۔۔۔!'' حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا، ''ہمارے بادشاہ سلامت جو لال قلعے میں سمٹ گئے ہیں۔''

''ایک ہمارے بادشاہ ہی کیوں۔۔۔؟ دوسروں کا بھی تو یہی حال ہے۔''

''پنڈت جی۔!'' تارا نے آہستہ سے کہا، ''تم کو کیوں حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ تم تو کبھی کسی کو گالی بھی نہیں دیتے۔''

''وہ حوالات اُن کو اسی سادہ لوحی کے لیے بخشی گئی تھی۔''

''تو کیا ہم ان فرنگیوں کی وجہ سے اپنی شرافت کی زندگی تیاگ دیں۔؟''

پنڈت نے دونوں کی آنکھوں میں جھانکا، ''صدیوں کی پرم پراؤں کو چھوڑ دیں۔؟''

''ہماری ہر پرم پرا کا ستیہ ناس کرنے ہی تو آئے ہیں یہ فرنگی۔'' تارا نے

ٹھنڈی ہوتی ہوئی آگ پر دوبارہ پھونک ماری، اور چنگاریاں پھر باہر نکل آئیں۔

''میں اپنے ہی گھر کی دہلیز پر کھڑا تھا، اور میری بہن گیتا رنگولی سجا رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ گورا صاحب شاید کسی دورے سے واپس آرہا تھا۔ جونہی اُس کی نظریں گیتا پر پڑیں، اُس کی بگھی رُک گئی۔ اُس کے پیچھے اُس کا طائفہ بھی رک گیا۔ وہ نہایت ہوس بھری نظروں سے گیتا کو نہار رہا تھا۔ اُس کی اس بے ہودگی پر میرا خون کھول اُٹھا، لیکن میں نے پھر بھی پوری شرافت کے ساتھ اُسے ٹوکا کہ اے گورا صاحب ـــ ! یہ شریفوں کی بستی ہے۔ چھم چھم گلی نہیں ـــ تو وہ دھاڑہ،''اوہ ـــ یو ڈیم فول! تم ہم کو چھم چھم گلی بتاتا ہے۔؟ ابھی ہم تم کو بتائے گا، شریفوں کا بستی کیسے چھم چھم گلی میں بدلتا ہے۔'' وہ بگھی سے نیچے اُترا اور اُس نے گیتا کا ہاتھ پکڑ زور سے اپنی طرف کھینچا، خوف کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی اور میں اُسے بچانے کے لیے لپکا، لیکن اُس حرام خور نے اپنے دوسرے ہاتھ کا جھاپڑ میرے گال پر رسید کر دیا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا''اریسٹ ہم۔''

پنڈت کی آواز لرز اُٹھی، اور پھر وہ بے اختیار رونے لگا۔

دونوں اُسے دکھ بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

پنڈت نے اپنے آپ پر قابو پایا اور پھر کہنا شروع کیا،'' اُنھوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ جیل میں بھجوا دیا۔ وہاں میں دن رات روتا تھا اور قیدیوں کو اُس کمینے کا ظلم سناتا تھا۔ یا پھر بھگوان سے اُس کی موت کے لیے گڑگڑاتا تھا۔ کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک دن نیا جیلر آیا وہ ہمارے ہی محلے بلی ماراں میں رہتا تھا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا اور کسی طرح مجھے وہاں سے بھگا دیا۔ میں گرتا پڑتا بے تحاشہ اپنے گھر پہنچا ـــ لیکن ـــ لیکن حیدر بھائی میری بہن کی صورت مجھے پھر کبھی دِکھائی نہیں دی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''پنڈت ـــ! بات رونے سے نہیں بنے گی۔'' حیدر خان نے اپنا محبت بھرا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر رکھا۔

''یہ کیسا اندھیر ہے حیدر بھائی، اب تو ہماری ناموس بھی محفوظ نہیں رہی۔''

''پاپ کا گھڑا جب بھر جاتا ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور پھوٹتا ہے۔'' تارا نے ایک بار پھر لکڑیوں کو آگ کے حوالے کیا۔ اُس کے چہرے پر کئی رنگ آرہے تھے اور کئی رنگ جا رہے تھے۔ اُس نے کنکھیوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اور تارا کی زبان پر کئی کہانیاں آتی آتی رہ گئیں۔

دور سے آنے والے گھوڑے کی ٹاپوں سے سناٹا دہلنے لگا۔

''حیدر بھائی کوئی آرہا ہے۔''

''ہاں۔۔۔! ٹاپوں کی آواز بتا رہی ہے کہ وہ ادھر ہی آرہا ہے۔''

''کیا ہم لوگ چھپ جائیں۔''

''آگ کی موجودگی ہمارا راز بیان کردے گی۔''

گھوڑ سوار کا دھندلا سا ہیولا واضح ہو رہا تھا، لیکن کُہر اور اندھیرے کی وجہ سے اُس کے لباس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

''حیدر بھائی کہیں داروغہ تو نہیں۔؟'' پنڈت کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کہیں کسی نے ہماری نشان دہی تو نہیں کردی؟''

''کیا ہم لوگ ان قبروں کے پیچھے چھپ جائیں۔۔۔؟''

''وہ ہمارا کوئی ساتھی بھی تو ہوسکتا ہے۔'' حیدر خان اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دور سے گھوڑ سوار نے اپنا ہاتھ بلند کیا لیکن اب بھی اُس کی شناخت واضح نہیں ہو رہی تھی۔

''خدا جانے کون ہے۔''

پنڈت اور تارا بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ گھوڑ سوار جھاڑیوں کی اوٹ سے ہوتا ہوا ایک دم سامنے آگیا۔ اب اُس کا گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔

''کہیں یہ سبحان میاں تو نہیں ہیں۔۔۔؟'' ایک سرگوشی اُبھری۔

سوار نے ٹھنڈ سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو گرم کپڑوں سے پوری طرح چھپالیا تھا۔ حیدر خان نے زمین پر رکھی ہوئی اپنی تلوار کو اُٹھالیا اور مٹھی پر اُس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ تارا اور پنڈت اُس کے پیچھے چپ چاپ دم سادھے کھڑے تھے۔ سوار قبرستان کی پھاٹک میں داخل ہوا۔ گھوڑے سے نیچے اُترا، اور اُسے وہیں چھوڑ دیا۔ پھر اُس کے قدم آگ کی طرف بڑھنے لگے۔ اب اُس کی چال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی

حیدر خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے اپنی تلوار کو دوبارہ زمین پر رکھ دیا" اماں یہ تو میرا یار دینا ناتھ ہے۔" اُس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا، "میں نے ہی اُسے اس جگہ کا پتہ دیا تھا۔" پھر وہ دینا ناتھ کی طرف پلٹا، " آؤ دوست۔! جھانسی سے آنے والے اِس دوست کا استقبال ہے۔ خوش آمدید۔"

"یہ جھانسی سے آرہے ہیں۔؟"

"ہاں" سوار کے منہ سے پہلی آواز نکلی، گرم کپڑوں کے باوجود وہ ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا، "پہلے کچھ آگ تاپ لوں، تو پھر بتاؤں گا، بہت کچھ اپنے ساتھ لایا ہوں ۔"

حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔

رات اپنا دوسرا پہر مکمل کر کے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔

تارا نے پھر ایک بار آگ کو تیز کرنا شروع کیا۔ پنڈت اور حیدر خان لکڑیاں ڈالنے لگے۔ وہ سب پھر ایک بار حلقہ بنا کر آگ کے اطراف بیٹھ گئے۔ دھواں اُٹھ رہا تھا اور گرم گرم بھاپ جسم میں بھی گرمی پہنچا رہی تھی۔ اُن کے چہرے آگ کی روشنی میں روشن ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں کئی سوالات جھلملا رہے تھے اور دینا ناتھ تازہ دم ہو چکا تھا۔

" دینا ناتھ جی۔! جھانسی سے یہاں تک آنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" تارا نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

"تکلیف ---؟" دینا ناتھ کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ "جب تلک میرے ساتھ میرا یہ راجو ہے، تکلیف کیسی ---؟ وہ تو آنے والی مصیبت کو پہلے ہی تاڑ لیتا ہے۔" اس نے محبت بھری نظروں سے دور کھڑے ہوئے اپنے گھوڑے کی طرف دیکھا۔

"خبریں کیا کہتی ہیں ---؟" حیدر خان نے سوال کیا۔

"بری خبریں ہیں، انگریز سرکار نے دیسی والیان کے لیے الحاق کا قانون پاس کر دیا ہے۔ تمام رجواڑوں میں اس قانون کے باعث سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔"

"لعنت ہے اُن رجواڑوں پر جنھوں نے محض اپنے معموں سے مفاد کی خاطر اپنے ہاتھ کاٹ کر فرنگیوں کے حوالے کر دیئے۔" پنڈت کا چہرا سرخ ہو گیا۔

"میں کچھ سمجھی نہیں ---؟" تارا نے پنڈت سے وضاحت چاہی۔

"میری بہن صرف تخت تاج کی لالچ میں ان لوگوں نے اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف فرنگیوں سے مدد مانگی۔ اپنی ریاستوں اور جاگیروں کے داخلی معاملات میں انھیں دخیل کر لیا، اب تو وہ اُن سے کھیل کھیل رہے ہیں اور کروڑوں روپیہ بٹور کر اپنے ملک کو بھیج رہے ہیں۔"

"بھیا جھانسی کا احوال بتاؤ ---"

"حیدر بھائی۔!" دینا ناتھ نے سرد ہوتی ہوئی آگ کی طرف دیکھا، "جھانسی میں تو فرنگیوں کے خلاف نفرت کی آندھیاں اُٹھ رہی ہیں۔ بس چنگاری کی دیر ہے، دیکھنا برٹش سامراج کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"حیدر بھائی ایسا ہی ہوگا، کیونکہ اب تو ان حرام جنوں نے ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی ٹانگ اڑانا شروع کر دیا ہے۔ اب بھلا کیا راجے مہاراجے ان کی مرضی سے اپنا جانشین طئے کریں گے۔؟" پنڈت نے پھر ایک مرتبہ آگ کو تیز

کرنا شروع کیا۔

'' پنڈت جی میں اب بھی نہیں سمجھی ، اپنے وارث کے چین کے لیے
۔۔۔۔''

''تارابجو!'' پنڈت نے سمجھانا شروع کیا،'' فرض کرو کسی راجہ کو چار بیٹے ہیں،اور وہ اپنے بڑے بیٹے کوراج گدی پر بٹھانا چاہتا ہے۔۔۔''

''تو وہ بٹھائے گا۔''

''نہیں۔۔۔ایسانہیں چاہتے انگریز،اب وہ طئے کریں گے کہ ان چاروں میں سے کس کوراجہ بنائیں۔''

''یعنی راجہ کی مرضی کے خلاف۔۔۔؟''

''کیاراجہ اور کیا پرجا۔۔۔سب کی مرضی کے خلاف۔''

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ زمین سخت اور آسمان دور۔''

''تارابہن وہ ہمیں سوکھے گھاٹ اُتارنا چاہتے ہیں۔''

پنڈت نے آسمان کی طرف دیکھا تو حیدر خان نے اُسے ٹھوکا دیا،''پنڈت آسمان میں اب کچھ نہیں ہے جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ انگریز ہی کر رہے ہیں۔''

''یعنی۔۔۔یعنی۔۔وہ تو ہندوستان کے بھگوان ہو گئے۔؟''

'' جب کوئی قوم اتحاد واتفاق سے ہاتھ اُٹھا لیتی ہے۔اپنے بھائیوں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیتی ہے اور اپنے ایمان کا سودا کرنے لگتی ہے،تو اُس قوم پر اسی طرح کے عذاب نازل ہوتے ہیں۔ پنڈت تمہارے سامنے شہنشاہ بابر کی اولادوں کا حشر موجود ہے۔شہنشاہ اورنگ زیب تک تو شہزادے خود اپنے مقدر کا فیصلہ کر سکتے تھے،لیکن اُن کے بعد کیا ہوا۔۔۔؟ اپنوں کے خلاف سازشیں ، اپنوں کا خون خرابہ، رشوت خوری،ایمان فروشی ،مفاد پرستی ،اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی۔۔۔ اتنی بڑی سلطنت اب صرف لال قلعہ تک ہی محصور ہو کر رہ گئی ہے۔۔۔اور لال قلعے کے اندر بھی کیا ہے؟ اندر بھی یہی حرام زادے فیصلے کر رہے ہیں۔'' حیدر خان بنا

سانس لیے اپنی بات کہتا رہا اور سب اُس کے ایک ایک لفظ کی سچائی پر گردن ہلا رہے تھے۔''خدا جانے یہ چرخ اور کیا دن دکھائے گا؟''

''ہاں۔۔۔بہت بُرے وقت کی آمد کی آہٹ ہم سبھی سُن رہے ہیں ۔''

''مجھے تو جھانسی کی فکر ہے۔'' دینا ناتھ نے اپنے ہاتھ پھر آگ کی طرف بڑھائے۔''اُسے تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔''

''ہاں۔!'' تارا نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا،'' اُس کے راج پاٹ کا جانے کیا ہوگا؟''

''وہی تو میں بتانے جا رہا ہوں۔'' دینا ناتھ نے پہلو بدلا،''رانی نے دامودر نامی ایک بچے کو گود لیا ہے اور چاہتی ہے کہ اُسے اپنا وارث قرار دے۔''

''تو''

''تو کیا۔۔برٹش سرکار کے نئے قانون کے مطابق وہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

''یہ تو کھلی زبردستی ہے۔''

''اگر وہ دامودر کو اُس کا وارث تسلیم نہ کریں تو پھر جھانسی کی حکومت کا کیا ہوگا۔؟''

''اُسے انگریز اپنی عملداری میں لے لیں گے۔''

''یہ تو بالکل ہی عجیب سی بات ہوئی۔'' پنڈت کا لہجہ غصّے میں بدلنے لگا۔''ملک میں کئی چھوٹے بڑے نواب، جاگیردار، زمیندار، دولت مند افراد ہیں۔اگر انھیں کوئی اولاد نہ ہو تو کیا وہ اپنی ساری املاک فرنگیوں کے حوالے کر دیں۔؟ اپنے کسی عزیز رشتہ دار کو نہ دیں؟ حیدر بھائی اس قانون پر کبھی بھی عمل نہیں ہو سکتا، دیکھنا مخالفت ہوگی، بغاوتیں ہوں گی، خون خرابہ ہوگا۔''

''اب یہی تو ہم ہندوستانیوں کا مقدر قرار پایا ہے پنڈت۔۔۔!''

''اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔۔۔؟''

''علاج ہے۔۔۔!'' حیدر خان نے پھر تفصیل سے کہنا شروع کیا،''اگر

یہ سارے راجے مہاراجے، نواب جاگیردار، متحد ہو جائیں۔ ایک عظیم الشان لشکر میں بدل جائیں، ذاتی مفادات کو تیاگ کر فرنگیوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں، اور کسی ماہر، سچے، دیانت دار فوجی کے ہاتھوں میں کمان سونپ دیں، تو ان کی جیت یقینی ہے۔ انگریزوں کو پھر سوائے بھاگنے کے کوئی دوسرا چارہ نہیں بچے گا۔۔۔ لیکن پنڈت ! ہماری تاریخ گواہ ہے۔ ہمارے ملک میں ہمیشہ ہی ذاتی مفادات نے اتحاد کی زنجیروں کو توڑا ہے۔ اور تباہ ہوئے ہیں۔''

''سچ کہہ رہے ہو حیدر بھائی۔۔۔!'' دینا ناتھ نے اپنے دونوں ہاتھ آگ کے سامنے کر دیے اور آنکھیں بند کرلیں، گویا اگنی دیو سے اتحاد و اتفاق کا عہد کر رہا ہو۔ ماحول پر کچھ لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ سب کے ذہنوں میں ایک جیسی سوچ سوار تھی اور ملک کا بدلتا ہوا منظر نامہ دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی خوف اُن کے چہروں پر نمایاں ہو جاتا، کبھی لاچاری اور بے بسی اُبھر آتی، کبھی جوش اور ولولہ اُمڈ آتا، جانے وہ کب تلک اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ آخر پنڈت نے زبان کھولی؛ ''بھائی دینا ناتھ ! اس قانون کی اطلاع ملتے ہی جھانسی میں کس قسم کا ردِ عمل دکھائی دیتا ہے۔؟''

''میرے دوست! اس قانون کو تسلیم کرنے کے لیے نہ تو جھانسی کی رانی لکشمی بائی تیار ہے نہ اُس کے درباری اور نا ہی رعایا۔ پوری ریاست میں ایک آگ لگی ہوئی ہے۔ دیہات دیہات آباد سپاہی جھانسی کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ رعایا اپنے ملک کی خاطر تن من دھن کی بازی لگانے تیار بیٹھی ہیں۔ نئے نئے ہتیار ڈھالے جا رہے ہیں، توپیں دُرست کی جا رہی ہیں۔ گولہ بارود کے ذخیرے جمع کیے جا رہے ہیں۔ بس سمجھ لو بھیا، جھانسی دن بدن انگریزوں کے خلاف سج رہی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ رانی صاحبہ اور انگریزوں کے درمیان گفت وشنید کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اونٹ کس کل بیٹھے گا۔'' دینا ناتھ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا تو پنڈت نے پھر سوال کیا؛ ''اور جھانسی کے اطراف واکناف کا ماحول۔۔۔؟''

''وہی تو میں نے بتایا آپ کو، ہر نکڑ پر، ہر چوپال میں، بس یہی ایک بات موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے، لیکن پھر بھی ایک بڑا سوال یہی ہے کہ کیا تنہا ریاست جھانسی فرنگیوں کی طاقت اور اُن کی مکاریوں کا مقابلہ کر سکے گی۔؟ کیا یہ رجواڑے اب بھی متحد ہو سکیں گے؟ کیا اب بھی وہ لوگ اپنے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر ایک اجتماعی قوت کا مظاہرہ کر سکیں گے؟''

ماحول پر پھر ایک بار سناٹا چھا گیا۔

سب نے باری باری ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

رات صبح کاذب میں تبدیل ہو رہی تھی۔

قبرستان کے درختوں پر بسیرا کرنے والے پنچھی پھڑ پھڑانے لگے تھے۔

اُن کی آوازوں سے سارا ماحول گونج رہا تھا۔ حیدر خان نے اُچٹتی ہوئی نظریں اپنے اطراف کے ماحول پر ڈالیں اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دور موذن اذان دے رہا تھا۔

حیدر خان نے اپنی تلوار اُٹھائی، ''ساتھیوں! اب اپنے بچھڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہمیں دن تمام اپنے آپ کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ لیکن رات گئے ہم پھر یہیں پر ملیں گے۔۔۔!''

اُس نے آہستہ سے خدا حافظ کہا اور قبرستان کی پھاٹک کی طرف جانے لگا۔ اُس کے پیچھے پیچھے باقی لوگ بھی قدم اُٹھانے لگے۔ آگ آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی تھی اور راکھ نے پوٹوں کی مانند انگاروں کو اپنی آنکھوں میں بند کرنا شروع کر دیا تھا۔ قبرستان پھر ایک بار ویران ہو گیا۔

(۲)

فجر کی نماز سے فارغ ہوکر سید اختر علی نے جیسے ہی مسجد سے باہر قدم رکھا، اُن کی نتھنوں میں گلابو بھٹیارن کے لذیز پکوانوں کی خوشبو پہنچی اور اُن کے قدم رک گئے۔ وہ سیدھا بھٹیار خانے میں داخل ہوئے، خوب سیر ہوکر ناشتہ کیا، بٹوے میں سے بچا ہوا آخری پان کا بیڑہ کلے میں دبایا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

سڑکوں پر چہل پہل شروع ہوچکی تھی۔ سبزی فروش اپنی گاڑیوں کو مختلف ترکاریوں سے سجا رہے تھے۔ بیل بنڈیاں سامانوں سے لدی سفر پر روانہ ہورہی تھیں۔ بھشتی مشکیں اُٹھائے پانی لینے جا رہے تھے۔ اُنھوں نے نظریں اوپر کیں، چھتوں پر کھڑے لوگ کبوتروں کو اُڑا رہے تھے۔ اُن کے غول کے غول آسمانوں میں اُڑانیں بھر رہے تھے اور کچھ منچلے گھوڑسواری کر رہے تھے۔ اُنھوں نے سڑک پر نظریں دوڑائیں تو اُن کا اپنا گھر بہت دور نظر آیا اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا، آخر ابا جان مرحوم کو کیا سوجھی تھی جو اتنی دور گھر تعمیر کروایا، یہیں آس پاس کہیں بنوا لیتے۔ اُنھوں نے ادھر اُدھر دیکھا، سواری کو تلاش کیا، لیکن ناکام رہے، کیونکہ سارے ہی کہار ڈومنیوں اور طوائفوں کو اُٹھائے اُن کے کوٹھوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ یہاں کے رئیس بھی خوب ہیں دن تمام تیتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی میں مست رہتے ہیں اور رات ہوتے ہی اُنھیں طوائفیں یاد آتی ہیں۔ کہیں مجرے ہوتے ہیں اور کہیں بھانڈ تماشے کرتے ہیں، یا پھر مشاعرے برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا شروع

کیا اور ان کے دماغ میں رات تمام مشاعرے میں پڑھے جانے والے اشعار سرگو شیاں کرنے لگے۔ واللہ خوب مشاعرے کا اہتمام کیا تھا حضور صاحب عالم نے، مزہ آ گیا۔ اتنا بڑا اور ایسا عظیم الشان مشاعرہ برسوں بعد منعقد ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگے، پورے مشاعرے میں کس کا کلام حاصلِ مشاعرہ تھا۔؟ اُن کے ذہن میں ایک ایک شاعر اُبھرنے لگا، خود حضور بادشاہ سلامت نے بھی اپنی غزل بھجوائی تھی اور اُسے ولی عہد بہادر نے اپنی آواز میں پیش کیا تھا۔۔۔ مرزا نوشہ کا کلام بھی تو کسی سے کم نہ تھا۔ داد اگر چہ اُن کے حصے میں کم ہی آئی تھی۔ لیکن غور کرو تو اُن کی غزل ہی حاصلِ مشاعرہ تھی۔ وہ غالب کے اشعار یاد ہی کر رہے تھے کہ اُن کے کانوں میں آواز گونجی، اُنھوں نے پلٹ کر دیکھا تو مرزا حکمت یار خان ہاتھ ملتے ہوئے کھڑے تھے،'' اماں اختر علی صاحب۔۔۔ صبح بخیر کہیے مزاجِ دشمناں؟''

''جی اللہ کا احسان ہے۔۔۔! آپ فرمائیں۔''

دونوں نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا،'' ویسے آج مجھے حضور کی پیشانی پر فکر و تر دود کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔'' اختر علی نے تشویش ظاہر کی،'' خدا کرے خادم کا انداز غلط ثابت ہو۔''

''اب آپ کو کیا بتلائیں اختر علی صاحب۔'' مرزا صاحب کی نظریں جھک گئیں اور آواز میں رقت طاری ہوگئی،'' حضور ہماری جان، ہماری شان، ہمارے نورِ نظر، ہمارے لاڈلے جہانگیر میاں سخت علیل ہو گئے ہیں۔ قریب ہی اُن کا مقابلہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آخر اُن کا علاج کہاں کروائیں؟''

''مرزا صاحب فکر نہ فرمائیں۔'' اختر علی نے نہایت خلوص و ہمدردی کے ساتھ اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا،'' اللہ بہت بڑا ہے، وہ صحت یاب ہو جائیں گے۔''

''اجی جناب کیا خاک صحت مند ہو جائیں گے۔؟ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے چلنا پھرنا دشوار ہو گیا ہے، آنکھیں نقاہت کے باعث بند ہیں۔ آہ۔ اُنھوں نے تو اپنی گردن بھی ڈال دی ہے۔'' مرزا صاحب کے چہرے پر ایک دم مُردنی چھا گئی۔

''اماں مرزا صاحب اس طرح ہمت تو نہ ہاریں۔۔ یہ دلّی ہے۔ یہاں ایک سے ایک ماہر طبیب موجود ہیں۔ آپ اُنھیں حکیم احسن اللہ خان کے پاس لے جائیں۔''

''معاف فرمائیں حضور۔'' مرزا نے اُن کی بات کاٹی، ''ہمارے جہانگیر میاں کا علاج یہ آپ کے دلّی والے طبیب نہ کرسکیں گے۔''

''مرزا صاحب پھر بھی کوئی فکر کی بات نہیں، سنا ہے کہ دلّی میں کئی کرسٹان ڈاکٹر ہیں۔ اُن سے رجوع ہوئیے گا، کہتے ہیں کہ اُن کی دواؤں میں بڑی شفاء ہے۔''

مرزا صاحب کے لہجے میں حقارت عود آئی، ''جی معاف کیجیے گا۔۔ اجی حضت وہ کیا جانے ہمارے جہانگیر میاں کا علاج! دیسی کا بدیسی علاج۔۔۔ نا صاحب یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔''

اب اختر علی بے حد پریشان ہو گئے۔ نہ تو وہ وہاں سے آگے بڑھ سکتے تھے اور نا ہی اب اُن کے پاس کوئی مشورہ باقی تھا۔ وہ خاموش نظروں سے مرزا صاحب کی بے بسی کو تکے جا رہے تھے کہ اچانک اُن کے ذہن میں وہ سوال آیا جسے بہت پہلے ہی اُنھیں پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اُنھوں نے نہایت فکرمندانہ لہجے میں پوچھا، ''ویسے مرزا صاحب یہ تو بتائیے میاں جہانگیر کو کیا شکایت ہوگئی ہے۔؟''

مرزا صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، ''حضور اب کیا بتائیں، کل تک تو اُنھیں کوئی شکایت نہ تھی اور ہمیں پورا یقین تھا کہ وہ اس بار بھی بازی جیت جائیں گے، لیکن سنا ہے کہ اس بار اُن کے مقابل کو خاص طور سے لکھنو سے بلایا گیا ہے، اور وہ کافی طاقتور بھی ہے۔ بس یہی سوچ کر اختر علی صاحب ہم نے اپنے جہانگیر میاں کو بادام کے کچھ دانے کوٹ کر کھلا دیے، اب ہمیں کیا پتہ تھا کہ اس کی تاثیر اُلٹی ہوگی۔ طاقت کا آنا تو کجا اُلٹا اُنھیں پیچش ہوگئی اور عالم یہ ہے کہ پورا ڈربہ، گھر کا صحن بیٹ سے بھر گیا ہے۔''

''بیٹ سے۔۔۔؟'' اختر علی نے حیرت سے مرزا صاحب کی طرف دیکھا،

''معاف کیجیے گا حضور۔۔۔ یہ جہانگیر میاں۔۔۔۔''

''اجی حضت وہ ہمارے مرغ ہیں۔کل تک نہایت چاق وچوبند، تیز وطرار تھے۔اب آپ سے کیا کہیں، آج تک کوئی بازی اُنھوں نے ہاری نہیں۔جی۔۔۔''

اختر علی نے بھی جواب میں'جی'پرزوردیا،''واقعی بات کافی تشویش کی ہے۔''

''تشویش کی۔؟ اجی جناب اب تو مسئلہ ہماری عزت کا آن پڑا ہے۔خدا نخواستہ ہار گئے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔لیکن کیا کریں، ہمیں تو موت بھی نہیں آرہی ہے۔اب آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں۔''

اختر علی دل ہی دل میں ہنسے جارہے تھے۔اب اُنھیں بھی شرارت کی سوجھی، اور اُنھوں نے آہستہ سے کہا،''خودکشی۔''

لفظ خودکشی سنتے ہی مرزا پھڑک اُٹھے،''واللہ عزت بچانے کی کیا خوب تدبیر آپ نے بجھائی ہے، آپ کے منہ میں گھی شکر، لیکن بھائی اختر علی سنا ہے کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے۔اجی صاحب ہم یہاں عزت بچانے کی خاطر خودکشی کریں اور وہاں اللہ کے حضور شرمندگی اُٹھائیں۔۔۔ناصاحب نا۔۔۔یہ بھی تو ہم سے نہ ہوگا۔''

مرزا صاحب نے لاچاری کے ساتھ اُن کی طرف دیکھا تو اُنھوں نے پھر دوسرا مشورہ صادر فرمایا،''تو آپ یوں کریں مرزا صاحب، کوئی اور مرغ خرید لیں۔ بازی تو آپ کو جیتنا ہے۔جہانگیر نہ سہی شاہ جہاں لے آیئے۔۔جی۔۔آخر عزت و ناموس کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔''

''بھائی آپ بڑے ذہین انسان ہیں۔واللہ کیا کیا سوچتا ہے آپ کا دماغ اور ایک ہم ہیں کہ ہمیں کچھ بجھائی نہیں دیتا۔''

''مرزا صاحب اب اس بندے کو اجازت دیجیے،''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

مرزا نے خوشی خوشی جواب دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔اختر علی کچھ دیر تک اُنھیں جاتا ہوا دیکھتے رہے اور پھر خود بھی اپنے گھر کی طرف قدم اُٹھانے لگے اور اُن کے دماغ میں پھر ایک بار غالب کی غزل معنیٰ و مطالب کے اسرار کھولنے لگی۔

نیلوفر تمام رات سے پریشان تھی۔ اُس کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات آرہے تھے۔ اُس کے ابّا جان بغیر اطلاع کے کبھی رات تمام گھر سے باہر نہیں رہے تھے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ پوری رات بیت گئی، دن نکل آیا، سورج چڑھ آیا، لیکن وہ ابھی تک لوٹے نہیں تھے۔ گھر میں کوئی اور تھا بھی نہیں جو اُسے دلاسہ دیتا۔ اُسے اپنی امّی جان پر بھی سخت غصہ آرہا تھا جو اُس کی بسم اللہ کی رسم کے بعد ہی اللہ میاں کے گھر چلی گئیں۔ لے دے کے بس ابّا جان ہی نے اُس کی پرورش کی تھی۔ رشتہ داروں نے اُنھیں کیسے کیسے مشورے دیے لیکن وہ دوسری شادی کے لیے رضامند نہیں ہوئے۔ وہ فوجی تھے فوجی خاندان کے فرد، لیکن ادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اُن کی الماری میں شعر وحکمت کی بے شمار کتابیں تھیں۔ گھر میں ادبی محفلیں سجتیں، حافظ، سعدی، میر و سودا کی شاعری پر گفتگو ہوتی، نئے شعراء کا تذکرہ ہوتا۔ ذوق و غالب کی تقابلی بحثیں ہوتیں۔۔۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ کبھی اپنی بیٹی سے غافل نہ رہے۔

نیلوفر نے پھر ایک بار دروازے کی طرف دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور زینہ طئے کر کے دیوڑھی کے بالائی حصے پر پہنچی، کھڑکی کی چلمن کو آہستہ سے سرکایا اور سڑک کا جائزہ لینے لگی، لیکن دور دور تک ابّا جان کا پتہ نہیں تھا۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا، تو اُسے سلیم نظر آیا، وہ پتنگ اُڑا رہا تھا۔ اُس نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی پتنگ ہوا میں لہرا رہی تھی۔ سلیم اُس کے چچا کا اکلوتا لڑکا تھا۔ دونوں بچپن کے ساتھی تھے، لیکن جوانی میں قدم رکھتے ہی محسوسات نے دونوں کو محتاط کر دیا تھا۔ دونوں میں محبت بھی تھی اور چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی۔

نیلوفر زینے سے نیچے اُتری۔ صحن کا دروازہ چچا جان کے گھر میں کھلتا تھا۔ وہ دروازے پر پہنچی اور زنجیر پر آہستہ سے ہاتھ مارا۔۔۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اُس نے کچھ لمحوں تک توقف کیا، کوئی نتیجہ نہیں نکلا، تو اُس نے پھر ایک بار قدرے زور سے زنجیر پر ہاتھ مارا۔

اس بار بھی وہی خاموشی تھی۔ وہ سوچنے لگی، یہ چچی جان صبح صبح کہاں چلی

گئیں۔ پھر اُس نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا ممکن ہے وہ دالان میں نہ ہو، کسی اور کمرے میں ہوگی۔ اُس نے پھر ایک بار زنجیر کی طرف ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ کوئی دن سے زمین پر کودا۔ وہ ڈر کر جونہی پلٹی، سامنے سلیم کا مسکراتا ہوا چہرا دکھائی دیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' اُس نے ڈانٹا۔

''کمال ہے صاحب کمال ہے۔'' اُس نے درخت سے ایک انار توڑا اور اُسے اُچھالتے ہوئے کہنے لگا، ''ہم آپ کی خاطر کوہِ قاف پھلانگ کے آئے ہیں۔ آپ نے ہم سے یہ نہیں پوچھا، ہائے سلیم آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔'' اُس نے اُس کے لہجے کی نقل اُتاری، ''اُلٹا بدتمیز ہونے کا بہتان لگا رہی ہیں۔''

''دیکھو سلیم۔۔۔! فی الحال ہم بہت پریشان ہیں، رات کے گئے ہوئے ابا جان ابھی تک گھر نہیں آئے ہیں۔'' وہ پوری طرح سنجیدہ تھی۔

''اری ہٹو۔۔۔ اس میں پریشان ہونے والی بات کیا ہو سکتی ہے؟ اب چچا جان کوئی چھوٹے بچے تو ہیں نہیں کہ کوئی۔۔۔۔''

''سلیم۔۔۔!'' اُس نے اُس کی بات کاٹی، ''ہمیں اپنی سی پڑی ہے اور میاں جی کو چونچلے سوجھ رہے ہیں۔''

سلیم نے اُسے غور سے دیکھا، اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، ''تم غصے میں اور بھی حسین لگتی ہو۔''

نیلوفر اُس کی طرف جھپٹی تو وہ ایک قدم پیچھے سرک گیا، ''وہ چچا غالب کہتے ہیں نا دھول دھپا۔۔۔۔''

''آپ کبھی سنجیدہ بھی ہو سکتے ہیں ؟''

سلیم نے اُس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا اور پھر اپنی ناک کو کھجاتے ہوئے عورتوں کی زبان میں کہنے لگا، ''اے ہے لاڈو اتنی ہی فکر ہے تو باندھ رکھنا تھا اپنے پلّو سے، کاہے مشاعرہ کا ذوق لگالائیں؟''

''تو کیا رات کوئی مشاعرہ تھا؟''

سلیم نے آنکھوں سے جواب دیا،''اب تمھیں تو پتہ ہے چچا جان کو شاعر اور مشاعرے کس قدر پسند ہیں۔ وہ رات تمام وہیں رہے ہونگے۔ انتظار کرو، آتے ہی ہونگے۔'' وہ اُسے دلاسہ دینے لگا۔

'' آپ تو نکڑ پر تماشہ بنے دو کوڑی کے کنکوے پر واری جارہے تھے نا؟''نیلوفر کا موڈ اچھا ہوگیا۔

''ہاں۔۔۔لیکن میں نے دیکھا جھروکوں میں بیٹھی پریاں مجھ پر ڈول ڈال رہی ہیں۔''

''اچھی خوش فہمی ہے۔ہم تو اپنے ابا جان کی راہ تک رہے تھے۔''

''جی ہاں جی ہاں۔۔۔ساری محبوبائیں ایسے ہی بہانے بناتی ہیں۔''

نیلوفر پھر ایک بار اُس پر جھپٹی، اور وہ پیچھے کی جانب اُچھلا، اور اپنا بچاؤ کرتا ہوا گویا ہوا،''لیکن تم بہانہ نہیں بنا رہی تھیں۔''

نیلوفر کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

''ارے تم تو مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔۔۔سچ کہنا۔''اُس نے اپنے گالوں کے اندر زبان پھیری تو نیلوفر نے اُسے انگوٹھا دکھایا اور اتراتے ہوئے کہنے لگی،''ہم تو صرف اپنے ابا جان کو دیکھ رہے تھے۔''

''یہ اب تم بہانہ بنا رہی ہو نیلوفر، بندا اس راز سے خوب واقف ہے کہ تمہیں مجھ سے بے حد۔۔۔'' لیکن آگے کے الفاظ اُس کے حلق ہی میں اٹک گئے اور اُس کی گردن جھک گئی، نیلوفر نے کچھ پل انتظار کیا اور پھر نہایت شوخ لہجے میں بولی،''سلیم جو لفظ آپ نہ کہہ سکے، دیکھو ہم کیسے بے حجاب کہتے ہیں۔''

سلیم خوشی سے دوہرا ہوگیا،''تو پھر کہہ دو نا۔''

''کہتی ہوں۔''وہ اترانے لگی،''لیکن پہلے آپ اپنی آنکھیں میچ لیں۔''

''میں نہیں میچوں گا۔۔۔تم پچھلی بار کی طرح پھر سے اُڑ جاؤ گی اور کمرے کا دروازہ بند کرلو گی۔محترمہ نیلوفر صاحبہ، سلیم کو اس بار بے وقوف نہ بنا پاؤ گی۔''اُس نے

فخر سے اپنا سینہ پھلایا۔

''یقین کریے نا۔۔۔ سچ کہتی ہوں۔'' شرارت اُس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی، ''چلئے آپ کی قسم لیتی ہوں نہیں بھاگوں گی۔'' اُس نے اُسے یقین دلایا، '' آپ بس ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں اور میں جھٹ سے کہہ دونگی۔''

''لیکن یہ شرط کیوں؟''

''مجھ شرم آتی ہے نا'' وہ اٹھلانے لگی۔

''ہائے ری میری بنو۔'' سلیم خوشی سے جھوم اُٹھا اور اُس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کرلیں، تو اُس کے کانوں میں نیلوفر کی آواز گونجی، ''ہر بہن کو اپنے بھائی سے بہت محبت ہوتی ہے۔''

سلیم نے آنکھیں کھول دیں اور اُس کی طرف غصے سے دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اور جونہی جانے کے لیے پلٹی تو سلیم نے فوراً کہا، ''ہاں۔۔۔ لیکن سگے بھائی اور چچیرے بھائی کی محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

نیلوفر نے اُس کی طرف مصنوعی غصے سے دیکھا۔

اب قہقہہ کی باری سلیم کی تھی۔

نیلوفر دوڑتی ہوئی زینہ چڑھ گئی۔ سلیم بھی آہستہ آہستہ بالا خانے پر پہنچ گیا۔ نیلوفر کی پیٹھ اُس کی طرف تھی۔ اُس نے اُسے اپنی بانہوں میں بھرلیا، اور اُس کے کان میں آہستہ سے کہا، ''نیلوفر میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں۔''

وہ جھٹکے کے ساتھ اُس کی بانہوں سے نکلی، ''سلیم یہاں سے فوراً چلے جائیں ،کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔'' اُس کا چہرا سرخ ہوگیا۔

''یہی کہے گا'' اُس نے اُسی کے لہجے میں جواب دیا، ''ہر بہن کو اُس کے چچا زاد بھائی سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے۔''

نیلوفر کا منہ کھلا کے کھلا رہ گیا

اور سلیم آہستہ آہستہ زینہ اُتر رہا تھا۔

اختر علی راستے کو مختصر کرنے کے چکر میں مختلف تنگ گلیوں میں بھٹکتے ہوئے آخر چاندنی چوک کی شاہراہ پر پہنچ گئے اور وہاں اُنہوں نے جو منظر دیکھا تو دنگ رہ گئے ۔ ریسیڈنٹ بہادر کی سواری کھڑی ہوئی تھی ۔ اُن کے آگے پیچھے بندوق بردار چاق و چوبند کھڑے تھے، اور شاہراہ کی دونوں جانب استادہ لوگ انھیں فرشی سلام کر رہے تھے ۔ زندہ باد کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔ ریسیڈنٹ بہادر کا ایک ہاتھ فخریہ انداز میں بلند تھا اور چہرے سے رعونت ٹپکتی تھی ۔ محتاج و بے کس لوگ سجدے میں گرے ہوئے تھے ۔ اختر علی کے قدم وہیں جم گئے ۔ وہ اس نظارے کو ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ مجمع میں سے ایک پھبتی اُبھری، "ارے غیرت سے ڈوب مرو غلاموں تم بدیسی کتوں کو محترم کر رہے ہو۔"

مجمع میں بھگ دڑ مچ گئی ۔ بندوق بردار پھبتی کسنے والے کی تلاش میں مجمع پر پل پڑے، لیکن اس سے پہلے کہ کوئی بندوق بردار اُس پر ہاتھ ڈالتا، وہ چھلاوے کی مانند قریب کی عمارت کے چھجے کو پکڑ کر زور سے اُچھلا اور چھت پر کود گیا۔ کوئی زور سے چلایا، "وہ رہا بدمعاش ۔" سپاہی اُسے گرفتار کرنے دوڑے ۔ لیکن وہ اُچھلتا کودتا ہوا ایک چھت سے دوسری چھت پر اور دوسری سے تیسری اور پھر جانے کہاں غائب ہو گیا ۔ اُس کے تعاقب میں گولیاں بھی چلیں لیکن صرف دھماکے کرتی رہ گئیں ۔ اب بندوق برداروں کا عتاب عوام پر ٹوٹ پڑا۔ لوگ بے تحاشہ بھاگنے لگے ۔ کوئی گرتا اور کوئی کچلے جاتا، یا پکڑا جاتا ۔ تھوڑی ہی دیر میں شاہراہ سنسان ہو گئی ۔ ریسیڈنٹ بہادر کی سواری بھی آگے بڑھ گئی ۔ لیکن اُن کے سپاہی بھاگنے والے شخص کی تلاش میں گھر گھر دستک دینے لگے ۔

اس بھاگ دوڑ میں اختر علی کب اپنے گھر پہنچے اُنھیں اندازہ ہی نہیں ہوا ۔ اُن کی سانس پھولی ہوئی تھی اور خوف اُن کے چہرے سے عیاں تھا ۔ نیلوفر اُن پر جھکی ہوئی تھی ۔ باپ کی حالت دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے آنسوں رواں تھے ۔

☆☆☆

(۳)

رات پھر قبرستان پر اُتر آئی تھی ۔ وہی سردی تھی ۔ وہی ماحول تھا، اور وہی لوگ آگ تاپتے ہوئے بیٹھے تھے۔ اچانک کسی اُلو کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی نکلی اور کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا درخت پر آبیٹھا۔ ایک ہی لمحے میں قبرستان کا ماحول آسیبی ہو گیا اور تارا نے گھبرا کر اپنا سر حیدر خان کے کندھے پر رکھ دیا۔

''تارا بہن ۔۔۔!'' حیدر خان نے اُس کے گال تھپتھپائے ،'' ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، میں ہوں نا تمہارا رکشک ۔''

دینا ناتھ نے دونوں کی طرف غور سے دیکھا،'' حیدر بھائی ایک بات کہیں ۔''

''ہوں ۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''تارا نے اپنے بارے میں آج تک کوئی بات نہیں بتائی ہے ۔''

''تارا کی کہانی ۔؟'' اُس نے تارا کی طرف دیکھا،'' اُس کی کہانی میں خود ہوں دینا ناتھ۔'' اُس نے آہستہ سے کہا،'' کیا کرو گے تم سن کر ۔''

''پھر بھی ۔۔۔'' پنڈت نے بھی اصرار کیا۔

''اُس کی کہانی اُس سے نہ پوچھو، آسمان جانتا ہے۔'' حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا، چاند نکل آیا تھا اور وہ اُسے ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہا تھا،'' اے چاند تو گواہ رہنا ، ہم لوگ بنا کسی گناہ کے بے گھر ہو گئے ہیں ۔ اے چاند تو شاہد ہے ہماری راتوں کا، ہماری بے بسی کا، اس لیے اے چاند جب روزِ حشر ہو اور ہمارے اعمال پیش

کیسے جائیں تو تو نے کہہ دینا اے ربِ رحیم، یہ وہ لوگ ہیں جو زمین ہی پر ذہنی سزا کاٹ چکے ہیں، جو جسمانی سزاؤں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اے چاند! میں نے تارا سے اُس کی زبانی کوئی کہانی نہیں سنی، لیکن اُس کی آنکھوں سے بوند بوند آنسوں بن کر ٹپکنے والی ہر کہانی کو خود ہی سمجھا ہے۔'' پھر وہ دونوں سے مخاطب ہوا،'' یہ مجھے جیل میں ملی تھی۔ اُسے دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ اپسرائیں بھی حوالات میں ہو سکتی ہیں۔ یہ نا تو کسی سے کچھ کہتی تھی اور نہ ہی ہنستی بولتی تھی، بس اُس کی آنکھوں سے آنسوں بہتے تھے۔ میں نے اُسی وقت قسم کھائی تھی کہ اسے یہاں سے نکال لے جاوں گا۔ میں نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا تھا، بس اپنے کرتے سے ایک چروٹی پھاڑ کر اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا، بہن اسے راکھی سمجھ کر میری کلائی پر باندھ دو۔ میں آج سے تمہارا رکشک ہوں۔'' اس نے پھر ایک بار اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا،'' اور کچھ پوچھنا ہے؟''

کوئی کچھ نہیں بولا۔ بس آگ تاپ رہے تھے۔ سناٹا تھا۔

بہت دیر تک یہ سناٹا اسی طرح قائم رہا۔ آخر دینا ناتھ نے خاموشی کو توڑا،'' حیدر بھائی کچھ تو سناو کے یہ رات کٹے۔''

''ہاں حیدر بھائی۔'' پنڈت نے بھی اصرار کیا،'' آنے والے ساتھی کا انتظار بھی ہو جائیگا اور رین بھی بیتے گی۔''

''میری تو آنکھ روشن ہو رہی ہے اور قیاس کہتا ہے کہ آج سبحان میاں ضرور آئیں گے۔''

''وہ تو اودھ میں ہوں گے۔'' تارا نے حیدر علی کی جانب دیکھا۔

''ہاں۔۔۔خدا ہی جانے وہاں کے حالات کیا ہوں گے۔؟''

''خبر تو آئی تھی کہ ان فرنگیوں نے نواب واجد علی شاہ کو گدّی سے اُتار دیا ہے۔''

''رنگ منچ کا نٹ اگر دربار میں بھی لیلیٰ مجنوں کا ناٹک کھیلے گا تو وقت اُس

کے ساتھ یہی سلوک کرے گا۔'' حیدر خان نے ایک سرد آہ بھری۔

''لیکن حیدر بھائی ہمارے اتہاس میں تو ایسے کئی راجے مہاراجے، شہنشاہ گزرے ہیں جو بڑے پائے کے لیکھک اور کوی تھے۔'' پنڈت نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا،'' پھر آپ کے طنز کی بجلی صرف واجد علی شاہ ہی پر کیوں گرے۔؟''

حیدر خان نے پنڈت کو گھور کر دیکھا،'' تھے۔۔۔ بلاشبہ تھے۔۔۔ پنڈت مغلوں ہی کو لے لو، بابر، جہانگیر، اورنگ زیب، داراشکوہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن وہ صرف شاعر اور ادیب ہی نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کب لکھنا چاہیے اور ملکی انتظام کس طرح کرنا چاہیے۔ اُن میں تلوار اُٹھانے کی طاقت بھی تھی۔ اپنے حق کے لیے وہ بغاوت بھی کر سکتے تھے۔ جہانگیر جسے تاریخ عیش پسند بادشاہ کہتی ہے۔ اُس نے بھی اپنے وقت کے سب سے بڑے شہنشاہ اور اپنے باپ اکبر آعظم کے خلاف بغاوت اسی لیے کی تھی کہ وہ اُس کا حق چھین کر اپنے پوتے کو دینا چاہتے تھے۔ اورنگ زیب یونہی نہیں بادشاہ بنا تھا۔ اسی لیے اُن کی پہچان بہادروں میں ہوتی ہے۔ نٹ اور بھانڈوں میں نہیں، لیکن آپ کے واجد علی شاہ تو دن رات راس لیلیٰ میں ڈوبے رہتے۔ طوائفیں دربار کا حصّہ بن گئیں اور نواب عورت رنگیا ہو گیا۔ اس کا اثر رعایا پر بھی پڑا، اور وہ بھی اُسی کے ماحول میں ڈوب گئے اور گھروں سے سپاہیوں کے بجائے بانکے، شہدے، بھانڈ، اور بے فکرے باہر نکلنے لگے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ مقابل میں ایک شاطر قوم ہے اور تیزی سے اس ملک میں اپنے پنجے گاڑھ رہی ہے۔ آئے دن دیسی رجواڑے اُن کا شکار ہو رہے ہیں لیکن یہ ایک دوسرے سے عبرت بھی حاصل نہیں کرتے، اپنے مفادات کی خاطر بک جاتے ہیں، سمجھوتے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ دنیا کے سامنے ہے۔'' حیدر خان ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا اور اپنی بات کی صداقت کو اپنے ساتھیوں کے چہروں میں تلاش کرنے لگا۔ سبھی نے گردن ہلا ہلا کر تائید کی۔ اُس نے طائرانہ نظریں قبرستان پر ڈالیں،'' اب بھی وقت ہے سنبھلنے کا، ورنہ سارا ہندوستان ایک دن ایک بڑا قبرستان بن کر رہ جائے گا۔''

''آج بڑی مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں آپ حیدر بھائی۔'' تارا نے سرد ہوتی ہوئی آگ پر زور سے پھونک ماری اور چنگاریاں تلملا کر باہر نکلیں اور حیدر خان کی آنکھوں کے سامنے تڑپنے لگیں۔

''دینا ناتھ! آج میں سارا دن دلّی کی گلیوں میں بھٹک رہا تھا، اور میرا دل خون کے آنسوں رو رہا تھا۔ یہ لوگ ہر روز فرنگیوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہیں لیکن ان کی غیرت نہیں جاگتی وہ آج تک بھی بیدار نہیں ہوئے ہیں، کوئی کبوتر بازی میں مست، کسی کو تیتر بٹیر سے فرصت نہیں، کوئی مرغ بازی میں گرفتار، کوئی شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ دن ہو یا رات، طوائفوں کے کوٹھے پائلوں کی جھنکار سے گونج رہے ہیں اور سنا ہے کہ قلعہ معلیٰ میں مشاعروں کی واہ واہ ہو رہی ہے۔ شہزادے تیر وسناں کا علم سیکھنے کے بجائے علم عروض میں وقت برباد کر رہے ہیں۔ چاروں طرف ایک زوال پذیر معاشرہ سانسیں لے رہا ہے اور غلامانہ ذہنیت فرنگی ریسیڈنٹ کو سجدے کر رہی ہے۔''

''ہاں ہاں۔۔۔آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں حیدر بھائی، میں نے بھی وہ منظر دیکھا ہے۔ چاندنی چوک میں، میں کچھ ہی فاصلے پر ہی کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت کسی منچلے نے دیسی لوگوں کی غیرت کو للکارہ تھا۔ اُس پر گولیاں بھی چلیں۔ وہ وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں وہ پکڑا گیا یا مارا گیا۔'' پنڈت نے ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ دیں۔ حیدر خان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی،''پنڈت وہ اگر پکڑا جاتا، یا مارا جاتا تو آج کیا اس قبرستان میں تمہارے ساتھ ہوتا۔؟''

''کیا؟؟؟'' سب کے منہ حیرت سے کھلے ہی رہ گئے اور تارا حیدر خان سے لپٹ گئی ''اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو۔۔۔؟''

''تارا بہن! اب کچھ ہونے کے لیے ہمارے پاس رہا ہی کیا ہے؟'' اس نے پھر ایک بار تارا کے گال تھپتھپائے،''ارے ہم تو وہ پات ہیں جو اپنی شاخوں سے بچھڑ چکے ہیں، وقت کی آندھی ہمیں کہاں لے جائے گی یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے اب گھبرانہ کیسا۔۔۔؟'' اُس نے مسکرا کر تارا کی آنکھوں میں جھانکا،''اب تو جتنی بھی

سانسیں ہمارے پاس ہیں انھیں تو انہی گوروں کی نفرت میں خرچ کرنا ہے۔ سمجھیں۔''
تارا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''لیکن حیدر بھائی آپ کے تعاقب میں تو بندوق بردار لگے ہوئے تھے، آپ اُن سے کس طرح بچ کر نکلے۔؟'' پنڈت کا تجسس اب بھی باقی تھا۔

''میں چھتوں اور دیواروں کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا آخر ایک مکان میں اُتر گیا۔ سپاہیوں کی آوازیں اب بھی میرا پیچھا کر رہی تھیں، میں صحن سے ہوتا ہوا ورانڈے میں پہنچا اور جونہی دالان میں جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، مکان میں کوئی نہیں تھا، میں آرام سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی، میں تھاپ ہی سے پہچان گیا تھا کہ یہ ''صاحب بہادر'' کے غلام ہی ہو نگے، میں اطمینان سے اُٹھا، دروازہ کھولا اور اُلٹا اُن ہی پر برس پڑا کہ یہ شریفوں کا گھر ہے اور شریفوں کے گھر پر کسی درانہ کا آنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اُنہوں نے مجھ سے معافی مانگی اور آگے بڑھ گئے۔ میں اطمینان سے گھر سے باہر نکلا اور چاندنی چوک سے ہوتا ہوا باغ جہاں پہنچا اور وہاں سے بھٹکتا ہوا جامع مسجد میں داخل ہوا، ظہر کی نماز ادا کی، کچھ دیر ادھر اُدھر بے مقصد بھٹکتا رہا اور پھر گھومتا گھامتا سیدھا یہاں چلا آیا۔''

''سب کے چہروں پر مسرت دوڑ گئی۔

تارا نے آسمان کی طرف دیکھا: ''رات کافی گزر چکی ہے۔ لیکن پتہ نہیں ہمارے ساتھی کہاں لہو پسینہ ایک کر رہے ہو نگے۔''

''تارا بجو۔ مثل مشہور ہے کہ گاتے گاتے آدمی کلاونت ہو جاتا ہے، پھر ہمارے ساتھی تو خوب جانتے ہیں کہ ڈھول کی رسیاں کیونکر کھنچتی ہیں، انتظار کرو وہ ضرور آئیں گے'' پنڈت نے قبرستان کی جانب آنے والی سڑک پر نظریں دوڑائیں، اور پھر اُچھل پڑا۔

''کیا بات ہوئی پنڈت۔''

اُس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا، ''کوئی گھوڑ سوار تھکی ہوئی چال سے ادھر

آرہا ہے۔

''یہ سبحان میاں ہیں۔اللہ کا شکر ہے،خیر خوبی سے پہنچ رہے ہیں۔''

''حیدر بھائی۔۔کیا وہ آپ کے رشتہ دار ہیں۔؟''

حیدر خان نے سرد ہوتی ہوئی آگ کو پھر ایک بار تیز کیا اور انگاروں پر لکڑیاں جماتے ہوئے کہنے لگا،''تارا بہن اب تو یہی اپنا خاندان ہے،تم میری بہن اور یہ سب میرے بھائی۔''

سبحان میاں قبرستان کی پھاٹک میں داخل ہوئے،گھوڑے سے نیچے اُترے ،اور پھر ایک زور سے نعرہ لگایا؛''دمادم مست قلندر۔دمادم مست قلندر۔۔''

حیدر خان بھی اپنی جگہ سے اُٹھا،اور اُس نے بھی جوابی نعرہ لگایا؛''یاعلی مدد۔۔د''اور پھر دونوں ہی تھرکتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب بڑھنے لگےاور سارا قبرستان حق حق حق کے نعروں سے گونج اُٹھا۔دونوں ایک دوسرے کے اطراف گردش کرتے رہےاور پھر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

تارا،پنڈت اور دینا ناتھ اُن کو حیرت اور مسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔حیدر خان نے سبحان میاں کا ہاتھ پکڑا اور اُنھیں اپنے ساتھ حلقے میں لے آیا۔ سب لوگ پھر ایک بار آگ کے سامنے دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔آگ دہکنے لگی،گرم گرم بھاپ اُٹھنے لگی،اور اُن کے چہروں پر مسرت رقص کرنے لگی۔

''ہاں تو سبحان میاں اب بتایئے اودھ کے حالات کیا کہتے ہیں۔''

سبحان میاں نے سب کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر کہنا شروع کیا،'' ساتھیو!اب اودھ کے بارے میں کیا کہوں،وہ تو بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے۔کسی بھی وقت فرنگیوں کے خلاف جنگ چھڑ سکتی ہے۔اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو اُن کی والدہ کیساتھ کلکتہ بھیج دیا گیا ہے،اور ملکہ حضرت محل نے اپنے نوعمر شہزادے برجس قدر کو اودھ کا جانشین قرار دیا ہے۔انگریزوں نے اُن کی نوابی کو تسلیم نہیں کیا۔یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری ریاست میں پھیل گئی عوام اور فوج حضرت محل کے ساتھ ہیں

اور شہر کا بچہ بچہ ان فرنگیوں کے خلاف صف آرا ہو گیا ہے۔''

''ہوں'' حیدر خان گھٹنوں پر کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرا جذبات سے دہک رہا تھا۔'' دوستو۔۔! میں ایک بڑے انقلاب کی آہٹ کو محسوس کر رہا ہوں۔''

دینا ناتھ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا،'' حیدر بھائی بس دو مقامات کی اطلاع پر ہی آپ نے تارے توڑنا شروع کر دیا؟''

''نہیں دینا ناتھ۔۔۔!'' اُس نے اُسی جوش میں کہنا شروع کیا،'' صرف دو اطلاعات پر نہیں، بلکہ انگریزوں کی اُس حماقت پر جس نے خود اپنے خلاف آگ کو ہوا دی ہے۔ یہ آگ اب صرف جھانسی اور اودھ سے نہیں بلکہ ملک کے ہر رجواڑے کے دربار سے بھڑکے گی اور ان شعلوں میں، سرکارِ انگلشیہ بھسم ہو کر رہ جائے گی۔''

'' حیدر بھائی چپ ہو جائیں، گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔''

سب کی نظریں پھر ایک بار سڑک کی جانب پھیل گئیں۔ لیکن سوار ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ صرف گھوڑے کی ٹاپوں سے ماحول دہل رہا تھا۔

'' جانے کون ہوگا۔'' پنڈت نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

'' جو بھی ہوگا خود ہی سامنے آ جائیگا۔''

وہ سب دم سادھے سوار کا انتظار کرنے لگے۔

ایک ایک لمحہ پہاڑ کی صورت کٹ رہا تھا۔

سڑک سنسان تھی اور صرف گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز گونج رہی تھی۔

'' خدا جانے کون ہوگا۔'' حیدر خان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

تارا نے حیدر خان کے ہاتھوں میں اُس کی تلوار تھما دی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے اُٹھتے ہی سبھی نے اپنی اپنی تلواریں سونت لیں۔

دور سے گھوڑ سوار کا ہیولہ دکھائی دیا۔

'' کوئی شہسوار معلوم پڑتا ہے۔''

''لیکن ہے کون۔''

''انتظار کرو۔''

اور انتظار قبرستان کی پھاٹک پر لٹک گیا۔

گھوڑے کی رفتار کم ہوگئی اور اس پر بیٹھا ہوا سوار کوئی دبلا پتلا نوجوان محسوس ہوا۔

''یہ تو طئے ہے کہ وہ کوئی دشمن نہیں ہے۔''

''اور نا ہی کوئی سرکاری کارندہ ہے۔''

اتنی دیر میں سوار قبرستان کی پھاٹک میں داخل ہوگیا اور حیدر خان زور سے چلایا،''خوش آمدید چنبیلی۔''

چنبیلی گھوڑے سے اُتری۔ وہ مردانہ لباس میں ملبوس تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اُن لوگوں کے قریب پہنچی، سب کے چہرے کھل اُٹھے۔

''بہت تھک گئی ہوں حیدر خان۔'' وہ اُس سے لپٹ گئی۔

''جانتا ہوں!'' حیدر خان نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی،'' جنوبی ہند سے دلّی تک گھوڑے پر سفر کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔''

چنبیلی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور حیدر خان نے اُسے بے اختیار بھینچ لیا اور اُس کے کانوں میں آہستہ سے کہا،''میری جان مجھے تم پر ناز ہے۔''

چنبیلی نے اپنا چہرا اُس کے سینے میں چھپالیا۔ چھریرے بدن کی خوبصورت چنبیلی مردانہ لباس میں اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُس نے سر پر سے پگڑی اُتاری اور اُس کی زلفیں اُس کی کمر تک پھیل گئیں۔ حیدر خان نے اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بیٹھتے بیٹھتے اُس کی نظریں تارا سے ٹکرائیں اور اُس نے سوالیہ نظروں سے حیدر خان کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا اور تارا اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ دینا ناتھ اور پنڈت نہایت خاموشی سے آگ تاپ رہے تھے۔ سبحان میاں نے جو یہ رنگ دیکھا تو پھر زور سے نعرہ لگایا،'' دما دم مست قلندر۔۔۔صدقہ پنجتن پاک کا۔۔یا علی

المد۔۔د۔۔۔''

لیکن اس بار حیدر خان نے جواب نہیں دیا، بلکہ وہ آہستہ سے بولا، ''چنبیلی وہ تارا ہے۔ میری منہ بولی بہن اور تارا تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ چنبیلی سے میرا رشتہ کیا ہے۔'' تارا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور سبحان میاں نے پھر ایک بار منہ کھولا تو حیدر خان نے اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، ''اب کچھ کام کی باتیں کر لیں۔'' پھر وہ چنبیلی سے مخاطب ہوا، ''ہاں تو چنبیلی اب بتاؤ جنوب کے کیا حال ہے۔''

چنبیلی نے اپنے ہاتھ آگ پر پھیلائے اور کہنا شروع کیا، ''جنوب میں مرہٹہ سردار فرنگیوں کے خلاف صف آراء ہو رہے ہیں۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' پھر وہ سب سے مخاطب ہوا، ''میں نہ کہتا تھا کہ اب انقلاب آئے گا۔ دیکھنا تم اب گولر کا پھول کھلے گا اور یہ فرنگی ناک کان سنبھالتے ہوئے اپنے دیس کو واپس جائیں گے۔''

''بہن'' پنڈت نے دھویں کو اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا، ''یہ تو بتاؤ، آخر مرہٹہ سرداران فرنگیوں کے خلاف کیوں صف آراء ہو رہے ہیں۔''

چنبیلی نے ایک نظر پنڈت پر ڈالی، ''فرنگیوں نے ستارا اور ناگپور کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا ہے۔''

''کیا۔؟'' سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''ہاں۔'' اُس نے باری باری سب کے حیرت زدہ چہروں کی طرف دیکھا اور پھر بولی، ''لیکن اچھی خبر یہ ہے کہ نانا صاحب انگریزوں کے جانی دشمن ہو گئے ہیں اور اندر ہی اندر جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' دینا ناتھ نے ہوا میں مٹھی لہرائی۔

''اگر مختلف محاذوں پر جنگ چھڑ جائے تو یہ فرنگی مقابلہ نہ کر سکیں گے۔''

حیدر خان کی تائید میں سبحان میاں نے فوراً کہا، ''بھئی وہ ملک کے کس کس حصے پر اپنی فوج روانہ کریں گے۔؟''

''وہ نہیں روانہ کر سکیں گے۔'' چنبیلی نے سرد ہوتی آگ پر پھونک ماری۔ آگ کے شعلے بھبھکنے لگے، ''فتح ہماری ہی ہوگی اور انگریز جس سمندر کے راستے سے ہمارے ملک میں داخل ہوا تھا، دیکھنا۔۔۔اُسی سمندر میں اُس کی لاشیں سڑیں گی۔''

''بہن تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' تارا خوشی سے چہکی۔

''لیکن حیدر خان، دلّی کا حال بھی تو ہمیں بتائیں۔''

''چنبیلی جان دلّی کا حال اور اس سے بُرا کیا ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کا بادشاہ اب صرف لال قلعے کا بادشاہ ہو کر رہ گیا۔''

''اور اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں؟'' چنبیلی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

''کبوتر بازی اور شعر و شاعری سے فرصت ملے تو۔۔؟''

''اللہ ہماری دلّی کی آبرو بچائے اور ان بے حس لوگوں کو بیدار کر'' چنبیلی کے ہاتھ دُعا کو اُٹھ گئے۔

''دمادم مست قلندر۔!'' سبحان میاں نے پھر نعرہ لگایا''یاعلی المدد۔۔د۔''

سبھی خاموش تھے۔

تارا نے قبرستان کی طرف دیکھا۔ سپیدی آسمان سے اُتر رہی تھی۔

''حیدر بھائی صبح اپنی آمد کا اعلان کر رہی ہے۔''

''ہاں۔۔۔!''

سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

حیدر خان، چنبیلی اور تارا نے ایک ساتھ قدم اُٹھایا، اور اُن کی پیروی میں سبحان میاں، پنڈت اور دینا ناتھ بھی شامل ہو گئے۔

پرندے اللہ کی حمد و ثنا میں مشغول تھے۔

اور یہ قافلہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار قبرستان کی پھاٹک سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

(۴)

اختر علی اپنی بیٹھک میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور اُن کے مقابل سلیم دوزانوں بیٹھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اُگالدان میں پیک تھوکا، رومال سے منہ صاف کیا اور سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے، ''میاں صاحبزادے، اب تک ہم تمھیں حضرت امیر خسرو کے متصوفیانہ اشعار سمجھا رہے تھے۔ یہ غزل جس کے تین شعر ہم تمھیں سمجھا چکے ہیں، اُن کا یہ اگلا شعر اپنی لطافت بیانی، پیکر تراشی، حُسن کی پرستش اور حسن کی سادہ لوحی کی بہترین مثال ہے۔

''جی۔'' سلیم نے اپنا سر کھجایا۔

''آں۔۔۔اب تم وہ شعر پڑھو!۔''

سلیم نے ایک نظر اپنے چچا پر ڈالی اور پھر اٹک اٹک کر شعر پڑھنے لگا

''وی ہمی۔۔رفت۔۔و۔۔زبس۔۔دیدہ کہ۔۔۔''

''لاحول ولاقوۃ۔۔۔'' اُنھوں نے اُسے ٹوکا، ''اماں تم شعر پڑھ رہے ہو یا اُسے قتل کر رہے ہو۔؟'' پھر اُنھوں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا، ''سنو۔۔شعر اس طرح پڑھتے ہیں۔

وی ہمی رفت و زبس دیدہ کہ غلطیدہ بخاک
گفت یارب کہ پائے نہم راہ کجاست

سلیم حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

''برخوردار۔۔تم حسن کے ناز و انداز کیا جانیں؟ تمھیں حسن اور عشق کی لذتوں کا کیا خاک اندازہ ہوگا؟ اور یہ کہ تمھیں کیا پتہ کہ محبوب کی حیرت زدہ آنکھیں کیا ہوتی ہیں؟ اُس کے انداز کیا ہوتے ہیں۔۔!'' اُنھوں نے سلیم کی آنکھوں میں جھانکا تو اُس نے گردن جھکا دی اور اُس کا دل روشن ہوگیا اور نیلوفر کی آنکھیں شعر کی تفسیر بن گئیں۔

''میاں صاحبزادے۔۔'' اختر علی نے اُسے مخاطب کیا اور وہ دل کا دریچہ بند کر کے اوپر دیکھنے لگا۔

''محبوب کا تصور کرو اور پھر اُس کی حیرت زدہ آنکھوں کو محسوس کرو کہ وہ نہایت بھولپن سے سوال کر رہی ہے کہ اے خدائے برتر میں اپنے پاؤں کہاں رکھوں؟ راستہ تو میرے سامنے ہے لیکن اُس راستے پر تمام لوگوں نے اپنی آنکھیں بچھا رکھی ہیں ۔اب میں کدھر سے جاؤں؟''

سلیم کے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔اُس نے نہایت معصومیت سے پوچھا، ''چچا جان یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ لوگ راستے میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔؟''

''اماں تم نہایت احمق ہو۔'' اختر علی کی آنکھیں اُبل پڑیں، ''میاں آنکھیں بچھانا یہ محاورہ ہے۔یعنی ساری آنکھیں حسن کو دیکھ رہی ہیں۔''

''تو چچا جان پھر تو راستہ صاف ہی ہوا نا۔۔وہ آرام سے وہاں سے چلی جاتیں۔''

''توبہ۔توبہ۔۔!'' اُنھوں نے کتاب بند کر دی، ''برخوردار تمھیں پڑھانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، جاؤ یہاں سے۔۔آسمان میں تھگلی لگانا یہ تمہارے بس میں نہیں ہے۔''

اور سلیم کسی سعادت مند بچے کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ویسے بھی وہ چچا سے غزل سمجھنے نہیں بلکہ غزل سے ملنے آیا تھا۔

''رُکو سلیم۔۔!'' نیلوفر نے سر پر دوپٹہ برابر کیا اور کشتی اُٹھاتے ہوئے بولی،

''ہم نے بادام کا حریرہ بنایا ہے۔آپ کو پسند ہے نا۔؟''

سلیم کے قدم رک گئے اور وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

''کیا کہنے بیٹی۔۔ویسے اسے حریرے سے زیادہ معجونِ دماغین کی ضرورت ہے۔فہم کس چڑیا کا نام ہے یہ قطعی نہیں جانتا۔''

''ابا جان آپ ہی تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ ہمارا خاندان فوجیوں کا خاندان ہے۔''نیلوفر کے لہجے میں شوخی تھی،''اور آپ ہی اِنھیں تلوار بازی کے بجائے شعرفہمی کا درس دے رہے ہیں۔''

اختر علی کا قہقہہ بلند ہوا۔

اور سلیم نے شرما کر گردن جھکا دی۔

''لو۔۔!''اُنھوں نے بھتیجے کو محبت سے آواز دی۔

اور دونوں کے چہروں پر حریرے کی مٹھاس پھیل گئی۔

''تو میاں اس شعر کا اصل حسن۔۔!''

''چچا جان۔''سلیم کے لہجے میں بےزارگی تھی اور اختر علی نے اُس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''پوری غزل تو میں نے سمجھ لی ہے بس یہی ایک شعر ہی تو رہ گیا ہے آپ اسے کل سمجھا دیں نا۔''

''کل کیا تمہاری عقل آسمان سے تارے توڑ لائیں گی؟''اُنھوں نے انکار میں گردن ہلائی اور پھر نیلوفر سے مخاطب ہوئے،''بیٹی ہماری پگڑی تو لا دیں۔''

''آپ کہیں جارہے ہیں ابا جان۔؟''اُس نے پگڑی باپ کے ہاتھوں میں تھمادی،اور اختر علی نے اُسے سر پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا،''بھئی میرٹھ سے حضرت قلق میرٹھی آئے ہیں اور مرزا نوشہ کے مہمان ہوئے ہیں۔ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔بس اُن سے ملنے جانا ہے۔''

''لیکن شتاب واپس آئیے گا۔''

''ہاں ہاں۔۔جلد ہی واپس آئیں گے۔''

سید اختر علی دروازے سے باہر نکل گئے۔

سلیم نے نیلوفر کی جانب دیکھا، اُس کی آنکھوں میں شرارت مچلنے لگی، ''جان بچی اور لاکھوں پائے۔''

''زیادہ پاؤں نکالنے کی ضرورت نہیں، ہم بھی چچی جان کی قدم بوسی کے لیے جارہے ہیں۔''

''تو جائیے نا۔۔ہمیں کیا؟ ہمارے بھی ساتھی ہماری راہ تک رہے ہیں۔''

''ارے تب تو جلدی کیجیے نا، کہیں ایسا نہ ہو کے کہ آپ کو دیر ہو جائے اور وہ آپ کے پھسڈی کنکوے بازابابیلوں کی مانند چھتوں پر اُلٹے لٹکے رہ جائیں۔''

''نیلوفر'' سلیم کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، ''واقعی ہم چلیں جائیں۔؟''

''لو۔۔تو کیا ہم آپ کو روک لیں۔؟''

''سچ سچ بتائیں نیلوفر۔۔کیا آپ کو ہمارا یہاں آنا پسند نہیں ہے۔''

''ہائے اللہ۔۔یہ ہم نے کب کہا کہ ہمیں پسند نہیں لیکن۔۔''اُس نے کلمے کی اُنگلی کے پہلے پور پر انگوٹھا رکھا''بس اتنا سا۔''

''اتنا سا۔۔؟''سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

''بدھو۔۔بہت پسند ہے۔''اور اُس نے شرما کر سر جھکا لیا۔سلیم نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔''نیلوفر تم کتنی اچھی ہو۔''

''کتنی اچھی ہوں۔۔؟''

سلیم نے بھی جھٹ کلمے کی انگلی کے پہلے پور پر انگوٹھا رکھا اور فوراً کہا،''اتنی اچھی۔''

''بس اتنی ہی اچھی۔؟''وہ اُس کی بانہوں میں سے نکل گئی،''جائیے اب ہم آپ سے کبھی بات نہ کریں گے۔''

''پگلی ۔۔تم بہت اچھی ہو۔۔۔ا''

دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سلیم آپ چاہتے ہیں نا، کہ ہمارا بیاہ آپ سے ہو جائے؟''

''ہاں''

''لیکن آپ کو پتہ ہے۔؟ ہمارا بیاہ ہمارے ابا جان اُس نوجوان سے کریں گے جو چار پیسے کماتا ہو، نوکری یا تجارت کرتا ہو، لیکن آپ تو۔۔!''اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سلیم کی آنکھوں میں جھانکنے لگی، سلیم کی آنکھوں میں شوخی اُسی طرح برقرار تھی۔اُس نے اُسے پھر ایک بار اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اُس کے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور آہستہ سے پھسپھسایا،'' اُن کو شاعری بھی تو پسند ہے۔''

''لیکن آپ کہاں شعر کہتے ہیں۔''

''یقین کریں۔۔بندہ اندر سے پورا پورا شاعر ہے ۔''

''ثبوت۔''نیلوفر نے دیدے مٹکائے۔

''بطور نمونہ حاضر ہے۔''

''جی ارشاد۔''

سلیم نے اُس کے کان میں کھنکارہ۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟۔''

''شعر سنیئے گا۔۔جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں نیلوفر

میرا دل غٹرغوں کرتا ہے مانندِ کبوتر''

نیلوفر کا قہقہہ بلند ہوا، اور وہ اُس کی بانہوں سے آزاد ہوگئی۔

سلیم نے اُس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑے اور سر کو جھکا کر آہستہ سے کہا،''بس آپ اتنی مہربانی کریں کہ مجھے اپنے کابک میں تھوڑی سی جگہ دے دیں، چچا جان کو میری امی جان سمجھا دیں گی۔''

''شریر کہیں کے۔''

''جی نوازش ہے۔'' اُس نے فرشی سلام کیا اور جانے کے لیے جونہی پلٹا تو نیلوفر اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگئی ''میرے غنڑغوں کا بک اوپر ہے، ہم ابھی آپ کو اُڑنے نہ دیں گے۔''

سلیم خوشی سے جھوم اُٹھا۔

حیدر خان، چنبیلی اور تارا کو لے کر اپنی دیوڑھی پر پہنچا۔ صدر دروازے پر قدیم طرز کا بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ دیواروں کی منڈیروں پر گھانس اُگ آئی تھی۔ اُس نے تالا کھولا اور زور سے دروازے کو ڈھکیلا۔ راہ داری میں بیٹھی ہوئی چند بلیاں بے تحاشہ دوڑتی ہوئیں دیواروں پر اُچک گئیں۔ وہ راہ داری کو پار کر کے صحن میں پہنچے۔ دھول گرد اور پرندوں کے پروں سے پورا صحن بھرا پڑا تھا، کنویں پر ڈول ابھی تک اُسی طرح رکھا ہوا تھا۔ وہ تینوں صحن سے دالان کی طرف بڑھے۔ وہاں بھی دروازے پر ایک بڑا سا تالا اُن کا منتظر تھا۔ حیدر خان نے اُسے بھی کھولا۔ کرسیوں پر دھول جمی ہوئی تھی، دالان سے متصل کمروں پر بھی تالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک تالے کو کھولتا گیا۔ کوچے چیلاں میں واقع یہ دیوڑھی حکیم مومن خان مومن کی دیوڑھی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ چنبیلی اور تارا صاف صفائی میں لگ گئیں اور حیدر خان ضروری اشیا کی خریداری کے لیے بازار کی طرف نکلا۔

تارا نے کنویں میں ڈول ڈالا، اور چنبیلی ضروری برتنوں کو دھونے میں لگ گئی۔ غسل خانے میں موجود سماور سے بھاپ اُٹھنے لگی۔

حیدر خان جب دیوڑھی میں واپس آیا تو اُس کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ مسہری پر صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی، اور بیٹھک سفید فرش کے ساتھ گاؤتکیوں سے سج چکی تھی۔ تارا قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ وہ پلٹی، اور حیدر خان کے ہاتھوں میں سے تھیلیاں لے لیں اور سیدھا باورچی خانے میں پہنچی۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ذہن میں ماضی کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے

۔۔۔ ایک بھرا پورا خاندان ۔۔۔ اُس کے والد محکمے پولس میں داروغہ کے منصب پر فائز تھے۔ اُن کی نیک نامی اور اُصولی زندگی کے ہر طرف چرچے تھے۔ وہ تھے بھی اونچے پورے چوڑے چکلے۔ اُن کی شبیہ اُس کی آنکھوں میں اُبھر آئی۔ جسم پر وردی، موٹی موٹی آنکھیں، رعب دار چہرا، اور اُس پر گھنی بڑی بڑی مونچھیں۔ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اُس کے گالوں پر پھسل گئے۔ اُس نے دروازے کی جانب دیکھا، امّی جان، خالہ امی، اور کچھ دوسری عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔

''اے بی بی ماشااللہ سے حیدر میاں کی جوانی بلائیاں لے رہی ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے کچھ تو اُن کی فکر کریں۔'' خالہ امّی نے حیدر خان کو دیکھتے ہوئے کہا جو اُس وقت نئی اچکن پر عطر مل رہا تھا۔

''بجو۔۔ ابھی ابھی تو بچپن نے الوداع کہا ہے۔ ابھی کونسی عمر ہوئے جا رہی ہے، جو میں اُن کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دوں۔''

امّی جان مسکرا رہی ہیں۔

''بو بھا بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بچہ بچہ کہتی رہ جائیں، اور وہ اُٹھا لائیں کوئی کرسانی اسنا ہے کہ نگوڑیاں بڑی آنکھ مٹکا کرتی ہیں۔ نہ شرم و حیا نہ گوشہ و پردہ۔''

''زیتون آپا۔'' امّی جان نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں کھری کھری کہتی ہوں، اس لیے منہ پھٹ مشہور ہوں۔ آگے تمہاری مرضی۔'' زیتون خالہ نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اُٹھا لیے۔

''اے ہے سچ ہی تو کہا ہے زیتون آپا نے۔'' خالہ جان امّی جان کو سمجھانے لگیں، ''اگر تمہاری مرضی ہو تو میں بات چلاؤں شبیر خان صاحب کے گھر۔۔۔؟''

امّی جان نے اُنہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اے ہے۔۔۔ وہی قاضی حوض والے، جو کپڑوں کی تجارت کرتے ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے اُن کے پاس۔ لے دے کے بس ایک ہی لڑکی ہے، دبلی پتلی، سرو قد، ناک نقشہ بھی بُرا نہیں، اور رنگ بھی کھلتا ہوا ہے۔ حیدر میاں اور اُس کی جوڑی

آفتاب و مہتاب کی جوڑی لگے گی، جو بھی دیکھے گا اُس کی زبان سے یہی نکلے گا کہ اللہ نظر بد سے بچائے۔۔''

''بجو۔۔۔حیدر میاں کی مرضی جانے بغیر میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''تو پھر یونہی بیٹھی رہو۔۔۔کل اگر وہ کوئی کرسٹانی پسند کر لیں تو۔؟''

''مجھے وہ بھی منظور ہوگی۔''

''اے ہے بی بی تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔ہمیں کیا؟ بیٹا تمہارا، آنیوالی بہو تمہاری، ہمیں کیا پڑی کہ کہیں کہ آ بیل مجھے سینگ مار۔''

حیدر خان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔امّی جان صبر کرتی رہ گئیں، نہ اُنھوں نے کبھی خالہ جان کی بات مانی، نہ بیٹا کوئی کرسٹانی کو گھر لایا۔لیکن امّی جان تمہارے گھر ہندوستانی بہو ضرور آ گئی ہے۔کاش آپ زندہ ہوتیں۔اُس نے جیسے ہی سامنے دیکھا، چنبیلی غسل خانے سے نکل رہی تھی۔اُس نے بالوں کو تولیے میں لپیٹ رکھا تھا۔چہرا چاند کی طرح دمک رہا تھا اور پیروں کا حُسن صندل کو شرمار ہا تھا۔وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور محبت بھری نظروں سے اُسے نہارنے لگا،''کیا اس اُجڑے ویرانے میں کوئی حور اُتر آئی ہے۔؟''

''نہیں تو۔''چنبیلی کے چہرے پر تازہ کلیوں کی مسکراہٹ کھل اُٹھی،''یہ تو وہی آپ کی چنبیلی ہے۔بس غسل نے تھکاوٹ کی گرد جھاڑ دی ہے۔''

حیدر خان مسکرانے لگا۔

''سماور میں پانی کھول رہا ہے۔آپ بھی نہا لیں۔''

وہ اُٹھا اور سیدھا حمام کی طرف چل پڑا۔

پنڈت اور دینا ناتھ جمنا گھاٹ پر بے مقصد ہی گھوم رہے تھے۔سادھوؤں کی ٹولیاں پوجا پاٹ میں مگن تھیں اور لوگ گناہوں سے پاک ہونے کی چاہ میں ندی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

''یہ ڈبکیاں بدن کا میل اور گناہوں کا پشتارہ تو دھو سکتی ہے دینا ناتھ، پر کیا کوئی ایسا بھی اشنان ہو سکتا ہے جس سے آدمی کی غیرت جاگ جائے؟'' پنڈت نے نہاتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''ارے بھیا اگر ایسا اشنان ہم لوگ جانتے تو کیا آج یہ فرنگی بچے ہمارے آقا ہوتے۔؟''

''واہ بھیا کیا بات کہی ہے۔''

دونوں آگے بڑھے، تپتی دھوپ میں کوئی جوگی ایک تارے کی لئے پر ڈول رہا تھا،

رہنا نہیں دیس برانا ہے۔۔۔
رہنا نہیں دیس برانا ہے
یہ سنسار کاغذ کی پڑیا
بوند پڑے گھل جانا ہے
یہ سنسار کانٹ کی باڑی
اُلجھ پُلجھ مری جانا ہے
یہ سنسار جھاڑ اور جھانکر
آگ لگے بری جانا ہے
کہت کبیر سنو بھائی سادھو،
ست گرو نام ٹھکانا ہے۔

دونوں کے دل روشن ہو گئے، اور آنکھوں میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ گھوم گیا۔

''یہ وہ موہ مایا کا بکٹ جال ہے جو آدمی سے اُس کی مانوتا چھین لیتا ہے، پر وہ اپنے ساتھ لے کر کیا جائے گا۔؟'' دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے قدم آگے بڑھا لیے۔

دور تک جمنا بہتی چلی جا رہی تھی۔ اُس پر کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ شفاف پانی لہریں مار رہا تھا اور جمنا کے اُس طرف آسمان جھکا ہوا تھا۔ سورج پوری تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا۔ پرندے اُڑ رہے تھے۔ پانی میں اُبھرنے والی مچھلیوں اور کشتیوں سے پھینکے جانے والے دانوں پر جھپٹ رہے تھے۔

''پنڈت۔۔۔! سنا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی کتاب تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ یہ پرندے وسط ایشیا سے آتے ہیں۔ یہ اتنی دور سے کیوں آتے ہیں؟''

پنڈت نے آسمان میں اُڑتے ہوئے قرقونچوں کی جانب دیکھا''دانوں کی تلاش اُنھیں یہاں تک لاتی ہے۔''

''فرنگیوں کی طرح۔۔۔؟''اور پھر دینا ناتھ کو ان پرندوں میں واقعی فرنگیوں کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ نفرت سے اُس کا چہرا سرخ ہونے لگا۔ اُس نے پھیلی ہوئی ریت میں سے ایک پتھر اُٹھایا اور پوری طاقت سے اُن پرندوں کی طرف پھینکتے ہوئے دھاڑا،'' جاؤ کم بختوں۔۔۔ اپنے دیس سدھارو۔ کیا تم بدیسیوں نے طئے کر رکھا ہے کہ یہاں کے انسانوں اور پرندوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑیں گے۔؟''

اُڑنے کا ہنر جاننے والے پرندے اُس کے پتھر کی ضرب سے بہت دور تھے۔ اُنھوں نے اُسے کوئی اہمیت نہ دی اور اُسی انداز سے مچھلیوں اور دانوں پر جھپٹتے رہے۔

''بے غیرت اولاد۔''وہ پھر ایک بار زور سے چیخا۔

اور جمنا کے کنارے چہل قدمی کرنے والوں نے اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا کوئی پاگل بڑبڑا رہا ہو۔

ڈیوڑھی کے دالان میں فرش پر حیدر خان، چنبیلی اور تارا بے تکلف بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے۔ تارا نے ایک نظر طائرانہ ڈیوڑھی کے ماحول پر ڈالی اور پھر اچانک ایک سوال اُس کے ذہن میں اُبھرا،'' حیدر بھائی، یہ ڈیوڑھی، یہ اس کا سلیقہ اور

اس کے در و بام سے اُٹھنے والی پاکیزگی، پھر آپ کے چہرے پر شرافت کا نور، یقین نہیں آتا کہ جس انسان کو زندگی کی اتنی ساری نعمتیں حاصل ہو، آخر وہ ان سب کو ٹھکرا کر موجودہ زندگی سے کیوں سمجھوتا کر رہا ہے۔''

حیدر خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے چھت کی طرف دیکھا، بے نور جھومر لٹک رہا تھا اور گرد و دھول میں اٹے ہوئے اُس کے حصے اُس کی ماضی کی خوبصورتی کو بیان کر رہے تھے۔ حیدر خان کے لب بھی گویا ہوئے،'' تارا بہن میرے والد پولس کے داروغہ تھے اور اُن کے والد فوج میں دو ہزاری منصب پر فائز رہے۔ میری پرورش نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ میری تربیت میں فوجی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ، مذہب، فقہ، قرآن و حدیث، اور ادبیات بھی شامل رہے ہیں۔ میں جوں جوں جوانی میں قدم رکھ رہا تھا، میرے والدین کی آنکھوں میں میرا شاندار مستقبل جگمگانے لگا تھا۔ پھر میں فوج میں بھرتی ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کرتا گیا۔ میری بڑی عزت تھی۔ اُس وقت میں لکھنؤ میں تعنیات تھا۔''اُس نے تارا اور چنبیلی کی طرف باری باری دیکھا۔ تارا ہمہ تن گوش تھی اور چنبیلی فرش پر اپنی اُنگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی لکیروں کا جائزہ لینے لگا۔'' تارا بہن اُس وقت میں فرنگی افسروں کے ساتھ کلب جاتا، شراب نوشی کرتا، انگریز عورتوں کے ساتھ ڈانس بھی کرتا۔ مجھے اُن کی تہذیب سے بڑھ کر اور کوئی تہذیب دکھائی نہ دیتی تھی اور میں اکثر سوچا کرتا کہ یہ کس قدر آزاد خیال قوم ہے۔ ان میں کہیں بھی تعصب اور امتیاز کا جذبہ نہیں ہے۔۔لیکن ایک دن۔۔۔''

وہ پھر خاموش ہوگیا۔

اور چنبیلی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا،''حیدر خان مہربانی کر کے وہ کہانی مت سُنانا میں ندامت سے مر جاؤں گی۔''

تارا نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا اور حیدر خان اپنے آپ میں اُلجھنے لگا۔

''بہن! تم کیا سمجھتی ہو، میری کوئی کہانی نہیں ہے۔'' تارا نے چنبیلی کی طرف دیکھا، ''میں نے ان ذلیل فرنگیوں کے ہاتھوں کیا کچھ نہیں کھویا، تم سننا چاہو گی؟ چنبیلی ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ بس کوئی بادبان کی آڑ میں ہے اور کوئی پانی کے تھپیڑوں کو جھیل رہا ہے۔ اب شرمانے یا گھبرانے یا پچھتانے کا وقت نہیں ہے۔ دل کو مضبوط کرو اور وقت کی باگ موڑنے کی فکر کرو۔''

دونوں نے حیدر خان کی طرف دیکھا اُس کا چہرا جوش سے بھر گیا تھا چنبیلی کا سر جھک گیا اور تارا کا اشتیاق بڑھ گیا۔ اُس نے حیدر خان کی طرف دیکھا اُس کا جوش اب ایک عجیب سے تناؤ سے گزر رہا تھا۔ تارا نے اُسے آہستہ سے آواز دی، ''حیدر بھائی۔''

اور وہ اپنے آپ میں واپس آیا اور کہنے لگا، ''تارا وہ دن میری زندگی کا عجیب دن تھا۔ جانے کیوں مجھے بار بار محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ تمام دن میں نے بے چینی سے بسر کیا اور جیسے ہی میری ڈیوٹی ختم ہوئی، میں اپنے کوارٹر میں پہنچا۔ میرے ملازم نے ٹیبل پر کھانا چُن دیا۔ میں نے نا چاہتے ہوئے بھی کچھ لقمے توڑے، رات پاؤں پسارنے لگی تھی، لیکن میں پھر بھی گومتی کے کنارے ٹہلنے کے لیے چلا گیا اور بہت دیر تک یونہی بے مقصد کنارے کنارے گھومتا رہا۔ گومتی کے عین کنارے بلندی پر ہماری فوجی چھاؤنی تھی۔ میں جونہی سڑک پر آیا، دوڑتی ہوئی بگھی سے ایک زنانی چیخ سنائی دی۔ میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن جواب میں مجھے صرف مردانہ قہقہے سنائی دے رہے تھے اور بگھی چھاؤنی کی جانب دوڑ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا، ''خدا جانے بگھی میں کون ہوگا لیکن۔۔۔''

''بگھی میں میں تھی۔۔۔!'' اچانک چنبیلی نے خود ہی کہنا شروع کیا، ''ان فرنگی فوجیوں نے مجھے عزیزن بائی کے کوٹھے سے پستول کی نوک پر اغوا کیا تھا اور مجھے زبردستی چھاؤنی لے کر گئے تھے۔ مجھے اپنا بُرا حشر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ایک کمرے میں بند تھی اور وہ حرام زادے دوسرے کمرے میں بیٹھے شراب پی رہے تھے

اور میں خدا سے گڑ گڑا رہی تھی کہ اے مالکِ دو جہاں میری حفاظت کر، کسی فرشتے کو میری مدد کے لیے بھیج دے۔''

''اور وہ فرشتہ صفت میرے حیدر بھائی تھے۔۔۔ ہے نا چنبیلی بہن؟'' تارا کے چہرے پر حیدر خان کے احترام اور بےلوث جذبوں کی چھوٹ پڑنے لگیں۔

''تارا بہن جیسے ہی میں چھاؤنی میں داخل ہوا اُن کی تہذیب اور اُن کی بدکاری کی ساری حقیقتیں یک لخت ظاہر ہو گئیں۔ انھیں میرا وہاں پہنچنا ناگوار گزرا، اور وہ مجھے بےعزت کرنے لگے۔'' حیدر خان نے سامنے کی دیوار پر نظریں گاڑ دیں، اور پھر سارا منظر جیسے آپ ہی آپ روشن ہونے لگا۔

سارجنٹ ایف نے شراب کا پیالہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے حیدر خان کی جانب حقارت سے دیکھا، ''اوہ۔۔ یو باسٹرڈ حیدر ابھی تم ادھر کیوں آیا؟ اب آ ہی گیا تو دیکھو ہم تمہارے سامنے ایک مسلمان عورت کو کیسے ننگا کرتا ہے۔۔۔!''

وہ اور اس کے ساتھیوں نے قہقہہ لگایا۔

''نو نو نو۔۔ صرف ننگا نہیں کرے گا۔۔ بلکہ اُس کے ساتھ۔۔۔''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرتا، حیدر خان کا گھونسہ اُس کا جبڑا توڑ چکا تھا اور وہ درد سے گالیاں بکنے لگا، ''یو فول۔۔۔ باسٹرڈ۔۔۔۔۔۔۔۔''

اور دوسرے دو آفیسر لہراتے ہوئے اُس کی طرف بڑھے۔ حیدر خان پھرتی سے اُچھلا اور اُس کی دونوں لاتیں اُن کے سینوں پر پڑیں اور وہ دور جا گرے۔

اسی بیچ چنبیلی نے اندر سے دروازہ کو تھپتھپایا۔

حیدر خان چیل کی طرح دروازے کی طرف لپکا۔ پہلا فوجی پستول نکال ہی رہا تھا کہ وہ چنبیلی کے پاس پہنچ گیا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اُس نے اُس میں سے جھانکا اور اندھیرے نے اُسے بتایا کہ نیچے گومتی پورے غرور کے ساتھ بہہ رہی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ فوجی پستول لے کر اُس کی جانب بڑھتا، اُس نے چنبیلی کا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ تھاما اور کھڑکی سے گومتی کے دھاروں میں چنبیلی کو لے کر کود گیا۔

او پر فائر ہوتے رہے اور گومتی کا پانی شور کرتا رہا۔ حیدر خان اور چنبیلی پانی کی تہہ میں اُترتے جا رہے تھے، اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھ پیر چلانے لگے۔

تارا کے لبوں سے داد و تحسین بلند ہوئی۔

حیدر خان مسکرانے لگا۔

لیکن چنبیلی اب بھی خاموش بیٹھی تھی۔

تارا نے چنبیلی کی طرف دیکھا، لیکن شرمندگی اب بھی اُسے کسی دیوانے کتے کی مانند جھنجھوڑ رہی تھی۔ تارا نے اُس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے،''بہن تم تو پھر بھی محفوظ رہیں۔ یہ فرشتہ تو میرے پاس اُس وقت پہنچا تھا جب میں ہر طرح سے بے آبرو ہو چکی تھی۔ میں مرنا چاہتی تھی لیکن میرے پاس موت تک پہنچنے کا کوئی وسیلہ بھی نہیں تھا۔ اُس وقت میں صرف روتی تھی۔ بلکتی تھی اور رات کے آنے سے خوف زدہ سی ہو جاتی تھی، کیونکہ ہر رات میرا دھرم قتل ہوتا، ہر رات میں بار بار مرتی تھی، ہر رات میرا بدن بوٹی بوٹی نو چا جاتا تھا، میں گڑگڑاتی، روتی، بلکتی، اُن کے قدموں میں گرتی لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حیدر خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اُس نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا،''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ وقت پچھتانے کا نہیں ہے، کچھ کر گزرنے کا ہے۔'' اُس نے پلٹ کر دونوں کی طرف دیکھا،''چلو میرے ساتھ۔ ہم گھر گھر جائیں گے اور ان حرام زادوں کے ظلم کی داستانیں سنائیں گے۔ اُن کے لیے نفرتوں کے جذبوں کو بیدار کریں گے۔ ہمارا ایک ایک لمحہ بے حد قیمتی ہے۔۔۔ چلو۔۔۔!'' اُس نے آگے قدم بڑھایا اور اُس کے پیچھے تارا اور چنبیلی بھی قدم بڑھانے لگیں۔

رات ابھی پوری طرح زمین پر اُتری نہیں تھی۔

مرزا مغل کی کوٹھی میں رنگ اور روشنی کی قوس قزح اُتر آئی تھی تو باہر سنہری

روشنی میں زنانی دستہ ہاتھوں میں نیزے اُٹھائے پہرہ دے رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت ایک کنیز تیر کی طرح دوڑتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہوئی۔

بیگم مرزا مغل اپنے حجرۂ خاص کی زرین کمان میں کھڑی تھیں اور فانوسوں کی چھنتی ہوئی روشنیوں میں اُن کا حسن چودھویں کے چاند کی مانند دمک رہا تھا۔ اُن کی زلفیں کھلی ہوئی تھیں اور مرصع دوپٹہ فرش سے باتیں کر رہا تھا۔ اُن کی انگلیوں میں موجود ہیروں کی انگوٹھیوں سے قوسِ قزح کے رنگ چھوٹ رہے تھے۔ دائیں بائیں کنیزیں اور خواصیں دستہ بدستہ کھڑی تھیں۔ کہ کنیز داخل ہوئی، تعظیم بجالائی اور عرض کیا، ''شہزادے سلطنت، حضور عالی وقار، دودمانِ تیموری وچنگیزی اس حجرۂ خاص میں تشریف لاتے ہیں۔''

بیگم مرزا مغل نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پل بھر میں کنیزیں چھٹ گئیں۔ اور شہزادہ عالی وقار حجرۂ خاص میں داخل ہوئے۔ بانو دل محل نے خوش آمدید کہتے ہوئے فرشی سلام کیا

شہزادے نے محبت بھری نظروں نے اُن کا جائزہ لیا۔ اُن کے چہرے پر مسرت کے انار چھوٹنے لگے، ''مرحبا۔۔۔ شب کی آمد نے جمالِ پری وش کو اور بھی منور کر دیا ہے۔۔۔۔۔ چشمِ بدور۔''

''قطع کلامی معاف ہو حضور۔۔۔ یہ شب کی کرامت نہیں، بلکہ حضور کے قدم رنجہ فرمائی کا کرشمہ ہے۔''

''سبحان اللہ۔۔۔!'' بے اختیار ولیعہدِ سلطنت کی زبان سے نکلا۔ اُنھوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اُنھیں جیسے ہی چھوا، اُن کے پورے بدن میں ستار کے مانند تار جھنجھنا اُٹھے، اور وہ شدت جذبات سے بے قابو ہو کر اُن کے سینے سے لگ گئیں۔ اور شہزادے نے اُن کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور وہ اُن کی بانہوں میں جھول گئیں۔

وقت تھم گیا اور شمعوں کی لویں گستاخی کے خوف سے لرز اُٹھیں۔

شہزادۂ سلطنت نے اُنھیں کو اپنی گود میں اُٹھالیا اور پھولوں سے سجی مسہری پر آہستہ سے بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

''صاحبزادۂ عالم آپ کی یہ نوازشیں کہیں قلعہ معلیٰ میں حسد کی آگ نہ بھڑکا دیں''

''اور ہم اُس لمحے کا انتظار کریں گے۔'' اُنھوں نے نہایت محبت بھری نظروں سے دیکھا اور حضور بانو کی آنکھوں سے سرور ٹپکنے لگا، اُن کی نگاہیں جھک گئیں اور شہزادے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، ''ہمارا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔۔

قصہء فرہاد و مجنوں اور ہے
عشق کی میرے نشانی اور ہے

بیگم مرزا مغل پر خود سپردگی کا عالم چھا گیا اور وہ شہزادے سے لپٹ گئیں اور اُن کی باہیں شہزادے کے پشت پر سخت ہو گئیں۔ ولی عہد کی آنکھیں جذبات سے بند ہونے لگیں اور وہ اُنھیں مسہری پر لے گرے۔

روشنی جھملاتی رہی، ہواؤں سے پردے سرسراتے رہے اور دور بیٹھا مغنّی تانرس خان گاتا رہا۔

خیز تا بادہ در پیالہ کنیم
گل درونِ قدح چو لالہ کنیم

کوچہ چیلاں سے یہ تین گھوڑ سوار دلّی کے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے جب سرائے کالے خان تک پہنچے تو رات کی چلمنیں آسمان سے زمین پر کھل چکی تھیں۔ اُنھوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ آسمان میں چاند بھی اُن کے ساتھ دوڑ رہا تھا اور چاندنی اُن کے راستوں کو روشن کر رہی تھی۔ ہوا میں آہستہ آہستہ خنکی بڑھنے لگی تھی۔ حیدر خان نے ایک نظر آسمان پر ڈالی اور پھر اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور اپنا گھوڑا چنبیلی سے قریب تر کر دیا۔ اُس کے دل میں اُمنگیں مچلنے لگیں اور نغمہ

اُس کی زبان پر آ گیا۔۔۔

رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو جاگ مسافر پیارے

آوا گون سرائیں ڈیرے
ساتھ تیار مسافر تیرے
اجے نہ سُنیوں کوچ نقارے

رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو جاگ مسافر پیارے

گھوڑے اُسی طرح برق رفتار دوڑ رہے تھے۔چنبیلی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور حیدر خان اُسے دیکھ رہا تھا۔اُس نے بھی حیدر خان کی طرف دیکھا، اور پھر اُس کے لب بھی گنگنا اُٹھے۔۔۔۔

رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو جاگ مسافر پیارے

موتی چُونی، پارس پاسے
پاس سمندر مرد پیاسے
کھول رکھیں اُٹھ بو بیکارے

رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو جاگ مسافر پیارے

تارا نے بھی اپنا گھوڑا دونوں کے بیچ ڈال دیا اور ترنگ میں ڈوبی اُس کی بھی آواز گونجی۔۔۔

رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو جاگ مسافر پیارے

کر لے آج کرنی دا دیرا

مُڑ نہ ہوسی آون تیرا
ساتھ چلو، چل پکارے

اور پھر تینوں کے سُر مل گئے۔

رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو جاگ مسافر پیارے
رین گئی لٹکے سب تارے
اب تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ شاداں وفرحاں بڑھے جا رہے تھے اور اپنی منزل سے قریب بہت قریب ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ دور سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کا گنبد نظر آنے لگا تھا اور زمین سے روشنی آسمان کی جانب اُٹھ رہی تھی۔ گھوڑوں نے رفتار پکڑ لی اور ہواؤں کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔

جیسے ہی وہ درگاہ کی جانب جانے والی سڑک کی طرف مڑے، گھوڑوں کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ درگاہ کی طرف لوگوں کے قافلے کے قافلے رواں تھے۔ کوئی پا پیادہ تھا، کوئی سوار تھا، کوئی چادر اُڑھے ہوئے تھا، کسی کے ماتھے پر تلک چمک رہا تھا اور کوئی گھونگھٹ کاڑھے چلا جا رہا تھا۔ وہ تینوں بھی گھوڑوں سے اُتر گئے اور پا پیادہ درگاہ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔

چھاپ تلک سب چھوڑی رے
مو سے نیناں ملا ئی دے
نیناں ملائی دے، مو سے نیناں ملائی دے

چنبیلی اور تارا داخلی دروازے کے باہر ہی ٹھہر گئے اور حیدر خان اندر داخل ہوگیا۔

خسرو نجام کے بل بل جایئے
خسرو نجام کے بل بل جایئے

موہے سہاگن کی نی رے

موسے نیناں ملا ئی دے ،

موسے نیناں ملا ئی دے

سامنے ہی حضرت امیر خسروؒ آرام فرما تھے۔ حیدر خان سیدھا اُن کے مزار پر حاضر ہوا۔ تارا اور چنبیلی نے اندر جھانک کر دیکھا۔ خانقاہ کے صحن میں خوش الحان قوال اپنی ترنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، اور لوگوں کی گردنیں عقیدے سے جھوم رہی تھیں۔

حیدر خان ٹکٹکی باندھے مزار کو گھور رہا تھا اور پھولوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ اُس کے دل و دماغ میں حضرت امیر خسروؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بے لوث محبتوں کے سارے ہی واقعات گردش کرنے لگے اور اُس کا ذہن بیدار ہو گیا، ''یا حضرت آپ اپنے مرشد کے مرید بھی تھے، دلبند بھی تھے، دلدار بھی تھے، دلبر بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یار بھی تھے۔ آپ دونوں کی دوستی، پیار محبت اور خلوص کی داستانیں تا قیامت لوگ دوہراتے رہیں گے۔ یا حضرت دُعا فرمایئے کہ میرے دوستوں میں بھی وہ ہی محبت بیدار ہو۔ ہمارا مقصد اُسی طرح مستحکم رہے۔ یا حضرت میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ میں یادگار بن جاؤں۔ میں بس آپ کی سرزمین کو ان فرنگیوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔!''

اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ خاموش کھڑا رہا، جیسے اُسے انتظار ہو کہ حضرت امیر خسروؒ اُس سے مخاطب ہونگے اور اُسے اپنی دُعاؤں سے نوازیں گے۔

چنبیلی نے تارا کی طرف دیکھا،''حیدر خان ابھی تک واپس نہیں آیا، چلو ہم بھی اندر چلتے ہیں۔''

جونہی وہ اندر داخل ہوئے، حیدر خان حضرت امیر خسروؒ کے مزارِ مبارک سے نکل کر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بارگاہ میں داخل ہو رہا تھا۔

دونوں نے درگاہ کے چاروں سمت نگاہیں دوڑائیں۔ زائرین و معتقدین دکھائی دیے۔ کوئی قوالی میں بیٹھا ہوا تھا، کسی پر وجد طاری تھا، کچھ لوگ اِدھر اُدھر ٹہل

رہے تھے اور ایک دیوار سے لگ کر فقراء کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند عین گنبد کے اوپر ٹھہرا ہوا تھا اور اُس سے نور برس رہا تھا۔

حیدر خان آنکھیں بند کیے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار مبارک کے قریب کھڑا تھا۔ بہت دیر تک وہ اُسی طرح کھڑا رہا، اُس کا دل روشن ہونے لگا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کے دل کی باتیں سن رہا ہے اور وہ کہہ رہا ہے، ''یا حضرت میں اس سے پہلے بھی اُس وقت آیا تھا جب میں نے چنبیلی سے شادی کر لی تھی۔ اُس وقت بھی میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا تھا اور آج بھی میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگوں گا، لیکن پھر بھی میرا دامن پھیلا ہوا ہے۔ یا حضرت کب تلک ہماری قوم خوابِ غفلت میں زندگی بسر کرے گی، کب تلک فضولیات میں ڈوبی رہے گی؟ میں اور میرے ساتھی فرنگیوں کی سامراجیت کے خلاف ماحول تیار کر رہے ہیں، لیکن اب تلک بھی کوئی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ یا حضرت کہیں سے تو کوئی چنگاری روشن ہو، کہیں سے تو کوئی لاوہ پھوٹے، کہیں تو ہماری غیرت جاگے اور ہم ذلت و رسوائی کے ماحول سے نکل سکیں۔ بس یا حضرت میری آپ سے یہی درخواست ہے اور میں یہی بات کہنے آپ کے در پر آیا تھا۔''

اُس نے آنکھیں کھول دیں اور مزارِ مبارک کی طرف دیکھا اور آہستہ سے خدا حافظ کہا، اور پھر بارگاہ سے باہر نکل گیا۔

داخلی دروازے کے پاس چنبیلی اور تارا اُس کے منتظر تھے۔ وہ اُن کے قریب پہنچا اور پھر تینوں خانقاہ سے باہر آ گئے اور اپنے گھوڑوں کی جانب بڑھنے لگے۔ اُن کے کانوں سے قوالی ٹکرا رہی تھی۔۔۔۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
کیسے میں لاؤں جمنا سے بھر مٹکی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

اُن کے گھوڑے دوڑ رہے تھے اور آوازیں آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی تھیں

ڈگر پنگھٹ کی

ڈگر پنگھٹ کی

ڈگر پنگھٹ کی۔۔۔۔

وقت کے چاک پر دن اور رات اسی طرح گردش کر رہے تھے۔

فرنگیوں کی لوٹ کھسوٹ اسی طرح جاری تھی۔

ہندوستانی بکتے رہے، دین وایمان کے سودے ہوتے رہے۔

غدار اور مکار، قوم کو دھوکا دیتے رہے۔

☆☆☆☆☆

(۵)

سنسان رات کا سینہ چیرتا ہوا، برق رفتار گھوڑے پر سوار ایک نوجوان تیزی سے چلا آرہا تھا۔ اُس کے پاس ایک ایسی اطلاع تھی جو کسی بھی وقت جوالامکھی بن کر پھٹ سکتی تھی اور اس سے پہلے کہ کچھ ہو، وہ اُس خبر کو پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اُس نے نظریں سامنے کیں اور چاندنی میں دور تک اوبڑ کھابڑ راستہ دکھائی دیا۔ خدا جانے مجھے پہنچنے میں ابھی کتنی دیر لگے گی۔؟ اُس نے گھوڑے کو پھر ایڑ لگائی اور اُس کے سوچ کی رفتار اُس سے بھی تیز دوڑنے لگی۔ اُس کے دماغ میں ایک ایک منظر روشن ہونے لگا۔ کتنے دنوں سے بارک پور کی فوجی چھاؤنی کے اطراف اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر سرگرداں تھا، لیکن کوئی ہمنوا بننے کو تیار نہ تھا، لیکن اب تو لاوہ پھوٹے گا۔ آگ بھڑکے گی اور یہی آسمان وہ منظر دیکھے گا۔ اُف یہ رستہ تو کٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ گھوڑے کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ شاید وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دور کسی سرائے کی روشنی دکھائی دی۔ گھوڑا پھر ایک بار ہوا سے باتیں کرنے لگا تھا۔

قبرستان میں آگ روشن ہو چکی تھی۔ وہی سناٹا تھا، وہی ٹھنڈ تھی اور ویسا ہی کہر چھایا ہوا تھا۔ آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ دینا ناتھ نے قبرستان کی پھاٹک کے پرے دور جاتی ہوئی سڑک کو دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ اُس نے پھر ایک بار اپنے ہاتھ آگ کے سامنے کر دیے، ''یہ حیدر بھائی ابھی تک نہیں آئے ہیں۔۔!''

''ہاں۔۔تارااور چنبیلی بھی تو اُن کے ساتھ ہیں، آ رہے ہونگے۔'' پنڈت نے جماہی لی۔

''لومیاں، تم تو ابھی سے نیند کے بلاوے کو،'' میں حاضر ہوں'' کہنے لگے ہو۔!''

سبحان میاں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

''ہاں سبحان بھائی۔۔۔ پتہ نہیں کیوں نیند سی آ رہی ہے۔''

''ایں۔۔تو کیا قبرستان میں سونے کا ارادہ ہے؟''

پنڈت نے آتی ہوئی جمائی کو بیچ ہی میں توڑ دیا۔

دینا ناتھ کا قہقہہ بلند ہوا،'' کیوں پنڈت ڈر گئے۔؟''

پنڈت نے اُسے گھور کر دیکھا اور پھر سبحان میاں سے مخاطب ہوا،'' سبحان بھائی کیا آپ کو کوئی کہانی یاد ہے۔؟''

سبحان میاں نے نعرہ لگایا،'' دمادم مست قلندر۔۔بابا ہم فقیروں کے پاس کیا ہے؟ سوائے کہانیوں کے۔''

''تو پھر سنایئے نا۔'' دینا ناتھ نے سبحان میاں کو آنکھ سے شریر اشارہ کیا،'' کم از کم ہمارے دوست کی نیند تو بھاگے گی۔''

سبحان میاں شاید کہانی شروع ہی کر دیتے لیکن دینا ناتھ کے اشارے نے اُن کے تیور بدل دیئے اور وہ قدرے سخت لہجے میں گویا ہوئے،'' یہ سب کچھ کہانیوں ہی کا تو نتیجہ ہے کہ جس نے ہمیں کاہل اور سست بنا دیا ہے۔ہم آج بھی پدرم سلطان بود سے آگے کبھی سوچتے ہی نہیں؟ اور تم آج بھی اُسی کہانی کی بات کر رہے ہو؟''

دونوں خاموش ہو گئے۔

بس لکڑیاں جلتی رہیں۔

اور شعلے لہراتے رہے۔

قبرستان کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں نے اچانک پھڑ پھڑانا شروع

کیا اور تینوں نے چونک کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی ، اور کوئی پرندہ نیچے گرا
" بیچارہ" دینا ناتھ آہستہ سے بڑبڑایا، " سو گیا ہوگا۔"

پنڈت نے اُسے پھر گھور کر دیکھا۔

اور دور سے گھوڑے نے اپنی آمد کا اعلان کیا۔

"حیدر بھائی آ رہے ہیں۔"

" ہاں ۔۔ شاید وہی ہوں گے۔" لیکن سڑک ابھی تک سنسان تھی۔

سبحان میاں نے نعرہ لگانے کے لیے منہ کھولا، لیکن آواز نکلی نہیں، " بھائیو ۔۔۔! یہ حیدر بھائی نہیں ہو سکتے۔ گھوڑے کی چال میں وہ بات نظر نہیں آ رہی ہے ۔"

" پھر کون ہوگا ۔؟"

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر تینوں کی آنکھیں سڑک پر ٹک گئیں۔

" ارے یہ تو داروغہء شہر معلوم ہوتا ہے ۔۔۔"

" ہاں ۔۔ ہاں وہی ہے۔"

" اب کیا ہوگا ۔؟"

" اسی طرح بیٹھے رہو ۔۔!" سبحان میاں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور پھر اپنی چادر کو اپنے سر پر ڈال لیا۔ جیب سے تسبیح نکالی اور دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے" تم میرے سامنے ایسے رہو گویا میں تمہارا مرشد ہوں۔"

داروغہ کا گھوڑا رک گیا۔ اُس نے قبرستان میں آگ کو روشن دیکھا، اُسے وہاں وہ تین نفوس بھی نظر آئے۔ اُس کا گھوڑا قبرستان کی پھاٹک میں داخل ہوا اور پھر اُس کی گرج دار آواز سنائی دی، " کون ہے ۔۔؟"

لیکن اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ گھوڑے سے نیچے اُترا اور اُن کی طرف بڑھتے ہوئے پھر دھاڑا، " میں کیا پوچھ رہا ہوں ۔۔ کون ہو تم لوگ ۔ اور یہاں کیا کر رہے ہو ۔؟"

سبحان میاں نے زور سے نعرہ لگایا،'' دمادم مست قلندر۔۔ دمادم مست قلندر ۔۔صدقہ پنجتن پاک کا۔۔۔ یاعلی المدد۔۔۔۔د''

داروغہ قریب پہنچ گیا تھا۔ سبحان میاں کی آنکھیں بند تھیں، دینا ناتھ اور پنڈت دوزانوں بیٹھے ہوئے تھے۔ سبحان میاں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہنا شروع کیا،'' انسان کے وجود میں گلزار ہے۔ جلوۂ الٰہی ہے۔ دل کے اندر ہزار پنکھڑیوں کا کنول ہے۔ اُس پر تو بیٹھ جا۔ اور اُس کی جہتوں اور اُس کے پہلوؤں کا مشاہدہ کر۔۔ اور جمالِ الٰہی اور جمالِ وجود۔۔ سب کا لا متناہی جلوہ دیکھ۔۔ بابا تو کون ہے۔۔؟ کیوں اللہ والوں کی ٹوہ لیتا ہے۔ اُن کے پیچھے شک کا کوڑا لے کر گھوڑے پر سوار مارا مارا پھرتا ہے۔؟

باگوں نا جارے ، ناجا
تیری کایا میں گل چار
تو دیکھے روپ اپار

دینا ناتھ نے چور نگاہوں سے سبحان میاں کی طرف دیکھا، اُن کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں اور وہ جیسے دھیان میں بہت دور کہیں چلے گئے تھے۔ اُسے ہنسی آرہی تھی لیکن داروغہ کا خوف اُس پر مسلط تھا۔

'' آپ کون ہیں۔'' داروغہ کی آواز کا طنطنہ غائب ہو چکا تھا۔ سبحان میاں نے پھر کہنا شروع کیا۔۔۔

''خواہم نمازِ مستی ، پرور دگار بادا
دل سوئے یار بادا، جاں سوئے یار بادا
یک شب یا خدارا ۔۔ شاید قرار بادا
مجروحِ انتظارم ۔۔ قلمم فگار بادا

'' مجھے معاف کردیں بابا۔۔!'' داروغہ خوف زدہ ہو گیا،'' میری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ آپ۔۔آپ۔۔۔''

لیکن اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی سبحان میاں نے پھر ایک بار نہایت رعب دار آواز میں کہا۔۔۔۔

''سرگن کی سیوا کرو نرگن کو کر گیان
نرگن سرگن سے پرے نہیں، ہمارا دھیان

''آپ تو بہت پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بابا۔ کچھ میری بھی رہنمائی کیجیے بابا۔'' داروغہ نے ہاتھ جوڑے وہ اُن کے سامنے بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن سبحان میاں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا۔

''تن ماٹی کا ہے دیا، کاہے کرے ہے ابھیمان
جب تک اس میں جوت ہے، وقت غنیمت جان''

اور پھر سبحان میاں نے زور زور سے کہنا شروع کیا،'' حق، حق، حق۔۔۔''

داروغہ ٹپٹا گیا کہ کہیں بابا نے یہ اشارہ تو نہیں دیا کہ اُس کے جیون کی جوت اب بہت کم رہ گئی ہے۔ اُسے سردی میں بھی پسینہ آنے لگا۔ وہ فوراً وہاں سے پلٹا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

دینا ناتھ اور پنڈت اُسے دیکھ رہے تھے اور اُس کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

''کہو بابا پنڈت۔۔ نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی۔؟''

اور دونوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

''بابا آپ کیا کبھی واجد علی شاہ کی ناٹک منڈل میں کام کیا کرتے تھے۔'' پنڈت نے شوخی سے سوال کیا۔

''بھائی پنڈت، جیون سوئم ایک بڑا ناٹک مندر ہے اور سمئے اپنے انوسار منوشیہ کا پریوگ کرتا ہے اور منوشیہ، جیون کُنڈ کے بھنڈار سے پاپ اور پُنیہ کے بھنے سے پرے کیا کچھ نکال لاتا ہے، یہ تو وہ بھی نہیں جانتا ہے۔''

''سبحان بھائی اب بس بھی کیجیے، داروغہ جا چکا ہے۔ مہربانی کر کے پھر سے ہمارے وہی سبحان بھائی بن جائیے۔ اپنے چہرے سے اب یہ سنت کا مکھوٹا اُتار

پھینکیں۔''

سبحان میاں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

حیدر خان، چنبیلی اور تارا کے گھوڑے قبرستان کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔سبحان میاں نے خوشی سے نعرہ لگایا،''دمادم مست قلندر۔۔مست قلندر۔۔۔''

پھر تینوں اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔حیدر خان نے بھی جواباً حق حق حق کہنا شروع کیا اور تھرکتے ہوئے آگ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔چنبیلی اور تارا نے بھی اپنے دائیں بائیں تالیاں بجاتے ہوئے رقص کرنا شروع کیا۔وہ تینوں آگ کے قریب پہنچے اور پھر حلقہ بنا کرناچنے لگے۔آوازیں گونج رہی تھیں۔

دمادم مست قلندر

دمادم مست قلندر

دمادم مست قلندر

حق حق حق

حق حق حق

حق حق حق

اور پھر سب کے سب ہنسنے لگے،اور حلقہ بنا کر آگ کے سامنے بیٹھ گئے۔

''حیدر بھائی آج تو داروغہ ہم لوگوں کو گرفتار کر ہی لیتا۔''

''وہ ادھر آیا تھا۔؟''

''ہاں!''

''بس سبحان میاں کی حاضر دماغی نے ہمیں بچالیا۔''

حیدر خان نے سبحان میاں کی طرف تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا تو اُن کے منہ سے پھر نکلا،''دمادم مست قلندر۔۔ا''

اور حیدر خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی،''میں تمہارے لیے ایک خوش خبری لایا ہوں۔''

سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''پتہ چلا ہے کہ ملک کے کچھ حصّوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کی لہر شروع ہو گئی ہے۔''

''کیسے۔''

''اُنھوں نے فوجیوں کے لیے جو کارتوس منگوائے ہیں، اُس سے متعلق خبریں ہیں کہ اس میں سور اور گائے کی چربی کا استعمال ہوا ہے۔''

''اگر یہ بات سچ ہے تو اس کی مخالفت یقینی طور پر ہو گی۔''

''ہاں مجھے بھی یہی اُمید ہے۔ انتظار کریں۔ میرٹھ میں اُن کی بڑی چھاؤنی ہے۔ جس میں زیادہ تر ہندوستانی لوگ شامل ہیں۔''

''حیدر خان۔'' چنبیلی نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور آنکھ سے سامنے اشارہ کیا اور حیدر خان کی آنکھیں پھاٹک کی طرف اُٹھ گئیں، ''خاموش ہو جائیں کوئی شاید ہماری مخبری کر رہا ہے۔''

''ہاں۔۔ شاید داروغہ نے کسی کو بھجوایا ہے۔'' دینا ناتھ کی آواز لرز اُٹھی

سب کے ہاتھ اپنی اپنی تلواروں کی طرف اُٹھے۔

''اُس پر نظر رکھیں۔'' سبحان میاں نے آہستہ سے کہا، ''کیا وہ کسی کو اشارہ کر رہا ہے؟''

''نہیں۔۔ البتہ ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔''

''وہ تو ادھر ہی آ رہا ہے۔''

سب چوکنا ہو گئے۔

''حیدر بھائی۔۔!'' سوار نے آواز دی اور دن کر کے گھوڑے سے کود گیا۔

''ارے یہ تو طالب احمد ہے۔ اپنا دوست۔''

سب کے سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

سبحان میاں نے نعرہ لگایا، ''صدقہ پنجتن پاک کا۔۔ یا علی المدد۔۔۔د۔''

اور طالب احمد بھاگتا ہوا آیا اور حیدر خان کے گلے لگ گیا۔

سب کے چہروں پر مسرت پھوٹ رہی تھی۔

''اماں پانی ہو تو دو۔ پیاس کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔'' طالب احمد نے ادھر اُدھر دیکھا۔

تارا نے پانی کی چھاگل اُس کے ہاتھوں میں تھمادی اور وہ ایک ہی سانس میں غٹ غٹ غٹ پینے لگا۔

''اتنی ٹھنڈ میں بھی انھیں پیاس لگی ہے۔'' چنبیلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ طالب احمد نے اُس کی جانب دیکھا، ''مسلسل گھوڑے کو ایڑ لگا تا رہا۔ کہیں بھی رُکا نہیں میں۔''

پھر وہ سارے آگ کے اطراف بیٹھ گئے۔ اور حیدر خان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''حیدر بھائی جو کام ہم اور تم نہ کر سکے وہ کام ان ہی فرنگیوں نے کر دکھایا ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں میں۔''

دینا ناتھ نے حیرت سے طالب احمد کی طرف دیکھا، ''ہم تو سمجھے رہے تھے کے تم ان حرام زادوں کے خلاف کسی منصوبے کی بات کرو گے، لیکن تم تو اُلٹا اُن کی تعریف کیے جا رہے ہو۔''

''سبحان بھائی اپنا یہ یار بات تو پوری سنتا نہیں، بس تلوار اُٹھاتا ہے۔''

سب کے چہروں پر ہنسی دوڑ گئی۔

''میاں گائے اور سور کی چربی کے کارتوس تو ہم بنانے سے رہے؟'' طالب احمد نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا، ''ان فرنگیوں نے کچھ ایسے ہی کارتوس لائے ہیں۔ جس کی وجہ سے بارک پور کی چھاؤنی میں مخالفت کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ بھئی ہم بھی تو یہی چاہتے تھے کہ عوام میں اُن کے خلاف نفرت پیدا ہو۔۔۔!''

حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا اور اُس کے کانوں میں آوازیں گونجنے

گئیں۔

نجام الدین اولیا جگ اُجیارو

وہ تو جگ اُجیارو جگ اُجیارو

نجام الدین اولیا نجام الدین اولیا

نجام الدین اولیا نجام الدین اولیا۔

آسمان میں چاند مسکرا رہا تھا، اُس نے آہستہ سے کہا، ''آسمان میں اب بھی سب کچھ ہے۔ وہ لوہے کو لوہے سے کاٹے گا'' پھر وہ طالب احمد سے مخاطب ہوا، ''بھائی کھل کر بتاؤ۔''

طالب احمد نے آگ پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ پھر سب کی طرف دیکھا اور کہنا شروع کیا، ''سارے ملک میں یہ خبریں آگ کی طرح پھیل گئیں۔ ان کارتوسوں کو استعمال سے پہلے اُس کے فیتے کو دانت سے توڑنا ہوتا ہے۔ اب کہیے ہم مسلمانوں کے لیے سور حرام ہے اور ہندو بھائیوں کے لیے گائے مقدس۔''

''یہ تو ہمارے دھرم بھرشٹ کرنا چاہتے ہیں۔'' پنڈت جذباتی ہو گیا۔

''نہیں۔ یہ اپنی موت آپ مرنا چاہتے ہیں۔'' سبحان میاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''یہ واقعہ ۶ رفروری ۱۸۵۷ء کا ہے۔ پریڈ گراؤنڈ پر تمام فوجی پریڈ کے لیے تیار کھڑے تھے اور بہت سارے لوگ تاروں کی باڑ کے اُس طرف پریڈ کا نظارہ کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ جنرل ہیرسی پریڈ گراؤنڈ پر کھڑا تھا۔ اُس کی آواز بلند ہوئی۔ سارا منظر طالب احمد کی آنکھوں میں اُبھر آیا۔

''اٹینشن۔۔۔۔ پریڈ۔۔۔ لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ

لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ۔ ہالٹ

جنرل ہیرسی فوجیوں کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہو گیا، ''ویل بٹالین۔! ہم جنرل ہیرسی، حاکم فوج بارک پور پلٹن نمبر دو گرائنڈر کے سپاہیوں کو خوش خبری دیتا ہے

کہ کمپنی سرکار تمہارے واسطے ایک نیا کارتوس لایا ہے۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ یہ کارتوس تم جس پر بھی فائر کرے گا، وہ نہیں بچ سکے گا۔''

فوج میں ہلچل شروع ہوگئی اور بیج ناتھ نے اپنی جگہ سے اعلان کیا،

''سر۔۔! ہم تمہارا وہ کارتوس نہیں استعمال کرےگا۔''

''ویل بیج ناتھ۔۔! تم اس کارتوس کو کیوں نہیں استعمال کرےگا۔''

بیج ناتھ نے بلاخوف وخطر جواب دیا،''سر۔۔اُس کے فیتے میں گائے اور سور کا چربی لگا ہوا ہے۔اس سے ہمارا دھرم بھرشٹ ہوگا۔''

جنرل ہیرسی کا چہرا غصے سے تمتما اُٹھا اور وہ دھاڑا،''شٹ اپ۔۔! اس میں جو کچھ لگا ہے وہ حساب سے لگا ہے۔''

اب چاند خان کے جلال کی باری تھی،''سر۔۔! یہ بالکل حساب سے نہیں لگا ہے۔ہم میں سے کوئی بھی اس کا استعمال نہیں کرے گا۔''

جنرل ہیرسی نے اُس کی طرف غصے سے دیکھا،''تو پھر انجام جانتا ہے چاند خان''

اور چاند خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا،''مذہب ہمارے لیے اوّل ہے اور ہم سب اپنے مذہب پر جان دینا معمولی بات سمجھتا ہے۔آپ کتنے لوگوں کو مارےگا۔''

''اوہ یو۔۔۔''لیکن جنرل ہیرسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سارجنٹ بکسن اُس کے قریب پہنچا اور اُس کے کان میں آہستہ سے پھسپھسایا،''سر۔۔! انڈین لوگ بہت جذباتی ہوتا ہے۔تم اگر ان کو سزا دے گا تو یہ بات جنگل کے آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل جائے گا اور ہوسکتا ہے بغاوت ہو جائے۔''

''اوہ۔۔۔!'' جنرل ہیرسی کی آواز نکلی،'' تو ابھی کیا کرنا مانگتا بکسن !''

''سر پہلے ان کو کانفیڈنس میں لینا مانگتا ہے۔''

''یو آر رائٹ۔۔۔ یو آر پرفیکٹ رائٹ بکسن۔''پھر وہ بتالین سے مخاطب ہوا۔''ویل بٹالین! تم کیسے ثابت کرے گا کہ اس میں سور اور گائے کا چربی لگا ہے۔''

''اُس کا فیتہ ہی بتا تا ہے سر۔'' پیج ناتھ کی آواز اُبھری اور چاند خان نے اُس کی صراحت کی،'' سر آپ اُس کو جلا کر دیکھیں، چربی کے جلنے کی بو نہیں آیا تو ہم اپنے الفاظ واپس لے لے گا۔''

''ویل۔'' جنرل ہیرسی نے بیگ میں سے ایک کارتوس نکالا اور اُسے سپاہیوں کو دکھاتے ہوئے بولا،'' ہم ابھی اس فیتے کو منہ سے توڑ کر اور جلا کر تم کو بتاتا ہے۔''

''سر۔!'' بکسن نے پھر ٹوکا،'' یہ آپ کیا کرتا ہے۔ یہ جلے گا تو چربی کا بو بالکل آئے گا۔''

''اوہ۔۔ ہم کو بھی یہی بات لگتا ہے۔ پھر ابھی کیا کرے گا؟''

''ابھی ان کا کچھ نہیں کرے گا۔ آج ہم صرف پریڈ لے گا اور بات کو ختم کر دے گا۔''

جنرل ہیرسی نے گردن ہلائی اور پھر وہ سپاہیوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور آڈر دیا،'' پریڈ۔۔ اٹینشن۔۔ پریڈ کرے گا۔۔۔ لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ۔۔۔۔۔''

طالب احمد نے اپنی گردن اوپر اُٹھائی۔

''پھر۔'' سب کے منہ سے حیرت واستعجاب سے نکلا۔

''چنگاری سلگ چکی ہے۔ اس واقعے نے سپاہیوں کو بد دل کر دیا ہے اور وہ سب بارک پور سے بہرام پور چلے گئے۔''

''بہرام پور۔؟'' پنڈت نے حیرت سے پوچھا،'' طالب بھائی یہ بہرام پور کہاں پر واقع ہے؟''

''پنڈت جی! یہ مقام بھاگیرتی کے بائیں کنارے پر آباد ہے اور کلکتہ سے اس کا فاصلہ پورے ایک سو بیس کوس کا ہے۔''

''اب ہمیں بہرام پور سے آنے والی خبروں کا انتظار رہے گا۔''

''لیکن بہرام پور کی خبریں ہمیں کیسے ملیں گی۔''، چنبیلی نے سوال کیا۔

''میں نے بہرام پور کے لیے اپنے کچھ ساتھی روانہ کیے ہیں۔'' طالب احمد نے بتایا، ''جیسے ہی کوئی انہونا واقعہ ہوگا وہ ہم تک پہنچا دیں گے۔''

''طالب احمد یہ چنگاری سرد نہیں ہوگی، آگ بھڑ کے گی اور ضرور بھڑ کے گی۔'' حیدر خان نے اپنے الفاظ کی تائید اپنے ساتھیوں سے چاہی اور سب نے اُس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ اُس کے یقین کے ساتھ ہیں۔

''حیدر بھائی۔'' مجھے اگر بزدل نہ سمجھا جائے تو کچھ عرض کروں؟'' دینا ناتھ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ارے کون تمھیں بزدل سمجھے گا؟'' سبحان میاں نے اس کی پیٹھ پر محبت سے اپنا ہاتھ رکھا، ''یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔؟''

''آج داروغہ کی سواری یہاں تک آئی تھی۔''

''ہاں۔۔۔اور وہ دوبارہ بھی یہاں آ سکتا ہے۔''

''تو کیوں نہ اب یہاں سے چل دیں؟ اور میرا خیال ہے کل سے ہم اپنا ٹھکانہ بھی بدل دیں۔'' دینا ناتھ نے مشورہ دیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو دینا ناتھ۔'' سبحان میاں نے کہا، ''کل رات ہم یہاں کے بجائے مہرولی کے ویرانے میں جمع ہوں گے۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔'' طالب احمد نے تائید کی۔

''تو پھر اب اُٹھیں۔!''

اور پھر وہ سب اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف بڑھے۔ ٹھیک اُسی وقت اُلو کی آواز سنائی دی۔ حیدر خان نے پلٹ کر قبرستان کی طرف دیکھا۔ وہ سب سڑک پر آ گئے۔ اور پھر اُن کے گھوڑے تیز تیز دوڑنے لگے۔ ہوا کے جھکڑ شروع ہو گئے تھے اور چنگاریاں اِدھر اُدھر منتشر ہو رہی تھیں۔

ملک کے مختلف حصّوں میں ایک عام سی بے چینی پھیل رہی تھی۔ سڑکوں کے

نکڑ پر، چوپالوں میں، مجلسوں میں ایک ہی بات کا چرچہ تھا۔ کہیں خوف کی سرسراہٹ تھی۔ کہیں جوش اور ولولہ تھا۔ کہیں بغاوت کی پیشن گوئیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن قلعہ معلیٰ پر آج بھی وہی رات اُتری تھی۔ انھیں آہٹ بھی نہیں لگی تھی کہ قلعہ معلیٰ کے باہر کیا ہو رہا ہے۔

بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنی بیاض میں آخری شعر قلم بند کیا اور بیاض کو بند کر کے جونہی پلٹا ملکہء عالیہ زینت محل کو اپنا منتظر پایا۔ خوبصورتی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نو جوان حور شمائل ملکہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی، ''حضور خواب گاہ میں نینداور خواب آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔''

بہادر شاہ ظفر کے چہرے پر عجیب سی طمانیت تھی۔ اُس نے اپنی لاڈلی بیگم کو سینے سے لگا لیا، ''جانِ ظفر۔۔اب تو تم ہی ہمارا خواب ہو، تم ہی ہماری نینداور تم ہی ہماری منزل ہو۔۔!''

ملکہ کے چہرے پر شوخی دوڑ گئی، ''حضور۔۔! ہم خواب اور نیند تک تو مناسب ہیں، لیکن منزل۔۔منزل تو حضور مسافر کو تھکا بھی دیتی ہے۔''

''ہاں۔'' بوڑھے بادشاہ نے اچانک اپنے جسم میں عجیب سی تھکاوٹ کو محسوس کیا۔ اُس کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ اُس کے مقابل سنگھاردان موجود تھا اور اُس کے شیشے میں دونوں ہی نظر آ رہے تھے۔ بادشاہ نے جونہی آئینہ دیکھا، وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور اُس کا ذہن دور کہیں بھٹکنے لگا۔

''حضور بادشاہ سلامت کہاں کھو گئے۔؟ منزل کی طرف قدم نہیں بڑھائیں گے۔؟'' زینت محل کے لہجے میں اب بھی شوخی تھی، ''یا آج صرف نیند کے خمار میں خواب دیکھیں گے۔؟''

''بیگم جیسی بھی تمہاری مرضی ہوگی، ہم اُس پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے لیکن۔۔۔۔''

''لیکن حضور یہ تو بتائیں آج کونسی غزل کہی ہے۔؟''

ظفر کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اُٹھی، ''ملکۂ عالیہ اگر چہ اُستادِ ذوق فرما چکے ہیں کہ۔۔وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں۔لیکن ہم کیا کریں، ہم تو آج بھی آپ کے پہلو میں جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے ہیں۔''

''حضور پیری کے رہوار ہو نگے آپ کے اُستاد اور جوشِ قدح کا سہارا لیں گے مرزا نوشہ، آپ تو حضور آج بھی آپ ہی کے اُس مصرعے کی تفسیر ہیں۔کیا خوب کہا تھا آپ نے،

''جام ہے، شیشہ ہے، ساقی بھی ہے، برسات بھی۔''

ملکہ نے اپنا سر جھکا لیا، ''حضور یہ کنیز اسی برسات میں بھیگ جانے ارمان رکھتی ہے۔''

بہادر شاہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر ملکہ کو پوری قوت سے بھینچ لیا اور زینت محل نے سسکاری لی، ''حضور تازہ کلام سے اس بندی کو بھی نوازیے نا'' وہ اُسی طرح بادشاہ سے چمٹی ہوئی تھی۔

''جانِ آرزو۔۔ جو مصرعہ ہم سے اُس وقت مصرعہ ثانی تک نہ کہلوا سکا تھا آج ہم نے اُسے مکمل غزل کر دیا ہے۔۔عرض کرتے ہیں۔۔۔۔

جام ہے شیشہ ہے ساقی ہے برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے

ملکہ نے دل کھول کر داد دی۔

''اگلا شعر سنیں، اس کا ممدوح سمجھ لیں آپ ہی ہیں۔''

''جی عطا ہو۔''

بادشاہ نے اگلا شعر پڑھا۔۔۔

کچھ تو ہے اپنی طرف طلب، ساغر و مئے
اور ساقی کی کچھ امداد و مدارات بھی ہے

ملکہ نے شرما کر گردن جھکالی، اور بادشاہ نے خوش ہو کر شعر پڑھا

جوشِ مستی بھی ہے ہنگامہ ہم آغوشی بھی
خواہشِ وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے

زینت محل نے اپنا سر بادشاہ کے سینے میں چھپالیا اور اپنا ایک ہاتھ اُن کے گلے ڈال دیا۔ بادشاہ سلامت پر جیسے نشہ سا طاری ہونے لگا۔ اُسی سرشاری میں اُن کی زبان سے نکلا، بیگم یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔

وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشے میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف وعنایات بھی ہے

ملکہ کا جسم کانپنے لگا، ''اب بس بھی کیجیے حضور۔! آپ تو ہمارا ہر راز اُگلے جاتے ہیں۔''

''بیگم مقطعہ پر اس طرح ظلم نہ کریں وہ آپ کی توجہ طلب کر رہا ہے۔''

اور زینت محل نے لرزتی آواز میں آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اور بادشاہ کے دونوں ہاتھ اُن کی پشت کو سہلا رہے تھے۔ ''عرض ہے بیگم کہ،

یار ہے، یار کے ہے ساتھ ظفر بوس و کنار
اور اگر چاہیے کچھ بات، تو وہ بات بھی ہے

''اللہ۔۔!'' ملکہ کی آنکھیں بند ہو گئیں، ''حضور آپ بڑے وہ ہیں جائیے ہم آپ سے نہیں بولیں گے۔!'' وہ اٹھلانے لگیں، اور بادشاہ کو ہنسی آگئی۔

''چلیے بھی نا اب۔۔ رات آواز دے رہی ہے۔''

اور بوڑھے بادشاہ نے طاق میں سے مرتبان نکالا اور اُس میں موجود کشتے کو چاٹنے لگا۔

رات کافی گزر چکی تھی، لیکن کوچہ چیلاں میں کسی کے گھر شادی تھی۔ رتجگے کا اہتمام تھا مُغنّی کی لئے، گھنگھروؤں کی چھم چھم اور طبلے کی تھاپوں کا شور تھا۔

حیدر خان اپنی بیٹھک میں شمع کے آگے سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک بلی صحن میں کودی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں، صحن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے پلٹ کر دالان کی طرف دیکھا۔ تارا کا کمرہ بند تھا اور چنبیلی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اُس میں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ حیدر خان نے اپنے سامنے رکھی ہوئی شمع کو گل کیا اور اپنے کمرے کی طرف قدم اُٹھایا۔ جونہی وہ دروازے میں پہنچا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ چنبیلی بے ترتیب سو رہی تھی۔ اُس کی زلفیں کھلی ہوئی تھیں اور سینے سے دوپٹہ غائب تھا۔ روشنی میں اُس کا چہرہ اور بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا اور مسہری پر اُس کے پائینتی بیٹھ گیا اور اُسے نہارنے لگا۔ اُس کے بدن میں خون کی روانی تیز ہوگئی۔ اُسے ایک عجیب سا نشہ ہونے لگا۔ اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چنبیلی کی برہنہ پنڈلی پر رکھا اور وہ ایک دم چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ سامنے حیدر خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، ''آپ ہیں۔۔۔!'' اُس کی آواز اور آنکھیں خمار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''چنبیلی تمہارا یہ بے پناہ حسن واقعی قدرت کی صناعی کا شاہکار ہے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ چنبیلی نے اُس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں حیا کے ڈورے ڈول رہے تھے۔

''آج کی یہ رات پھر ایک بار میں تمہارے نام کرتا ہوں۔''

چنبیلی نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''جی چاہتا ہے چاند سے تمہاری نظر اُتار دوں۔''

چنبیلی کی باہنوں کی گرفت میں سختی آ گئی۔

حیدر خان نے اُس کے سینے سے اپنا سر بلند کیا اور اُس کی طرف دیکھا۔ چنبیلی کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اُس نے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اور اُسے پوری طرح اپنی باہنوں میں بھر لیا۔

دونوں کے لبوں سے محبت میں ڈوبی ہوئی ایک لمبی سانس نے انگڑائی لی۔

''چنبیلی آنکھیں کھولو۔۔!'' وہ گویا خواب میں کہہ رہا تھا۔ اور چنبیلی نے شرما کر اُس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اُس کے بدن میں عجیب سی تھرتھراہٹ ہونے لگی۔ اُس پر خود سپردگی کا عالم چھا گیا تھا۔

حیدر خان اُس کے ساتھ مسہری پر لیٹ گیا۔

چنبیلی نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔

شمع نے آنکھیں بند کر لیں اور دور کہیں گھنگھروؤں کی چھم چھم اور طبلے کی تھاپوں میں مُغنّی کی لئے تیز ہوگئی۔۔۔

سب سے چھپ کر دل لائے ہیں اب تو چاند دکھادو جی
تیرے پریتم گھر آئے ہیں اب تو چاند دکھادو جی
چھت پر سرد ہوا چلتی ہے، سناٹا ہے کوئی نہیں ہے
سر پر اوڑھ کے شب آئے ہیں اب تو چاند دکھادو جی
آنکھوں پر پھولوں نے لکھی ہے چٹھی، رات کی رانی کو
ہم بھی نین پیاسے لائے ہیں اب تو چاند دکھادو جی

رقاصہ کے گھنگھروؤں کی تھرتھراہٹ کی رفتار تیز ہوگئی تھی، طبلے کی تھاپیں بھی اُسی مناسبت سے پڑ رہی تھیں اور مُغنّی کا راگ کلاسیکی بندشوں میں اپنی مشاقی کا مظاہرہ کرر ہا تھا۔

(۶)

اختر علی کے گھر محفل جمی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے اُن کے بے تکلف دوست بیٹھے ہوئے تھے اور حقّے کی نئے گردش کر رہی تھی۔ ادبی بحث کب حالات حاضرہ کی طرف پلٹ گئی اُنھیں اندازہ ہی نہیں ہوا اور فتح علی کہہ رہے تھے ''شہر میں عجب طرح کی افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لیکن بھائی آج کمپنی بہادر ملک کے بہت بڑے حصّے پر حکمرانی کر رہی ہے۔ میں تو کہوں مت ماری گئی ہے افواہ بازوں کی۔ اُن سے بگاڑ لینا آسان نہیں ہوگا۔''

''خیر خیر حضور۔۔ بگاڑ وگاڑ کی جرأت اول تو کوئی کرے گا ہی نہیں، بس فوجیوں میں ایک عام سی بے چینی ہے۔'' ننھے میاں نے حقّے کی نئے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''آپ اسے عام سی بے چینی کہہ رہے ہیں؟'' اختر علی نے دھواں اُگلتے ہوئے نئے اُن کے ہاتھوں میں تھمادی۔ ''انگریز سرکار کس کے بل بوتے پر قائم ہوئی۔۔؟ جی۔ آپ یہ تو سوچیں؟'' انھوں نے سب کو سوچنے کے لیے ایک لمحہ دیا اور پھر گویا ہوئے ''انگریز اپنے ساتھ انگلستان سے فوج نہیں لایا تھا؟ ان ہی ہندوستانیوں کی مدد سے وہ مستحکم ہوا ہے، اور اُسے جناب اب بھی اپنے ان فوجیوں کے احتجاج پر غور کرنا پڑے گا۔''

''ارے حضور چھوڑیے ان فضول باتوں کو، ہمیں کیا لینا دینا ہے۔'' حکیم

احسن اللہ خان نے فرش پر تھاپ ماری، "بھئی ہماری دلّی ہر طرح سے محفوظ ہے۔ دُعائیں دیجیے اپنے بادشاہ سلامت کو جنھوں نے ان فرنگیوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔"

"مٹھی میں لے رکھا ہے؟ یا اُن کی مٹھی میں چلے گئے۔؟ شہنشاہیت تو ڈیڑھ سو برس پیشتر ہی خاندان عالی شان تیموریہ دودمان الوالعزم گورگانیہ کو ھذا فراق بینی وبینک کہہ کر رخصت ہو چکی ہے۔" اختر علی کی آواز قدرے اونچی ہوگئی تھی۔ انھوں نے اپنے دوستوں کی آنکھوں میں اپنی بات کی صداقت کو تلاش کیا، "اب برائے نام تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ آج ایک چھوٹی سے چھوٹی، ہندوستانی ریاست کے برابر بھی حضور کو خود مختاری حاصل نہیں ہے۔" اُنھوں نے حقے کی نئے کو منہ میں پکڑا، ایک گہرا کش کھینچا اور پھر دھویں کو ماحول کے حوالے کر دیا۔

"معافی چاہتا ہوں اختر بھائی۔" فتح علی نے راست مخاطبت کی، "آپ کی دلیل میں لاکھ صداقت ہو، لیکن اس سے احسان فراموشی کی بو آتی ہے۔"

سب نے چونک کر فتح علی کی طرف دیکھا۔

"بندہ آج بھی دربار سے وابستہ ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ آج بھی کوئی کمی نہیں آئی، آپ کو بتاؤں کہ کارخانے جات خاصہ کلاں، خاصہ خورد، آب دار خانہ، دواخانہ، توشے خانہ، جواہر خانہ، اسلحہ خانہ، اصطبل بگھی خانہ، توپ خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، پالکی خانہ، داروغہ کہاراں، داروغہ خاص، خواجہ سرایاں، فوج، مختلف پلٹنیں موجود ہیں اور سرکار عالیہ سے تنخواہ پاتے ہیں۔"

اختر علی مسکرانے لگے، "قبلہ آپ وہ فرما رہے ہیں جو میں نے کہا ہی نہیں تھا۔ اماں میں تو اقتدارِ تیموریہ کے خاتمے کا نوحہ گر ہوں، احسان فراموش نہیں۔ کاش شہنشاہ عالمگیر کے بعد بھی کچھ ایسے جری، دور اندیش اور صاحبِ نظر جانشین سلطنتِ مغلیہ کو نصیب ہو جاتے۔"

سب کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

بالا خانے میں سنگھار میز کے سامنے بیٹھی نیلوفر اپنی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ پھر اُس نے کاجل کی ڈبیہ نکالی اور کاجل کو آنکھوں میں پھیرنے کی خاطر جونہی آئینے میں خود کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ پتلی کمان دار بھویں، لمبی لمبی بادامی آنکھیں، سفیدی پر بھورے بھورے دیدے، ستواں ناک میں چاندی کی لونگ اور سرے پر جگمگاتی ہیرے کی کنی، خوبصورت بیضوی چہرہ، گلابی رنگت، یاقوتی پتلے لب اور گلے میں پڑا ہوا دھانی دوپٹہ۔ اُس نے آہستہ سے کہا، ''یااللہ کیا یہ ہم ہی ہیں۔؟'' اُسے اپنے ہی حسن کا نشہ سا ہونے لگا اور کانوں میں سلیم کی آوازیں رس گھولنے لگیں۔۔

جب بھی تمھیں دیکھتا ہوں نیلوفر
میرا دل غٹرغوں کرتا ہے مانند کبوتر

اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں، گویا خود سے بھی شرمانے لگیں۔ سلیم اب بھی اُس کے کانوں میں کہہ رہا تھا، ''نیلوفر تم پانی سے شفاف، گلاب سے بھینی بھینی۔۔تم چودھویں کا چاند۔ اور وہ کیا کہتے۔۔توبہ۔۔ آں۔۔جانے دو۔ تم۔۔تم میری امّی جان سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔''

وہ کھل اُٹھی، اور جیسے ہی آئینے میں دیکھا، سلیم مسکرا رہا تھا۔

''آپ ہمارے دل سے نکل کر آئینے میں کیسے چلے گئے۔''

''کیونکہ تم آئینے کے سامنے تھیں۔''

''سلیم آپ کتنے اچھے ہیں ہردم ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔''

''ہردم کہاں موقع ملتا ہے۔ چچا جان تو گھر سے نکلتے ہی نہیں۔''

''لیکن آپ پھر بھی تو آجاتے ہیں۔''

اور سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیے اور وہ ایک دم چونکی اور فوراً اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، ''سلیم ابا جان بیٹھک میں ہیں۔''

''پتہ ہے، اُنھیں اور اُن کے دوستوں کو سلام کر کے ہی یہاں آئے ہیں۔

‘‘اس کا لہجہ شوخ تھا۔

’’یہاں سے چلے جائیں آپ۔۔ابا جان کیا سوچیں گے۔؟‘‘ وہ گھبرا گئی۔

سلیم نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا،’’ نیلوفر آپ چاہتی ہیں کہ ہم یہاں سے جلد از جلد دفع ہو جائیں؟‘‘

اُس نے اقرار میں گردن ہلائی۔

’’تو بس آپ بھی جلدی سے ہماری بانہوں میں آ جائیں، ہم۔۔!‘‘ اُس نے معنیٰ خیز نظروں سے اُس کی جانب دیکھا۔

’’جی نہیں۔۔ جائیں آپ۔‘‘ اُس نے غصے سے کہا۔

’’ہم تو نہیں جائیں گے۔‘‘ وہ وہیں پر بیٹھ گیا۔’’ آپ سے جو بنے کر لیں۔آخر چچا جان ہمارے بھی تو ہیں۔‘‘

’’ارے جایئے نا، کیوں ہماری جان پر آئے ہیں آپ۔‘‘ وہ خوشامدانہ لہجے میں اِٹھلانے لگی۔

’’تم بھی تو۔۔ چند لمحوں ہی کی تو بات ہے۔‘‘

’’پھر آپ چلے جائیں گے نا؟‘‘ اُس نے ہاتھ جوڑے۔

سلیم نے اپنے سر کو جھکایا اور پھر آہستہ سے اقرار کا جھٹکا دیا،’’قطعی‘‘

اور وہ کسی گڑیا کی مانند اُس کے اختیارات میں چلی گئی۔

سلیم نے اُسے کس کر بانہوں میں جکڑ لیا،’’ ہر دم بس چچا جان کی بیٹی ہی بنی رہو گی۔؟‘‘

’’جی، چچی جان کے بیٹے۔‘‘

دونوں ہی ہنس پڑے اور سلیم نے اُس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔وہ ایک دم اُس کی بانہوں سے نکل گئی۔اُس کا چہرا غصے سے سرخ ہو گیا اور اُس نے نظریں جھکا دیں اور نہایت آہستہ لیکن ٹھہرے ہوئے لہجے کہا،’’ چلے جایئے یہاں سے۔۔ہم آپ سے بہت ناراض ہیں۔‘‘

سلیم نے شرمندہ شرمندہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا، لیکن وہ اُسی طرح خاموش کھڑی تھی۔ سلیم ایک لمحہ اُسی طرح رُکا رہا، اور پھر آہستہ آہستہ زینہ کی جانب قدم اٹھانے لگا۔

نیلوفر پھر ایک بار سنگھار میز کی جانب متوجہ ہوئی، اُس کے چہرے کا تناؤ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ اُس نے ایک بار پھر اپنا جائزہ لیا اور پھر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اُٹھی۔ اُس کے لبوں پر عجیب سی مٹھاس رس گھولنے لگی۔ اُس نے اپنے لبوں کو سختی سے بند کیا اور پھر خود ہی شرما گئی اور سنگھار میز کے سامنے سے ہٹ گئی۔

بادشاہ سلامت ثمن برج میں تشریف فرما تھے۔ یہ شاہان مغلیہ کی خاص نشست گاہ تھی۔ اُس کے نیچے چھت ہے اور چھتے میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور دیوان خاص سے ہوتا ہوا رستہ دریا کی طرف نکلتا ہے۔ دریا کے کنارے ایک پشتہ، چبوترے کی صورت بنا ہوا ہے جس کو پٹری کہتے ہیں۔ وہیں پر ایک بغیچہ بھی ہے جو پائین باغ کہلاتا ہے اکثر اس مقام پر بیٹھ کر مغل بادشاہ طلوع سورج اور غروب سورج کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ اسی برج میں بیٹھ کر شہنشاہ شاہ جہاں روشنیوں کا نظارہ بھی کیا کرتا تھا اور اسی برج کو بطور جھروکہ بھی استعمال کرتا تھا۔ تب سے آج تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔

نظارے سے لطف اندوز ہو کر حضرت ظلِ سبحانی سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ثانی سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ سواری منتظر تھی۔ بختِ رواں کا سنہری ہودا تھا اُس میں زربفت کی مسند اور گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ سواری پر مخملی پردے جھول رہے تھے۔ صحن میں خواجہ سرا اور خواصِ شاہی با ادب کھڑے تھے۔ حضور نے جلوہ فرمایا، حمید خان داروغہ دوڑا دوڑا آیا اور بعد سلامی عرض کیا کہ حضور کچھ فریادی حاضر ہیں۔ حضور نے اس کی طرف دیکھا اور زبانِ عالی سے ارشاد ہوا، کون ہیں؟

''قصابانِ شہر فریاد کی غرض سے آئے ہیں۔''

''اُنھیں یہیں پر حاضر کیا جائے۔'' بادشاہ سلامت نے حکم دیا۔

حمید خان شاہی سلام بجالایا، اور تیزی سے وہاں سے نکلا۔

کچھ ہی دیر میں قصابانِ شہر پہنچ گئے اور فریاد کی، '' حضور، سرکار انگریز نے ہمیں شہر کو خالی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ تمام دکانیں بند کروادیں۔ اب ہم اور ہمارے بچے، ہمارے مویشی شہر سے باہر جمنا کے کنارے دھوپ میں ریت پر بلک رہے ہیں۔''

حضور نے اُن پریشان حال افراد پر نگاہیں کیں اور حکم صادر ہوا، ''حمید خان، ہمارا خیمہ بھی جمنا کے کنارے ان فریادیوں کے برابر لگادیا جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی اور بادشاہ اُن کے برابر خیمہ زن ہوگیا۔ یہ خبر جونہی ریسیڈنسی میں پہنچی ہنگامہ ہوگیا اور ریسیڈنٹ بہادر خود بہ نفسِ نفیس حاضر ہوئے اور عرض کیا، ''حضور یہ کیا غضب فرمایا آپ نے۔ تمام رعایا شہر سے نکل کر دریا کے کنارے پہنچ رہی ہے۔''

حضور نے رسیڈنٹ بہادر کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے، ''جہاں میری رعیت ہوگی میں بھی وہیں رہوں گا۔ میری رعیت میرے بال بچے ہیں۔ میں ان کو کیونکر اپنے سے جدا سمجھوں۔ آپ نے آج قصابانِ شہر کو اخراج کا حکم دیا، کل کسی اور کو دیں گے۔ پرسوں پھر کسی کے لیے یہی حکم ہوگا۔ رفتہ رفتہ سارا شہر خالی ہوجائے گا۔ آپ رہیے گا شہر میں۔''

ریسیڈنٹ بہادر کا سر جھک گیا، ''حضور! ہرگز ہرگز ایسا خیال نہ فرمائیں۔ میں اپنا حکم اسی وقت منسوخ کرتا ہوں۔ آپ قلعہ معلّٰی تشریف لے جائیں۔''

بادشاہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اُٹھی اور قصابانِ شہر اور اُن کی حمایت میں آنے والے ہزار ہا افراد بادشاہ کی شان میں زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

دلّی کے شب و روز ملی جلی کیفیات میں گزر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی دلّی، دلّی

تھی۔ وہ دلّی یونہی تو ہندوستان کا دل نہیں تھی۔ دن کیا نکلتا تھا گویا عید کا چاند دیکھ کر ہی نکلتا تھا۔ چاندنی چوک کی سڑک فردوسِ بریں کا روپ دھارن کر لیتی۔ حُسنِ لازوال کی پریاں ماہتابوں کی صورت سیاہ نقابوں میں سے جھانکتی ہوئیں اس طرح اٹھلاتیں گویا آسمان سے کہکشاں زمین پر اتر آئی ہے۔ جسے دیکھو چندے ماہتاب و آفتاب۔ گویا دلّی کا چاندنی چوک نہیں کوہِ قاف کا کوئی بازار ہے اور پریاں اٹھلاتی پھر رہی ہیں۔ سروقد، پستہ قد، چھریرے بدن، آہو چشم، سر سے پاؤں تک سونے چاندی میں لدی ہوئیں، رنگ برنگے دوپٹے لہرا رہے ہیں، کامدانی کاموں سے مزیّن سرخ، نیلے، پیلے، سبز، بنفشی اطلسی گہرے دار لہنگے، زمین پر خوبصورت جوتیاں چیخ رہی ہیں۔ حنائی اُنگلیاں اشیائے ضروریہ کی طرف اشارے کر رہی ہیں اور اُنگلیوں کے پور پور میں ہیرے کی انگوٹھیاں اُن کے جاہ و حشمت کی داستانیں بیان کر رہی ہیں۔

اور اُدھر جمنا کے کنارے کچھ اور ہی منظر ہے۔ حسینائیں پانی میں کھیل رہی ہیں، گویا دریا میں کنول کھل رہے ہیں اور موجیں محبوب کی مانند اٹھلاتی بل کھاتی ناز و انداز دکھلا رہی ہیں۔ شفاف پانی میں غوطہ زنی ہو رہی ہے گویا آسمان سے سارے ہی ستارے دریا میں اُتر آئے ہیں۔ ان میں کچھ شوخ ہیں، کچھ الھڑ ہیں، کچھ بے پرواہ ہیں، کچھ شرمیلی ہیں، کئی سمٹائی ہیں، تقدس آنکھوں کو اُٹھنے نہ دے تو عقیدت بے نیاز کر رہی ہے۔

مہادیو جی کی سنگی مورت کے پائین پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ ایک پتھر پر صندل گھس رہے ہیں۔ مہادیو جی کی مورت درشن دے رہی ہے۔ عقیدت مند ہاتھ جوڑے سر کو جھکا رہے ہیں اور پنڈت جی صندل میں اُنگلیاں ڈبو رہے ہیں اور ماتھے پر خوشبو بکھیر رہے ہیں۔

اور جیسے ہی سورج آنکھیں موندتا ہے اور آسمان سے تاریکیوں کی چادریں برسنے لگتی ہیں تو جواباً طوائفوں کے کوٹھوں سے روشنی سر اُبھارنے لگتی ہے۔ رئیس زادے، بگڑے لاڈلے، کہاروں کی پشت پر لدے اُس طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ مجرا

،مشاعرہ، محفلیں سجتی ہیں اور رات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آنکھوں میں بسر ہو جاتی ہے۔

لیکن جب جب بھی چاند کی سترھویں تاریخ آتی ہے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں میلہ سا لگ جاتا ہے۔ عقیدت مند کشاں کشاں پہنچتے ہیں۔ خوانچے والے، گل فروش، ہمہ اقسام کے تاجر اپنی دکانیں لگاتے ہیں اور خوش الحان قوال دلوں پر ضرب لگاتے ہیں۔

دوسری طرف درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ میں سیر گل فرشاں کا رنگین میلہ لگتا ہے۔ آپ کی درگاہ اگرچہ شہر دلّی سے سات کوس کے فاصلے پر جنوب کی سمت موضع مہرولی میں واقع ہے۔ بیاباں گلزار ہو جاتا ہے۔ رحمتیں آسمان سے برسنے لگتی ہیں اور روپیہ پیسہ رئیسوں کے جیبوں سے نکل کر غریبوں کی جھولیوں میں کھنکنے لگتا ہے۔

کیا کہنے دلّی کے۔۔ اُس کے تو شب و روز ہی سب سے جدا ہیں۔

تین گھوڑ سوار مہرولی کی سرحدوں میں داخل ہوئے۔ مہرولی جو کبھی پرتھوی راج چوہان کی راجدھانی تھی۔ نشانیاں، ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کی صورت اب بھی اپنے شاندار ماضی کی تاریخی یادوں کو سمیٹے ہوئی تھیں۔ موسم بدل چکا تھا۔ گرما کی تپش اپنے انداز دکھانے لگی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی وہ مسجد دکھائی دی، جسے وقت نے ادھورہ چھوڑ دیا تھا۔ اُن کے گھوڑے جیسے ہی اُس کے قریب پہنچے، حیدر خان نے اپنا گھوڑا روک دیا۔ بقیہ سوار بھی ٹھہر گئے اور حیدر خان نے ایک طائرانہ نظر مسجد کی عمارت پر ڈالی اور کہنا شروع کیا،" یہ ادھوری مسجد جو نظر آرہی ہے اِسے بادشاہ قطب الدین ایبک نے بنانا شروع کیا تھا۔ ایک مینار تعمیر ہو گیا تھا۔ مسجد کے دالان کے آدھے دروازے بھی تیار ہو گئے تھے۔ سات منزلہ عمارت کا منصوبہ تھا۔ عمارت کے اوپری حصّے کو سنگِ سرخ سے تعمیر کیا جارہا تھا اور اُس پر نہایت خوشنما خطاطی میں قرآن پاک کی

آئتیں کندہ کروائی جا رہی تھیں کہ بادشاہ کو اجل کا بلاوا آ گیا اور مسجد ادھوری رہ گئی۔''

تارا اور چنبیلی آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی اس تاریخی مسجد کو دیکھنے لگیں۔ مسجد ناتمام کے شمال مشرق میں سنگِ سرخ کا ایک اور حجرہ دکھائی دیا۔ چنبیلی نے حیدر خان کی توجہ اُس طرف مبذول کروائی تو وہ بولا،'' اُس حجرے میں بادشاہ علاؤالدین خلجی کا مزار ہے۔''

تارا نے حجرے کی جانب دیکھا،'' حیدر بھائی آج ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ یہیں پر۔؟''

''نہیں۔'' حیدر خان نے اپنے سامنے دیکھا،''حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے روضے سے کچھ دور۔۔وہ جو پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں، وہیں کہیں اپنی بیٹھک کا اہتمام کرلیں گے۔''

اور پھر گھوڑے دوڑنے لگے۔

''وہ۔۔وہ مندر دیکھ رہے ہو دینا ناتھ۔؟'' پنڈت نے اشارہ کیا۔

''وہ۔۔۔وہی نا، جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے پتھروں کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر عمارت تیار کی گئی ہو۔''

''ہاں ہاں۔۔وہی۔۔!وہاں اتہاس ہم سے باتیں کرتا ہے۔'' پنڈت نے اپنے گھوڑے کی لگام کو اُس طرف موڑ دیا۔ دینا ناتھ اُس کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں اُس قدیم مندر کے پاس پہنچے۔ اپنے گھوڑوں سے نیچے اُترے اور عمارت کا جائزہ لینے لگے۔

''بھائی پنڈت کیا کہتا ہے اس مندر کا اتہاس ؟''

''بہت پرانی بات ہے۔'' پنڈت نے کہنا شروع کیا،'' اپنے بچپن میں میں اپنے دادا کے ساتھ پہلی بار یہاں آیا تھا اور اندر جاتے ہوئے ڈر رہا تھے کہ کہیں میرے داخل ہوتے ہی یہ عمارت مجھ پر نہ گرے۔ تب دادا نے مجھے بتایا تھا کہ بیٹا صدیوں

سے یہ عمارت اسی طرح کھڑی ہے۔اندر چلو یہ نہیں گرے گی۔''

''اورتم اندر داخل ہو گئے۔''

''ہاں۔''

''تمہارے دادا نے اس مندر کی کیا کہانی سنائی تھی۔؟''

پنڈت نے مندر میں لگے ایک پتھر پر ہاتھ رکھا اور کہنا شروع کیا،''دینا ناتھ یہاں کبھی پرتھوی راج چوہان کی حکومت تھی۔ایک دن اُس کے راج نجومیوں نے اُسے بتایا کہ اے سمراٹ تیرے محلوں کے نیچے راجہ باسک جو پاتال کا راجہ ہے،ٹھہرا ہوا ہے۔اگر تو نے اُس کے سر میں کیل ٹھونک دی تو وہ یہاں سے کہیں نہیں جا پائے گا اور جب تلک یہ دھرتی باقی رہے گی اُس پر تیری ہی اولاد کی حکومت رہے گی۔''

''پھر''دینا ناتھ کا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔

''راجہ نے لوہے کی دو میخیں تیار کروائیں۔نجومیوں اور برہمنوں نے اپنے گیان کے انوسار اُس جگہ کی نشاندہی کی جہاں راجہ باسک ٹھہرا ہوا تھا۔پھر میخوں کو درشائی ہوئی جگہ پر ٹھوکنے کا کام شروع ہوا،ٹھیک اُسی سمئے سمراٹ کے من کو شنکا نے آن گھیرا اور اُس نے آدیش دیا،اُن میخوں کو باہر نکالا جائے،نجومیوں اور برہمنوں نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی،لیکن راجہ کے ہٹ کے آگے سبھی بے بس ہو گئے۔؟''

''اور میخیں باہر نکالی گئیں۔؟''

''ہاں۔''

''پھر۔؟''

''راجہ نے دیکھا کہ اُن میخوں کا کچھ حصہ خون میں ڈوبا ہوا ہے۔اُس نے اُنھیں دوبارہ ٹھوکنے کا حکم دیا،تب نجومیوں نے کہا،''اے سمراٹ تم تو کیول دھرتی کے اوپر ایک چھوٹی سی جگہ کے راجا ہو اور راجہ باسک اکھنڈ پاتال کا راجہ ہے۔وہ کیا اب تک اُسی جگہ پر رُکا ہو گا۔؟ ارے وہ تو اب تک ہزاروں کوس دور نکل چکا ہو گا۔''

''اوہ۔۔۔! ''دینا ناتھ نے تعجب سے کہا۔

''بس اسی مقام سے مہرولی کی بستی شروع ہوتی ہے اور مسجدِ اولیا پر ختم ہوتی ہے۔''

''کاش سمراٹ پرتھوی راج ضد نہ کرتا۔'' دینا ناتھ کو پچھتاوا ہونے لگا، ''تو آج ان فرنگیوں کی صورت تو نظر نہ آتی۔''

پنڈت کے چہرے پر اُسی طرح سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''دینا ناتھ یہ سب نیتی کے کھیل ہیں۔ وہ آگاہ بھی کرتی ہے۔ بچاؤ کے سادھن بھی بتاتی ہے۔ یدی اُس کی اچھا ہوتو آدمی سپھل ہو جاتا ہے اور یدی اچھا نہ ہو تو کارن انسانوں کے سرتھوپ دیئے جاتے ہیں۔۔ چلو چلیں۔''

اُنھوں نے سامنے نظریں کیں، دور ایک مشعل روشنی بکھیر رہی تھی، ''شاید حیدر بھائی وہاں پہنچ گئے ہیں۔''

اور پھر گھوڑوں نے اپنا سفر شروع کیا۔

''حیدر خان۔'' چنبیلی نے اُسے آواز دی۔ وہ قریب کے درخت سے لگ کر کھڑا تھا۔ آواز پر پلٹا۔

''ان فرنگیوں سے تمھیں نفرت میری وجہ سے ہوئی ہو، مجھے نہیں محسوس ہوتا۔ کہیں کچھ تار اور بھی ہیں۔''

حیدر خان اُس کے قریب آ کر بیٹھ گیا، ''چنبیلی جان! میں کیا اور میری ان فرنگیوں سے نفرت کیا۔'' وہ خلاؤں میں گھورنے لگا، ''اُن کے خلاف سب سے پہلے اگر کسی نے سوچا تو وہ علمائے دین تھے۔ جن کی بصیرتوں نے بہت پہلے ہی اُن کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنی بساط بھر کوشش کر رہے تھے۔ وہ اپنے مدرسوں اور خانقاہوں میں حب الوطنی کے چراغ روشن کر رہے تھے۔ لیکن اُن کے پاس نہ فوج تھی نہ حکومت نہ اختیارات، لیکن اُن کا عمل، حق کی آواز، اُن کے جذبے انگریزوں کے خلاف اپنا کام کرنا شروع کر چکے تھے۔ وہ ساری باتیں، اُن کے مجاہدے، مجاہدانہ عمل،

اُن کی تقریریں، گھر گھر پہنچنے لگی تھیں۔ عام آدمی اُن کے ساتھ جڑنے لگا تھا، لیکن نواب، راجہ، جاگیردار اُن فرنگیوں کی گود میں بیٹھے کٹھ پتلیوں کی طرح اُن کے اشاروں پر ناچ رہے تھے اور میں بھی اوروں کی طرح انجان بنا رہا۔ کیونکہ میں خود جو اُن کی فوج میں شامل تھا اور اُنھیں عالی مرتبت سمجھتا تھا۔''

''لیکن میرے حادثے نے تمہاری کایا پلٹ دی۔'' چنبیلی نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں'' اُس نے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا، ''ایسا بھی نہیں ہے کہ اب میں یا میرے چند دوست ان فرنگیوں کے خلاف سوچ رہے ہیں۔ جانے کتنے ہی لوگوں نے اُن کے خلاف پیغامِ عمل کی دعوت دی، لیکن اُنھیں کوئی نہیں جانتا، آیا وہ جیلوں میں بند ہیں یا مار دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس جذبہ تو تھا لیکن طاقت و تائید نہ تھی۔ حوصلہ تو تھا لیکن ہتیار اور فوج نہ تھی۔ لوگوں تک پیغام پہنچانے کی صلاحیت تو تھی لیکن اُس پر عمل کروانے کا اسمِ اعظم وہ نہیں جانتے تھے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تاریخ میں اُن کا نام کبھی نہ آئے گا لیکن پھر بھی اُنھوں نے قربانیاں دیں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا اور اندھیرے میں کچھ تلاش کرنے لگا لیکن۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مشعل کے قریب پہنچ گیا۔ روشنی پوری طرح اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس نے پھر لب کھولے، ''اب تم لوگ بھی سوچیں، یہ ہم لوگ جو اپنی راتوں کی نیندیں خراب کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھی دور دور ہونے والے واقعات اکھٹا کر رہے ہیں اُن سب سے کیا ہوگا۔؟ وہ سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد بھی آخر ہم کیا کریں گے، کچھ نہیں۔۔ کچھ بھی تو نہیں!'' اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تارا اور چنبیلی اُس کی طرف خاموش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر اُن کے سر جھک گئے۔

ماحول کا سناٹا پھر ایک بار سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک اُسی عالم

میں بیٹھے رہے۔ حیدر خان آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ وہ بڑبڑانے لگا، ''سچ پوچھو تو میرے دل پر بھی ایک بوجھ ہے۔ میرے دادا سلطنتِ مغلیہ کے نمک خوار تھے۔ والد نے ان ہی فرنگیوں کی ملازمت کی اور خود میں بھی تو۔۔؟ کیا میرے اس عمل سے میرے بزرگ ناراض ہوں گے۔؟ کیا اُن کی روحیں مجھے نمک حرام کہیں گی؟ آخر وہ۔ وہ سب کیا سوچتے ہونگے۔ میرا جب بھی اُن سے سامنا ہوگا، تو کیا میں اُن سے آنکھیں ملا سکوں گا؟'' وہ جیسے ہی خاموش ہوا، تارا نے اُسے آواز دی، ''حیدر بھائی۔!'' اُس نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا، تو تارا نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنے مقابل بٹھاتی ہوئی بولی، ''حیدر بھائی آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ وقت کا تقاضہ ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ آپ کے پُرکھے آپ پر فخر کریں گے۔ آپ کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں جو آپ کو شرمندہ کر سکتا ہے۔'' اُس کا لہجہ بہت ہی سنجیدہ تھا اور آواز میں پورا اعتماد جھلک رہا تھا۔ وہ اُسی انداز میں کہے جا رہی تھی، ''ہم اپنا کوئی دن یونہی تو نہیں گزارتے؟ کیا ہم گھر گھر جا کر لوگوں کے ضمیر بیدار نہیں کر رہے ہیں؟ کیا ہم نے ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کی دعوت نہیں دی؟ اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے پاس کوئی چھومنتر نہیں ہے، پھر بھی ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ حیدر بھائی کوئی بھی انقلاب کبھی بھی پلک جھپکتے نہیں آتا، جب تک پوری طرح ماحول بیدار نہیں ہو جاتا، جب تک قطرہ قطرہ دریا نہیں بن جاتا روانی نہیں آتی۔'' اُس نے ایک لمبی سانس لی گی، ''ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہئیے۔''

حیدر خان کے مایوس چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، ''چنبیلی، تارا بہت سمجھدار ہوگئی ہے۔''

اور چنبیلی نے تارا کی پیٹھ ٹھوکی۔ تارا اب بھی حسرت بھری نظروں سے اپنے بھائی کو گھورے جا رہی تھی اور حیدر خان کے چہرے پر مشعل کی روشنی پھیل رہی تھی اور اعتماد کی ایک نئی دمک نمایاں ہو رہی تھی۔

دینا ناتھ اور پنڈت نے جونہی موڑ کاٹا تو بلندی پر مشعل کی روشنی اُن کے

سامنے تھی ۔ حیدر خان مشعل کے نیچے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا ، اور جواب میں دونوں کے بھی ہاتھ صرف لہرائے نہیں بلکہ گھوڑوں کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا۔

''دینا ناتھ اور پنڈت پہنچ رہے ہیں۔''

چنبیلی اور تارا بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے ۔ گھوڑے منزل کی آخری چڑھائی طئے کر رہے تھے۔

آسمان آج تاریک تھا۔صرف ستارے جھلملا رہے تھے۔

گرمی کی حدّت میں کچھ کچھ کمی ہو رہی تھی۔

گھوڑے ہانپتے ہوئے اپنے مقام پر پہنچ گئے ۔ دونوں سوار گھوڑوں سے اُترے اور پھر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُن لوگوں کے قریب پہنچ گئے۔

'' کہیے حیدر بھائی سب کُشل منگل ہے نا۔؟'' پنڈت نے ہاتھ جوڑے۔

''ابھی تک تو سب ٹھیک ہے پنڈت ،لیکن یہ بتاؤ کہاں رُک گئے تھے تم لوگ ،اتنی دیر کیسے ہو گئی۔؟''

'' حیدر بھائی دینا ناتھ کو پرتھوی راج چوہان کی کہانی سُنا رہا تھا'' پنڈت کا چہرہ کافی بشاش نظر آ رہا تھا۔

''یہ آج دن تمام لوگوں کو بھی کہانیاں ہی سُنا تا رہا ہے۔'' دینا ناتھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

'' کہانیاں ۔؟'' تارا نے حیرت سے کہا ، اور جیسے ہی اُس کی آنکھیں دینا ناتھ سے چار ہوئیں وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیونکہ آج تارا بھی مردانہ لباس ہی میں تھی اور بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔

تارا بہن آج ہم دونوں کشمیری دروازے کے آس پاس ہی بھٹک رہے تھے۔'' پنڈت نے بتایا۔

''بھٹک نہیں رہے تھے کہانیاں سنا رہے تھے۔''

''کیسی کہانیاں۔؟''

''ارے مجھے ایک ہی تو کہانی آتی ہے۔بس وہی جگہ بدل بدل کر سُنا رہا تھا۔''

''پنڈت جی وہ کہانی ہم بھی تو سنیں۔؟'' چنبیلی نے اصرار کیا۔

''پنڈت نے حیدر خان کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر بھی مسرت پھیلی ہوئی تھی۔''ہاں ہاں سناؤ پنڈت۔۔وقت بھی کٹے گا،ان لوگوں کا دل بھی بہلے گا اور ہم جن کا انتظار کر رہے ہیں وہ بھی آ جائیں گے۔''

پنڈت نے آسمان کی طرف دیکھا۔اُسے کشمیری دروازہ نظر آنے لگا۔لوگ ادھر اُدھر خریداری میں مصروف تھے۔اور دیناناتھ چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا،''بھائیو کہانی سنو۔۔مفت میں کہانی سنو۔۔کہانی سنو۔۔بھائیو کہانی سنو۔''لوگ اُن کے اطراف جمع ہونے لگے تھے اور پنڈت ایک اونچے سے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ماتھے پر بڑا سا ٹیکہ، گلے میں بڑی بڑی مالائیں،جسم پر صرف دھوتی تھی۔اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ دیناناتھ اُس کے سامنے جھکا اور نہایت ادب سے کہنے لگا،''مہاراج لوگوں کی بھیڑ جمع ہو چکی ہے اور سب آپ سے کہانی سننا چاہتے ہیں۔

پنڈت نے کہانی سنانا شروع کی،''بھائیو اور بہنو!جس طرح زمین خدا کی اور ملک بادشاہ کا ہوتا ہے،اُسی طرح جنگل بھی خدا کا اور حکومت شیر کی ہوتی ہے۔تو بس ایسا ہی ایک جنگل تھا۔شیر حکومت کرتا اور تمام جانور آرام کی زندگی گزارتے۔''

''ارے یہ تو ہمیں بچوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔''مجمع میں سے کوئی چیخا۔

''بھائیو!بے شک کہانی بچوں کی ہے لیکن اس میں سبق بڑوں کے لیے ہے۔''دیناناتھ نے بھی اُتنی ہی بلند آواز میں جواب دیا۔مجمع پر خاموشی چھا گئی،'' پنڈت جی آپ کہانی کو آگے بڑھائیں۔''

اور پنڈت نے کہنا شروع کیا،''تو بھائیو ایک روز یوں ہوا کہ بچوں کی بھوک مٹانے کی خاطر،شیر شکار کے لیے نکلا اور شیرنی نے بچوں کو بہلانے کی خاطر کہا،''چلو بچو!آج ہم جنگل میں منگل مناتے ہیں،وہیں تمہارے بابا تمہارے لیے بھوجن لائیں

گے۔ بچوں نے خوشی سے آوازیں نکالیں اور شیرنی کے پیچھے ہو لیے، لیکن شیر کا ایک چھوٹا بچہ پیچھے رہ گیا۔ شیرنی اور دوسرے بچے پلک جھپکتے میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ چھوٹا بچہ راستہ بھٹک گیا۔ اُس نے اپنی ماں کو آوازیں دیں لیکن اُس کی آوازیں ماں کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ وہ بڑا پریشان ہوا، اور ڈر کے مارے رونے لگا کہ ہائے اب میں کدھر جاوں؟ کیا کروں؟ مجھے تو بھوک بھی لگی ہے۔ تو بھائیوں اب تم ہی بتاو اُس بچہ کا کیا انجام ہوا ہوگا۔؟''

''مہاراج وہ تو آپ ہی جانتے ہیں۔ ہم بھلا کیا جانیں۔؟''

''بے شک بے شک۔!'' دینا ناتھ نے ہاں میں ہاں ملائی، ''مہاراج بڑے گیانی ہیں وہ تو تمہاری صورت دیکھ کر ہی بتا دیں کہ تمہارا بھوشیہ کیا ہوگا۔ بس کہانی کے بعد پوچھ لیں۔'' سب کے قدم جم گئے۔ پھر وہ مہاراج سے مخاطب ہوا: ''مہاراج لوگ بے چین ہیں آخر اُس شیر کے بچے کا کیا انجام ہوا۔؟''

پنڈت نے سب کی طرف دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا، ''وہ شیر کا بچہ ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ تب ہی اُسے دور بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا، وہ دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔''

''تب تو بکریاں ڈر گئی ہونگی مہاراج۔''

''کیا اُس شیر کے بچے نے بکریوں کا شکار کرنا شروع کر دیا۔؟''

''نہیں دوستو! وہ تو بہت ہی چھوٹا تھا۔ اُس نے دیکھا ایک بکری اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہے۔ وہ اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اُس چھوٹے سے شیر کے بچے کو دیکھ کر بکری کی مامتا جاگ اُٹھی اور اُس نے اُسے بھی اپنا دودھ پلایا اور اپنے بچوں میں شامل کر لیا۔

اب شیر کا وہ بچہ بکریوں ہی میں رہنے لگا۔ ریوڑ کے بچوں ہی کے سنگ کھیلنے لگا۔ بکری کے بچے چلاتے، میں میں میں۔۔۔ اور پھر اُس سے کہتے کہ وہ بھی آواز نکالے، اور وہ اُن کی طرح آواز نہیں نکال پاتا تو وہ اُس کا مذاق اُڑاتے کہ اسے تو میں میں کہنا بھی نہیں آتا، تو شیر کا وہ بچہ بکری ماں کی طرف دیکھتا تو وہ اُسے آنکھوں سے

ہمت دلاتی، ''ڈرو نہیں ۔۔تم بھی ایک دن سیکھ جاؤ گے۔'' اور شیر کا بچہ خوش ہو جاتا۔

وقت گزرتا گیا۔ بکری کے بچے بڑے ہونے لگے اُنھیں سینگ نکل آئے ۔ وہ ایک دوسرے سے سینگ لڑاتے ،سینگوں سے کھیلتے اور شیر کے بچے کا مذاق اُڑاتے کہ اتنا بڑا ہو گیا پر اسے ابھی تک ایک بھی سینگ نہ آیا۔ شیر کا بچہ اُداس ہو جاتا اور بکری ماں کی طرف دیکھتا تو بکری ماں اُسے دلاسہ دیتی کہ غم نہ کرو ایک دن تم بھی سینگ والے کہلاؤ گے۔

لیکن بھائیو، اُس بچے کو نہ تو میں میں کہنا ہی آیا اور نا ہی سینگ نکل آئے ۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ اُس نے اُن کے ساتھ کھیلنا کودنا بھی چھوڑ دیا ،بس بکری ماں کے پیچھے پیچھے ہی رہتا۔

ایک دن کی بات ، چارے کی تلاش میں بکری ماں اپنے ریوڑ سے سے دور چلی آئی ۔ شیر کا بچہ جو ،اب کافی بڑا ہو گیا تھا اُس کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے آنکھ بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ تب ہی کہیں سے وہاں ایک بھیڑیا آ گیا ،اُس نے دیکھا بکری اپنے ریوڑ سے دور ،اکیلی گھانس چر رہی ہے تو وہ اُس پر جھپٹا اور بکری ماں چلانے لگی ، بچاؤ ، بچاؤ بچاؤ ۔۔۔

جیسے ہی شیر کے بچہ نے اپنی ماں کو اس مصیبت میں دیکھا تو اُس کے اندر کا سویا ہوا شیر ایک دم جاگ گیا اور وہ زور سے دھاڑا اور بھیڑیے پر حملہ کر دیا۔ بھیڑیا ڈر کے مارے دم دبا کر بھاگ نکلا۔ بکری ماں پھولے نہ سمائی اور شیر ماں کے قدموں میں جھکا آشر باد لے رہا تھا۔

تو ساتھیو! اس کہانی کا مقصد سمجھو! بکری ہماری بھارت ماتا ہے، شیر کا بچہ تم خود ہو، تمہاری ماں پر یہ فرنگی بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں۔ کیا یہ تمہارا فرض نہیں ہے کہ اپنی ماں کو اِن بھیڑیوں سے بچائیں۔؟''

مجمع پر سکتہ طاری تھا۔ اُن کے ذہن بیدار ہونے لگے تھے اور وہ ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

'' واہ تم دونوں نے آج بہت بڑا کام کیا ہے۔'' چنبیلی نے پنڈت اور دینا ناتھ کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

'' حیدر بھائی اس کے بعد ہم جہاں بھی لوگوں کی بھیڑ دیکھتے اُنھیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے اور یہ کہانی پھر سے شروع ہو جاتی۔''

حیدر خان نے دونوں کی پیٹھ ٹھوکی۔

'' ارے آج سبحان بھائی دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔؟'' دینا ناتھ نے ادھر اُدھر نظریں گھمائیں۔

'' دینا ناتھ۔'' میں نے اُنھیں بہرام پور سے دلّی پہنچنے والی شاہراہ کی طرف بھیجا ہے۔ کیا پتہ ہمارا کوئی ساتھی آ جائے۔؟''

'' اور طالب احمد۔؟''

'' اُنھیں سبحان میاں اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔''

'' کافی دنوں سے کوئی نئی خبر بھی نہیں آئی۔'' پنڈت نے سب کی آنکھوں میں باری باری دیکھا۔

'' ہاں۔! پتہ نہیں کیوں، آج مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔'' حیدر خان نے پُر اعتماد لہجے میں کہا اور ٹھیک اُسی وقت اُنھوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنی۔ سب کے چہرے کھل اُٹھے اور سب کی نظریں نیچے ترائی میں اُتر گئیں اور اُنھوں نے دیکھا تین گھوڑ سوار ایک کے پیچھے ایک چلے آ رہے ہیں۔ وہ سب اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مشعل کے قریب آ گئے۔

کچھ ہی لمحوں میں سبحان میاں کا نعرہ سنائی دیا، '' دمادم مست قلندر۔'' اور پھر گھوڑوں سے اُتر کر وہ سب ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔ تارا اور چنبیلی کے چہروں پر بھی مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

سبحان میاں نے کہنا شروع کیا، '' ساتھیو! یہ ہمارا دوست بھانو پرتاب ہے۔ اسے شاید دینا ناتھ اور طالب احمد نہیں جانتے ہوں گے! بہرام پور سے چلا آ رہا ہے۔

''سبحان میاں ہم سب ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔''

''دمادم مست قلندر۔'' اُنھوں نے پھر نعرہ لگایا اور صوفیانہ رقص شروع کر دیا۔ ان کے پیچھے ہی سارے رقص کرنے لگے۔ بہت دیر تک حق حق حق کی آوازوں میں یہ اسی طرح جھومتے رہے۔ اور پھر سب کے لبوں سے قہقہے بلند ہوئے اور وہ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے۔

سب کی متجسس نگاہیں بھانو پرتاب پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''ساتھیو! اب کایا پلٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بہرام پور سے دلّی مرادآباد، کالپی، جھانسی، بدایوں، کانپور، بنارس، فتح پور، نوگانگ، گوالیار، لکھنو، آرہ، بٹور وغیرہ علاقوں تک چنگاریاں پھیل چکی ہیں۔ کسی بھی وقت آگ شعلوں میں تبدیل ہو جائے گی۔'' بھانو پرتاب اپنی اطلاعات کا ردِعمل اپنے ساتھیوں کے چہروں میں دیکھنا چاہتا تھا۔

''بھانو! بہرام پور میں کیا ہوا پہلے وہ سنائیں۔''

بھانو نے حیدر خان کی طرف دیکھا، ''حیدر بھائی یہ واقعہ ۲۴/ مارچ کا ہے۔ فوج تو پہلے ہی سے بددل ہو گئی تھی، کارتوس کی خبروں نے عام انسانوں کو بھی بھڑکا دیا تھا اور منگل پانڈے جان ہتھیلی پر لے کر سامنے آ گیا۔ اُس نے سپاہیوں کو للکارا۔ سارا منظر بھانو پرتاب کی آنکھوں میں اُبھر آیا۔

پریڈ گراؤنڈ پر فوجی اٹینشن کی پوزیشن میں کھڑے تھے۔ سارجنٹ ہلسن نئے کارتوسوں کے استعمال کا طریقہ سکھانے والا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا، اور منگل پانڈے فوجیوں سے مخاطب تھا، ''میرے دیش کے جوانو! مجھے دکھ ہوتا ہے تمہاری کائرتا پر، یہ فرنگی تمہارے دین ودھرم سے کھیل رہے ہیں اور تم خاموش ہو، تم کو معلوم ہے ان کارتوسوں کے خلاف زبان کھولنے کے جرم میں ہمارے بہت سے ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا ہے اور تم پھر بھی پریڈ میں حصہ لینے آئے ہو؟ ارے شرم سے ڈوب مرو! اُٹھو اُٹھو میرے بھائیو اُٹھو اور اس برٹش راج کے خلاف ڈٹ جاؤ۔''

فوج میں ہلچل شروع ہوگئی اور ٹھیک اُسی وقت سارجنٹ بکسن وہاں پر پہنچا۔ اُسے دیکھتے ہی فوجی سنبھل کر کھڑے ہو گئے اور بکسن اُن سے مخاطب ہوا، ''ویل بٹالین! ابھی ہم تم کو نیا کارتوس کیسا استعمال کرنا ہے وہ بتائے گا۔ پہلے اس کارتوس کا فیتہ اپنے منہ سے توڑو۔ پھر کارتوس کو گن میں لوڈ کرو۔۔ایسا۔۔اینڈ فائر۔۔!''

فائر کی آواز گونجی۔

اُس نے فخر سے سینہ پھلایا، ''ناؤ کم آن۔ ابھی تم لوگ فیتہ توڑو۔اور گن میں۔۔''

لیکن اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی منگل پانڈے دھاڑہ، ''سارجنٹ بکسن ہم تمہارے حکم پر عمل نہیں کرے گا۔'' پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا، ''بھائیو اٹھو اُٹھو۔ اُٹھو بھائیو! میں منگل پانڈے تمھیں اپنے دین اور دھرم کی قسم دیتا ہوں۔ اپنے مذہب کو بھرشٹ ہونے سے پہلے ان کو ختم کردو۔''

بکسن زور سے چلایا، ''اریسٹ ہم۔۔اسے گرفتار کرلو۔''

جواب میں فائر کی آواز گونجی اور بکسن چیخ مار کر زمین پر گر پڑا، ''اوہ گاڈ!

''لفٹنٹ بف تم آگے بڑھو۔۔اور اس ہندوستانی کو بھون کر رکھ دو۔''

لیکن لفٹنٹ بف کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی گولی نے اُسے بھی نشانہ بنادیا اور منگل پانڈے کسی شیر کی طرح دھاڑہ، ''ارے فرنگی تیری بندوق میں اتنا دم کہاں جو ہندوستانی شیر کی جانب دیکھے۔ وہ فائر پر فائر کیے جارہا تھا۔ لفٹنٹ بف کسی طرح اُٹھ بیٹھا اور منگل پانڈے کو شوٹ کرنے کا نشانہ ہی لے رہا تھا کہ ایک سپاہی اُس کی طرف دوڑتا ہوا آیا اور اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا اُس نے تلوار کے ایک ہی جھٹکے سے اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ بف کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پورے ماحول میں گونج اُٹھی، ''سپاہیو منگل پانڈے کو گرفتار کرلو۔'' اُس نے آخری حکم دیا لیکن جواب میں سارے ہندوستانی چلائے، ''ہم اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کرسکتے۔''

لیکن اتنی دیر میں جنرل ہیرسی نے منگل پانڈے کو چاروں طرف سے گھیر

لیا اور اُس کی آواز بلند ہوئی، ''منگل پانڈے! ابھی ہم تم کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ تم ابھی نہیں بچ سکتا۔'' اور پھر اُس کا وحشی قہقہہ گونجا: ''ہم تم کو زندہ گرفتار کرے گا اور ایسی سزا دے گا کہ ہر ہندوستانی یاد رکھے گا۔''

منگل پانڈے نے دیکھا وہ واقعی چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ اُس کی جانب انگریز سپاہیوں کی بندوقیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر طنز اُبھر آیا اور وہ پھر گرجا: ''ارے فرنگی تو کیا مجھے گرفتار کرے گا، میں خود اپنے آپ کو آزاد کرتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر اُس نے خود ہی اپنے آپ کو گولی مار لی۔ وہ زخمی ہو کر نیچے گرا اور سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اُسے گرفتار کر لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پریڈ گراؤنڈ خالی ہو گیا۔

بھانو پرتاب اب بھی خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

سب پر سکتہ سا طاری تھا۔

سبھی کے چہرے اُداس تھے۔

بس جھینگروں کی جھائیں جھائیں سنائی دے رہی تھی۔

اچانک ابابیلوں کا غول رات کی تاریکی میں شور مچاتا ہوا سامنے کے درخت کے اطراف منڈلانے لگا۔

''آفرین ہے تم پر منگل پانڈے۔'' حیدر خان کی زبان سے آہستہ سے نکلا: ''واقعی آفرین!''

سب نے اپنے اداس چہروں کو اوپر اُٹھایا۔

''بھائی! پھر منگل پانڈے کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟'' سبحان میاں کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔

''اُسے گرفتار کرنے کے بعد دواخانہ پہنچا دیا گیا۔ سنا ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

''یہ فرنگی اُسے زندہ نہیں چھوڑیں۔''

''لیکن دوستو!'' بھانو پرتاب نے پھر کہنا شروع کیا: ''منگل پانڈے کی

جسارت کی داستان پورے بھارت میں پھیل گئی ہے۔ بھلے وہ شہید کر دیا جائے گا، لیکن اُس کی یہ قربانی انگریزوں سے انتقام ضرور لے گی۔''

''دمادم مست قلندر۔'' سبحان میاں نے نعرہ لگایا اور پھر وہ پوری شدّت سے چیخنے لگے، حق حق حق حق حق۔۔۔۔۔۔۔۔

پورے ماحول پر ایک ہیبت سی طاری تھی۔

صبح کاذب کا وقت قریب آرہا تھا۔

حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ کیا، ایک کے پیچھے ایک گھوڑا دوڑنے لگا۔

اور گھوڑوں کے ٹاپوں سے زمین دہلنے لگی۔

☆☆☆

(۷)

حکمت یار خان کی ڈیوڑھی پر نوبت جھڑ رہی تھی ۔ ڈیوڑھی کا صدر دروازہ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اندر صحن کو خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ بیچ میں بازی کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی ۔ دونوں طرف شاندار فرش کیا گیا تھا ۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے تھے۔ حقے جما دیے گئے تھے ۔ نصیبن گلوریاں تیار کر رہی تھیں ۔ دیگر نوکر چاکر ادھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے ۔ چلمن کے اُس طرف خواتین کا انتظام تھا ۔ مہمان فرحاں و شاداں چلے آرہے تھے ۔ عطر ولوبان کی خوشبوؤں کے ساتھ ہی ساتھ باورچی خانے سے لذیز پکوانوں کی سوندھی سوندھی خوشبو الگ مہک رہی تھی ۔ مہمان آتے جاتے ، اور اُن کے منصب و مراتب کے لحاظ سے خدمت گار اُنھیں بٹھانے میں مصروف تھے۔ ہر چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

صدر دروازے کے باہر حکمت یار خان بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور اُن کے پیچھے اُن کے حاشیہ بردار جگت رام اور مرزا شبّن کھڑے تھے۔ حکمت یار خان نے نظریں اُٹھائیں اور دروازے پر بنے نوبت خانے کی طرف دیکھا اور سازندے سروں میں آ گئے۔

''خان صاحب ماشاءاللہ! آج تو آپ بالکل نوشہ نظر آرہے ہیں۔'' جگت رام نے حکمت یار خان کو نیچے سے اوپر تک دیکھا،''اماں یہ اچکن خوب ہے اور سر پر آپ نے جو دوپلی پہن رکھی ہے اُس سے تو جلال شاہی ٹپک رہا ہے۔''

خان صاحب نے محبت بھری نظروں سے جگت رام کی طرف دیکھا۔۔

''اماں بازیاں تو ہم نے ہزاروں دیکھی ہیں۔'' مرزا شبّن بھی چہکے،'' لیکن خدا جھوٹ نہ بلوائے، جو اہتمام خانصاحب فرماتے ہیں، واللہ اُس کا تو جواب کیا دلّی اور کیا لکھنؤ، کہیں ثانی نہ ملے گا۔''

''بے شک بے شک۔!'' جگت رام نے تائید میں گردن ہلائی۔

''مہمان تو سارے آچکے ہیں، پکوان مہک رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔۔بس اب بازی کی دیر ہے۔''

''قطع کلامی معاف۔۔! لیکن حضور خان صاحب بازی کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔''

حکمت یار خان صاحب نے مرزا شبّن کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا، ''تو گویا ہم نے یہ اہتمام فضول ہی کیا ہے۔؟''

''حضور بندے کا اشارہ قطعی آپ کی جانب نہ تھا۔'' مرزا شبّن شرمندگی سے بولے،'' خادم تو حضور میاں جہانگیر کے مقابل کی بات کہہ رہا تھا۔''

''مرزا صاحب۔'' جگت رام نے اُن کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے،'' حضرت میاں جہانگیر کی فتوحات کی ایک تاریخ ہے۔ کیا دلّی، کیا لکھنؤ، بلند شہر ہو یا علی گڑھ۔ جی۔۔ اور تو اور پانی پت کا علاقہ تک اُن کے نام سے گھبراتا ہے۔ اجی مرزا

صاحب ہمارے خان صاحب کے میاں جہانگیر سے چونچ لڑانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔شیر کا جگر چاہیے شیر کا۔''

''جی بالکل درست فرمایا حضور آپ نے۔میں نے خود اُن کی بازی۔۔۔وہ کیا مقام ہے۔۔توبہ توبہ اب تو ذہن میں بھی نہیں آ رہا ہے۔میاں جہانگیر نے ایسی جنگ لڑی تھی کہ مقابل نے دہشت سے اپنی جان ہی چھوڑ دی تھی۔''

حکمت یار خان انجان بنے دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔خوشی کے مارے اُن کے دل میں لڈّو پھوٹ رہے تھے۔اور یہ دونوں خواہ مخواہ خان صاحب کو حاشیہ چڑھا رہے تھے۔اچانک مرزا شبّن کو دور کی کوڑی سوجھی اور اُنھوں نے جگت رام سے قافیہ ملایا،''اجی حضرت شاید آپ کو پتہ نہیں ہے۔''

جگت رام نے اُن کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''وہ جو حضرت ہیں نا، کیا نام ہے بھئی اُن کا۔۔جو۔۔۔ہاں یاد آ گیا، حکیم احسن اللہ خان، ارے وہی۔۔قلعہء معلیٰ کے درباری، میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔۔۔جی۔''

مرزا شبّن نے جگت رام کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

''بھلا وہ کیوں مرزا۔؟''

''اب میاں اُنھیں کہیں سے سُن گُن لگ گئی تھی کہ ہمارے یار، حکمت یار خان صاحب کے پاس شاہِ زماں میاں جہانگیر موجود ہیں۔''

''تو۔۔۔؟''

''تو بس عرضی گزار ہو گئے کہ بھائی شبّن مرزا کوئی ترکیب نکالیں کسی طرح تو

جال بچھائیں اور شاہانِ دود مان چنگیزی اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کی ملازمت میں میاں جہانگیر کو لے آئیں۔''

حکمت یار خان اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے، مرزا شبّن نے کہنا شروع کر دیا، ''حضور میں نے اُنھیں آگاہ کیا کہ ہمارے یار، حکمت یار خان صاحب خاندانی رئیس زادے ہیں۔ ملازمت پر جوتی مارتے ہیں اور ایسی عنایات پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

حکمت یار خان کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔

خان صاحب۔! آپ خواہ یقین نہ فرمائیں لیکن اندیشہ تو یہی کہتا ہے کہ مقابل نے نام سنتے ہی گردن ڈال دی ہوگی۔ وہ مقابلے پر نہیں آئیں گے۔''

''اماں اب یہ تو نہ کہو۔'' جگت رام نے آسمان کی طرف دیکھا، ''جاگیردار اچھن میاں اور اُن کا مرغ بھی اس قدر بے نام نہیں ہیں۔''

حکمت یار خان پشت پھیر کر کھڑے ہو گئے، اور جگت رام نے مرزا شبّن کو آنکھ ماری، ''اُن کا مرغ بھی شہرِ دلّی میں رستمِ زماں کے نام سے جانا جاتا ہے۔''

''اجی حضرت آپ کیا جانیں، خود ہی اپنے مرغ کو رستمِ زماں کا خطاب دے رکھا ہے۔ اب صرف خطاب سے کیا کوئی رستمِ زماں ہو جائے گا۔؟ جی۔۔۔! ''

مرزا شبّن نے آنکھیں نکالیں، ''ذرا مقابلہ تو ہو جائے۔؟ جی۔۔ وہ آپ کے رستمِ زماں بے پر کے نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دیں۔''

''سبحان اللہ! یہ بے پر ہو جانے والی بات خوب کہی ہے۔ گویا بے پر نہیں بے آبرو ہو جائیں گے۔! واہ واہ بھئی واہ'' جگت رام نے تحسین آمیز نظروں سے مرزا

شبّن کو دیکھا اور مرزا شبّن نے اُنھیں آنکھوں سے اشارہ کیا۔ حکمت یار خان اب بھی ٹکٹکی باندھے سڑک کو گھور رہے تھے۔

''اماں خان صاحب۔'' جگت رام نے اُنھیں مخاطب کیا،'' کافی وقت بیت چکا ہے۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ جاگیردار اچھن میاں اب اپنے رستم زماں کے ساتھ نہیں آئیں گے۔ آپ جشنِ فتح کا اعلان فرمادیں۔''

''اور اگر وہ آ جائیں تو۔۔؟'' حکمت یار خان نے اُن کی طرف دیکھا۔

''تو کیا ہوگا حضور۔؟ اعلان پہلے ہو یا بعد میں، فتح تو فاتح ہی کی ہوگی نا۔؟''

ٹھیک اُسی وقت مرغ کی بانگ سُنائی دی۔

اور دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا،'' کہیں اچھن میاں واقعی وارد تو نہیں ہو گئے۔؟''

''بھئی عجیب حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں آپ لوگ ؟ اب کیا آپ ہمارے میاں جہانگیر کی گرج بھی بھول گئے؟'' حکمت یار خان گرجے۔

''اخاہ! تو گویا اُنھوں نے خود ہی اپنی فتح کا اعلان کردیا۔''

''بھئی خان صاحب، اب دعوتِ شیراز میں تاخیر بے معنیٰ ہوگی۔''

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ دبایا، اور دل ہی دل میں کہا، اگر جاگیردار اچھن میاں تک بازی کا یہ پیغام پہنچتا تو وہ تشریف بھی لاتے اور بازی بھی لگتی، یہ تو محض دعوتِ شیراز کے لیے ان دونوں کی ایک چال تھی۔

خان صاحب کی ڈیوڑھی میں جشنِ فتح دھوم دھام سے منایا جارہا تھا۔

ملک کے مختلف حصّوں میں ایک تناؤ کی سی کیفیت پھیل رہی تھی۔ منگل پانڈے کی بہادری کے چرچے تھے۔ بہرام پور میں اگرچہ خوف ودہشت کا ماحول تھا، لیکن پھر بھی کانا پوسی جاری تھی۔ فوجی اسپتال میں منگل پانڈے کا علاج ہورہا تھا، ساتھ ہی اس واقعے کی تحقیقات بھی جاری تھی۔ انگریزوں نے فوج کے حوالدار شیخ پیٹالے کو یہ کام سونپا تھا اور شیخ نے پوری محنت کے ساتھ رپورٹ پیش کردی۔ جسے پڑھتے ہی انگریز افسران آگ بگولہ ہوگئے تھے کیونکہ رپورٹ ثابت کرتی تھی کہ منگل پانڈے نے جو کچھ بھی کیا وہ اُس کا شخصی جذبہ تھا۔ اُس کا کوئی شریک نہیں تھا بلکہ فوجیوں کو اس بات کی بھی اطلاع نہیں تھی کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس لحاظ سے شک کی بنیادوں پر جن ہندوستانیوں کو انگریزوں نے گرفتار کیا تھا اُنھیں رہائی مل جانا چاہیے تھی اور یہ بات اُنھیں منظور نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے اُس رپورٹ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔

اس دوران منگل پانڈے کو اسپتال سے جیل میں منتقل کردیا گیا تھا۔ اُسے سخت پہرے میں رکھا گیا تھا۔ اُس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ انگریز چاہتے تھے جس قدر ممکن ہو اس واقعے کو ختم کردیا جائے اور باغیوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ پھر کوئی یہ جرأت نہ کرسکے۔ وہ گھنٹوں بحث ومباحثے کرتے۔ اُنھیں یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی تنہا آدمی اس طرح انگریزوں کے خلاف ڈٹ سکتا ہے۔ وہ اسے اجتماعی فکر کا نتیجہ قرار دے رہے تھے۔

آخر منگل پانڈے کو فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ سر سے پیر تک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر کسی قسم کا

ملال یا خوف نام کو بھی نہیں تھا۔ اُس کے اطراف مسلح فوجی تعنیات تھے۔

فوجی مجسٹریٹ کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر اُس نے نہایت حقارت بھرے لہجے میں فردِ جرم سنانا شروع کیا؛ ''منگل پانڈے! تم نے فوج کا ڈسپلین توڑا، اپنے آفیسرز کا حکم نہیں مانا، اُن پر فائر کیا، اُن کو جان سے مارا اور بغاوت کی کوشش کی۔ کیا تم اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو۔؟''

منگل پانڈے نے مجسٹریٹ کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا؛ ''اگر میں ان الزامات سے انکار کردوں تو کیا تم یقین کرلو گے؟''

مجسٹریٹ نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا کیونکہ اُس کی آواز میں اب بھی وہی بےخوفی تھی۔

''نہیں کروگے نا۔؟ تو پھر یہ سوال ہی کیوں پوچھتے ہو۔۔؟''

''منگل پانڈے!'' مجسٹریٹ نے اپنا انداز بدلا؛ ''تم بہادر ہو، اپنے دھرم کا سچا ہو، بٹ۔۔۔ اتنا پاورفل برٹش سامراج کے خلاف آواز اُٹھانے کا ہمت تم کیسے کیا۔۔؟ تم اکیلا نہیں کرسکتا، تم کو برابر ورغلایا گیا ہے۔ ہم کو اُن کا نام بتاؤ۔ ہم تم پر رحم کرنے کا بھی سوچ سکتا ہے۔''

منگل پانڈے نے چھت کی طرف دیکھا، ایک لمحہ سوچا، اور پھر مجسٹریٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا شروع کیا؛ ''میں ایک برہمن ہوں اور دھرم کی رکشا کرنا یہ میرا پہلا کرتویہ ہے، کسی کو مجھے یہ بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ویل برٹش گورنمنٹ سمجھتا ہے کہ تم اب بھی یہ بات کسی دباؤ میں آکر کہہ رہا ہے۔'' مجسٹریٹ نے بظاہر ہمدردی کا لہجہ اختیار کیا؛ ''تم ڈرو مت، صاف صاف بتاؤ

،ہم اب بھی تم کو بچا سکتا ہے۔ اگر تم اُن غداروں کے نام ہم کو بتا دو۔''

''میں اپنے بچاؤ کی خاطر کسی بے گناہ کا نام نہیں لے سکتا۔''

مجسٹریٹ نے اُس کی جانب غصے سے دیکھا اور پھر فوراً سنبھل کر کہا، ''تم کو اُن لوگ سے گھبرانا نہیں مانگتا۔ برٹش گورنمنٹ تم کو پورا پروٹکشن دے گا اور اگر تم نہیں بتایا تو تم کو سخت سزا ہو سکتا ہے، تم کو پھانسی پر بھی لٹکایا جا سکتا ہے۔ ابھی تم خود اپنا سوچ لو۔''

منگل پانڈے کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ وہ قدرے ترش لہجے میں گویا ہوا، ''ارے فرنگی! تو کیا سمجھتا ہے؟ میں تیری سزا سے ڈر کر اور اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے ہی لوگوں کے نام بتا دوں گا؟ میں اپنے دھرم کا سچا ہوں۔ ہندوستانی ہوں۔ تیرے کو میری زبان پر کسی کا بھی نام نہیں ملے گا۔''

''پھر تم اپنا انجام جانتا ہے۔؟'' مجسٹریٹ نے غصے سے پیپر ویٹ کو گھمایا۔

''تو مجھے موت سے بڑھ کر اور کیا سزا دے گا۔؟ میں اپنے انجام سے پہلے دن ہی سے واقف تھا اور اس وقت تیرے فیصلے کی بزدلی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

مجسٹریٹ نے فیصلہ لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا اور اُس کی زبان سے آہستہ سے نکلا، ''ویل۔۔۔ ابھی تم کو زیادہ انتظار کرنے کا ضرورت نہیں۔''

اُس نے فیصلہ لکھا اور قلم کی نب توڑ دیا۔

منگل پانڈے کے چہرے پر اب بھی مردانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

آٹھ اپریل ۱۸۵۷ء کو منگل پانڈے کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ وہ شہید ہو گیا۔

انگریزوں کی شان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اُس کے پھانسی کے تختے سے ایک ایسا جوالا مکھی اُٹھنے والا ہے جو ہزار ہا انگریزوں کو موت کی نیند سُلا دے گا۔

حیدر خان اپنی ڈیوڑھی کے بالائی حصے پر کھڑا تھا۔ اُس نے سامنے نظریں دوڑائیں، شہر میں اب بھی وہی چہل پہل تھی۔ دور سورج غروب ہو رہا تھا، اور آسمان پر لالی چھاتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سورج پوری طرح غروب ہو گیا اور آسمان کی لالی گہری ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا، اُس کے بزرگ کہتے تھے کہ جب بھی آسمان پر غیر معمولی سرخی چھاتی ہے، تباہی آتی ہے یا پھر کسی بڑی جنگ کے بگل بجتے ہیں۔ خدا جانے آسمان کیا کروٹ لینے والا ہے۔

فضاء میں موزن کی اذان گونجی اور وہ زینے سے نیچے اُترا اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔

تارا اور دینا ناتھ کے گھوڑے میرٹھ جانیوالی شاہراہ پر دوڑ رہے تھے۔ راستہ سنسان نہیں تھا۔ بیل بنڈیاں سامانوں سے لدی قطار در قطار جا رہی تھیں یا مخالف سمت سے آ رہی تھیں۔ اکا دُکا گھوڑ سوار بھی ہر دو جانب دوڑ رہے تھے۔ تارا مردانہ لباس میں تھی۔ اُس کے سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی اور ماتھے پر بڑا سا تلک کا لال نشان چمک رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گُم گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ دینا ناتھ مسلسل اُسے دیکھے جا رہا تھا اور تارا جان کر بھی انجان بنی ہوئی تھی۔

راستہ طئے ہو رہا تھا۔

گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔

کافی دیر کے بعد آخر دینا ناتھ نے اُس سے پوچھ ہی لیا،'' تارا تم نے کبھی نہیں بتایا کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔؟''

تارا نے ترچھی نظروں سے اُس کی جانب دیکھا اور نہایت مختصر سا جواب دیا،'' کیا کرو گے جان کر۔''

اور پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

راستے کے دونوں جانب کھیتیاں تھیں جن میں کسان مصروف تھے۔ جانور چر رہے تھے۔ بکریوں کے ریوڑ کے پیچھے اُن کے رکھوالے بانسری پر کوئی پہاڑی دھن بجا رہے تھے۔ تارا نے نگاہیں اوپر کیں۔ سورج سر پر آ رہا تھا اور اُسے شدّت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے اچانک اپنے گھوڑے کی باگ ایک کھیت کی طرف موڑ دی۔

'' تارا اُدھر کدھر۔۔؟'' پیچھے سے دینا ناتھ کی آواز اُبھری، اور وہ بھی اُس کے برابر آ گیا،'' یہ میرٹھ کا راستہ نہیں ہے۔''

تارا نے اُس کی طرف دیکھا،'' مجھے پیاس لگی ہے۔''

دینا ناتھ نے اپنی چھاگل کی طرف اشارہ کیا، تو اُسے جواب ملا،'' حیدر بھائی ہمیشہ کہتے ہیں کہ سواری اپنے گھوڑے کی، کھانا اپنے توشے کا اور پانی اپنی مرضی کا پیو گی تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

دینا ناتھ نے اُس کی طرف لاچاری سے دیکھا۔

دونوں کنوئیں پر پہنچے۔ گھوڑوں سے اُترے۔ تارا نے خود ہی کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ پانی پیا، منہ پر ایک دو چھپکے مارے اور پھر پانی کا ڈول دینا ناتھ کی طرف بڑھا دیا۔

ڈول کو کنوئیں میں ڈالتے ہوئے اُس کی زبان سے نکلا، ''گونگے کا گُڑ کھٹا نہ میٹھا۔''

تارا کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

دینا ناتھ نے پانی پیا۔ اُس نے بھی اپنے منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور پھر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔

دونوں کے گھوڑے پھر اُسی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔

دونوں کے درمیان وہی خاموشی تھی۔

بس رستہ اُن کے گھوڑوں کے قدموں تلے بھاگ رہا تھا۔

بہت دیر تک دونوں کے درمیان اُسی طرح سناٹا رہا۔ بس جب جب بھی راستے سے دینا ناتھ کی نگاہیں اُٹھتی تھیں وہ تارا کو ضرور دیکھ لیتا تھا۔ تارا کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے پھر ایک بار ہمت کی اور اُس کے برابر ہوتا ہوا بولا، ''تارا کچھ تو باتیں کرو، سفر آسان ہو جائیگا۔''

تارا نے اُس کی طرف پھر اُن ہی نظروں سے دیکھا، ''دینا ناتھ! باتیں رفتار میں رُکاوٹ ڈالتی ہیں۔''

''یہ بھی حیدر بھائی ہی کا حکم ہے۔؟'' دینا ناتھ نے شوخی سے کہا۔

''حیدر بھائی میرے مالک ومختار ہیں۔ پھر بھی وہ مجھے حکم نہیں صلاح دیتے

ہیں۔''

دینا ناتھ خاموش ہو گیا، اُس نے تارا کی طرف دیکھا، اُس کی گوری رنگت دھوپ سے اور بھی سرخ ہو رہی تھی اور اُس کی کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔

''تم نے اگر یہ طئے کر لیا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاوگی تو میں اپنے بارے میں کچھ۔۔۔''

تارا نے اُسے پھر تیز نظروں سے دیکھا۔ دینا ناتھ کی آنکھیں جھک گئیں اور اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا،''ہے درگا جی اس طرح بات بات پر غصّے سے آنکھیں دکھاوگی تو یہ بھگت تو بھسم ہی ہو جائیگا۔''

''بھگت۔؟''اُس کے چہرے پر طنز اُبھر آیا،''تبھی تو میں کہوں اتنی دیر سے ٹوپی میں کبوتر کیوں پھڑ پھڑا رہا تھا۔''

''تارا مجھے غلط نہ سمجھو۔''وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا،''جب سے تمہیں دیکھا ہے میرے من مندر کے استھان پر تم ہی براج مان رہی ہو، میری بھگتی کو اس طرح نہ ٹھکراو دیوی جی۔''

''تم غلط جگہ پر متھا ٹیک رہے ہو دینا ناتھ۔''

''وہ بھگتی ہی کیا جو پتھر کو موم نہ کر دے۔''

''تم کو میں۔۔میں۔۔۔دینا ناتھ یہ ٹیڑھے توے کی روٹی ہے۔'' تارا جھلا گئی،''یہ سب اب نہ ہوگا دینا ناتھ، دیکھو میرے من میں تمہارے لیے بڑا مان سمان ہے مگر۔۔!''

''مگر کیا۔۔؟''

''میں نے اپنے دل کے سارے ہی دروازے بند کر دیے ہیں۔ اب اُن پر دستک دینے کی کوشش نہ کرو۔ تم نہیں جانتے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں بچا ہے جو میں تم کو دے پاؤں۔'' اُس کی آنکھیں بھر آئیں، ''وہ حیدر بھائی ہی ہیں۔ جنھوں نے اُس برتن کو سمیٹا جسے کتے اشودھ کر چکے تھے۔ اُنھوں نے مجھے زندہ رہنے کی شکتی دی اور میرے لیے کسی چھتنار پیڑ کی مانند خود چھاؤں بن گئے ہیں۔''

''بے شک حیدر بھائی ایک مہان انسان ہے۔''

''وہ انسان نہیں ہیں دینا ناتھ۔'' تارا نے اُس کی بات کاٹی، ''میرے نزدیک تو وہ بھگوان سے بھی بڑھ کر ہیں۔'' اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی، ''اُن دنوں مجھ پر ہمیشہ ڈر چھایا رہتا، پتہ بھی کھڑکتا تو میں کانپ جاتی۔ مجھے نہ رات کو نیند آتی تھی نا دن میں چین ملتا تھا۔ اُس وقت حیدر بھائی میری ڈھارس بندھاتے، میرا دل بہلاتے، میں اُن کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جاتی تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے، لیکن دینا ناتھ اُن کے ہاتھ کبھی میرے سر سے نیچے نہیں اُترے۔'' اُس نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا، ''اب تم ہی کہو وہ میرے لیے بھگوان نہیں تو پھر کیا ہیں۔؟'' جذبات اُس کی آنکھوں میں آنسوں بن کر چھلک اُٹھے۔

گھوڑوں کی رفتار مدھم ہوگئی تھی۔

دینا ناتھ محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

دونوں کے دل کی دھڑکنیں گھوڑوں کے ٹاپوں کے ساتھ دھڑک رہی تھیں۔

'' تارا مجھ پر بھروسہ رکھو میں تمہاری مانگ عزت کے سیندور سے بھر دوں گا۔''

تارا نے اُس کی طرف دیکھا۔اُس کی آنکھوں میں آنسوں جھلملا رہے تھے
اور چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

اور ایک نئے کہانی جنم لے رہی تھی۔

اختر علی اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔اُن کے سامنے حقہ رکھا ہوا تھا۔
انھوں نے حقے کی نے کو منہ میں پکڑا اور زور سے گڑگڑایا اور پھر دھواں اُگلتے ہوئے
سلیم کو آواز دی،''میاں صاحب زادے کیا ہوا۔؟''

سلیم نے پھر ایک بار اپنی نظریں کتابوں پر ڈالیں اور وہیں سے جواب دیا،''
چچا جان ابھی تک نہ ملا۔''

''کیا مشکل ہے!تمھیں ابھی تک دیوانِ حافظ بھی نظر نہیں آیا؟ارے میاں
الماری کے اوپری خانے میں دیکھو،اُس کی جلد لال رنگ کی ہے۔''

ٹھیک اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''سلیم میاں۔''اختر علی نے اُسے پھر آواز دی۔

''مل گیا۔''سلیم دیوان حافظ لے کر تیزی سے بیٹھک میں پہنچا،اور جیسے ہی
اُس نے اُسے اختر علی کے ہاتھوں میں تھمایا،اُنھوں نے پھر حکم دیا،''اماں دیکھو!کوئی
آیا ہے!دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔''

سلیم دروازے کی طرف لپکا تو اُنھوں نے بیٹی کو آواز دی،''نیلوفر!بیٹی ذرا
ادھر تو آنا۔''

نیلوفر دالان میں بیٹھی کشیدہ کاری کر رہی تھی۔باپ کی آواز پر دوڑی دوڑی
آئی،''جی ابا جان۔''

اختر علی نے اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھا،''ماشااللہ تم!تم بیٹی اتنی بڑی ہو گئی

ہو۔؟''

''آپ بھی ابا جان!'' وہ شرما گئی۔

اور اختر علی نے قہقہہ لگایا۔

نیلوفر بیٹھک میں سے فضول اشیاء کو سمیٹنے لگی۔

''چچا جان آپ کے دوست آئے ہیں۔'' سلیم بھی وہاں پہنچ گیا۔ اختر علی نے اُسے بھی سر سے پیر تک دیکھا'' ہاں ہاں تو بھئی اُنھیں اندر لے آؤ۔ جاؤ۔''

سلیم پھر ایک بار دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ پھر اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئے،''بیٹی نیلوفر! ہم نے تمھیں کیوں آواز دی تھی۔؟''

نیلوفر نے چیزوں کو اُٹھاتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا'' وہ تو آپ ہی کو پتہ ہوگا ابا جان۔''

''ہاں بھئی!'' اختر علی نے ایک لمبی سانس کی، پھر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی،''ہم سوچ رہے ہیں کہ اب تمھیں تمھاری چچی جان کے حوالے کر دیں۔''

نیلوفر باپ کا اشارہ تو سمجھ گئی تھی، لیکن پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولی،'' آپ کہیں جا رہے ہیں ابا جان۔''

''آں۔'' اُنھوں نے شریر نظروں سے اُس کی طرف دیکھا،'' چلو تمھیں بعد میں بتا دیں گے۔ فی الحال تو ہمارے دوست آ گئے ہیں۔''

نیلوفر شرماتی ہوئی دالان کی طرف بڑھی۔ اُس کے دل میں لڈّو پھوٹ رہے تھے۔ اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ سیدھا بالا خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور کب سنگھار میز تک پہنچ گئی اُسے احساس ہی نہیں ہوا۔ اُس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں میں عجیب سی رس بھری مٹھاس کا احساس ہوا کوئی اُس کے بدن میں چٹکیاں لینے لگا۔ کانوں میں شہنائیاں سی گونجنے لگیں۔ اُس

نے اپنے دوپٹے کو سر سے نیچے تک کھینچ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

بیٹھک میں محفل جم چکی تھی۔ اخبار تپائی پر پڑا ہوا تھا، اور حقّے کی نئے فتح علی نے اختر علی کی طرف بڑھائی، ''آپ کیا سمجھتے ہیں، بہرام پور میں جو کچھ ہوا، وہ دیگر علاقوں میں بھی ہوگا؟'' اُن کی آنکھیں حیرت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''بھائی فتح علی کیا ہوگا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔'' اختر علی کے منہ سے دھواں اُبلنے لگا، ''لیکن میرا قیاس کہتا ہے کہ یہ چنگاری اب نہیں بجھنے والی، شعلہ ضرور بنے گی، تم دیکھنا۔''

ننھے میاں نے حقّے کی نے کی طرف ہاتھ بڑھایا، ''بھئی دیگر علاقوں کا چھوڑیے، ہمیں تو اپنی دلّی کی فکر ہے۔ کیا اس کا اثر یہاں بھی ہوگا؟''

''اجی حضرت آپ بھی عجیب انسان ہیں! دلّی کوئی انگریزوں کی چھاؤنی تو ہے نہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے فوجیوں کا کیا دھرا ہے۔''

اختر علی کو احسن اللہ خان کی سوچ پر ہنسی آ گئی، ''بھائی حکیم احسن اللہ خان آپ بھول رہے ہیں، دلّی ہندوستان کا پائے تخت ہے اور پائے تخت کی حیثیت دل کی ہوتی ہے۔''

''تو کیا سرکارِ انگلشیہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔؟''

اختر علی نے تیز نظروں سے ننھے میاں کی طرف دیکھا، ''بھائی سکّہ اُچھالا جائے تو یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کس رُخ پر اپنی صورت دکھائے گا۔''

''اور وہ جو ایران سے خبریں آ رہی ہیں۔؟'' حکیم احسان اللہ خان نے شوشہ چھوڑا، ''میرے نزدیک اُن کی حقیقت افواہوں سے زیادہ نہیں ہے۔''

حکیم احسان اللہ خان کے تیور بدل گئے، ''آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں گویا آپ نے ۱۹؍مارچ کا صادق الاخبار پڑھا ہی نہیں۔'' اُنھوں نے گھور کر اختر علی کی طرف دیکھا، ''حضور! اُس میں واضح طور پر شاہِ ایران کا بیان چھپا ہے کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ ہندوستان کی طرف کوچ کریں گے اور ان فرنگیوں کو آسمان

دکھا دیں گے۔"

اختر علی کو پھر ہنسی آ گئی، "حکیم احسن اللہ خان صاحب! یہ سب دل بہلاوے ہیں۔ بھئی آپ تو قلعہ معلّی کے درباری ہیں ذرا غور بھی تو کر لیں، اگر شاہِ ایران یہاں آ جائیں تو پھر آپ کے ظلِ الٰہی کہاں جائیں گے؟ بھائی گونگے کی مٹھائی آپ اور کتنے دن کھائیں گے۔؟"

حکیم احسان اللہ خان بغلیں جھانکنے لگے۔

اور اختر علی کے منہ سے دھواں اُبلنے لگا۔

سلیم دبے پاؤں بالا خانے پر پہنچا۔ نیلوفر اب بھی اُسی طرح گھونگھٹ کاڑھے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی، اُس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ اُسے اپنی بانہوں میں بھر لے لیکن اُس کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بس چپ چاپ اُسے نہارنے لگا۔

وقت تھم گیا۔

بہت دیر تک سلیم اُسی طرح کھڑا رہا۔ آخر اُس نے ہمت کر کے آہستہ سے کھنکارو، اور نیلوفر نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

سلیم کی ہمت بندھی اور اُس نے وہیں سے پوچھا، "نیلوفر کیا آپ ہم سے ابھی تک ناراض ہیں۔؟"

"ہم آپ سے ناراض ہیں؟"

"ہاں۔۔اُس دن۔۔۔؟"

نیلوفر نے آنکھیں جھکا دیں، "وہ بے وقت کی راگنی تھی۔"

"اور اب۔۔؟" وہ اُس کے قریب آ گیا۔

"اب آپ دو پیسے کمانے کا انتظام کریں۔"

سلیم کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے

کندھوں پر رکھ دیے، ''شاعری سے کام نہ چلے گا۔؟''

نیلوفر کھڑی ہوگئی۔

سلیم کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔

وہ پلٹ کر کھڑی ہوگئی اور پھر اُس نے آہستہ سے پوچھا،'' چچی جان کیا کر رہی تھیں۔''

''نیلوفر اسے بھی کہتے ہیں بے وقت کی راگنی۔''

وہ اُس کی طرف پلٹی لیکن اُس سے نظریں ملاتے ہوئے اُسے شرم آ رہی تھی۔اُس کی آنکھیں پھر جھک گئیں،'' آج ابا جان کہہ رہے تھے۔۔''اُس کی زبان سے آگے کوئی لفظ نہیں نکلا ،اور وہ پیر کے انگوٹھے سے فرش کو کُریدنے لگی۔

سلیم نے ہمت کر کے اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا،نیلوفر ایک لمحے کے لیے کسمسائی اور پھر اُس نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

تارا اور دینا ناتھ کے گھوڑے میرٹھ میں داخل ہوئے۔شہر میں ایک عجیب سی فضا، چھائی ہوئی تھی ۔ڈر اور وحشت کا ماحول تھا۔ گو دُکانیں کھلی ہوئیں تھیں لیکن گاہکوں کی تعداد بہت کم تھی۔ایکاڈ کا فرنگی افراد اور خواتین بھی دکھائی دیں۔وہ دونوں کے گھوڑے صدر بازار سے ہوتے ہوئے سیدھے چودھری کدم سنگھ کی دیوڑھی پر رُک گئے۔یہاں بھی وہی ماحول تھا۔صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔دونوں نے جھانک کر دیکھا، سامنے ہی چودھری چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔دونوں کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ بیٹھے۔ دونوں نے ہاتھ جوڑے اور چودھری کی پاٹ دار آواز اُبھری،''کون۔۔ دینا ناتھ!''

''پائے لاگو کاکا۔'' اور پھر وہ دونوں آگے بڑھے اور چودھری کے پاؤں چھونے لگے۔چودھری نے تارا کو نظر بھر کر دیکھا،'' بٹیا! مردانہ لباس پہن رکھنے سے کوئی مردوانہ ہوجاوے گا۔''

تارا نے فوراً پگڑی اُتار دی اور اُس کی زلفیں شانوں پر جھولنے لگیں۔

"جاؤ منہ ہاتھ دھوئی لو۔" اُنھوں نے حمام کی طرف اشارہ کیا،" پھر باتیں پُچھوں میں!"

وہ دونوں حمام کی طرف بڑھے اور چودھری نے چودھرائین کو آواز دی۔ "سُنیو۔۔کھانا پروس دےویں۔۔دینا ناتھ بھوسنگ آیا ہے۔"

تارا اور دینا ناتھ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ دینا ناتھ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور تارا کا چہرہ ایک دم اُتر گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں چودھری کدم سنگھ کے سامنے آکر بیٹھے ہی تھے کہ چودھرائین زنانی کپڑے لے کر وہاں پہنچ گئی اور پھر اُسے تارا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی،" اے چھوکریا۔۔تجھے شرم نہ آوے عورت جات ہو کر مرد کے کپڑے پہن رکھی ہے؟"

تارا نے گھبرا کر چودھرائین کی طرف دیکھا اور کپڑے لینے کے لیے جونہی اپنا ہاتھ بڑھایا، چودھری کی آواز اُبھری،" اوئے چودھرائین۔ایہ کپڑا تم اپنے پاس ہی رکھو!" پھر اُس نے دونوں کی طرف دیکھا،" اے فوجی بچے ہوویں،اُن نے کچھ نہ بولو۔"

چودھرائین نے انھیں حیرت سے دیکھا،" فوجی کا ایسے ہوویں ہیں؟ نہ جسم پر ماس نہ کھوراک برابر! اے چھوکریا تو مرغی برابر بھی نہ کھاوے۔"

"اے بڑے سورما ہوئے ہیں! تم کا جانو ،اے لوگ ان فرنگیوں کو دیش سے اُکھاڑ پھینکیں گے۔"

"اے ہے۔" چودھرائین نے ہاتھ نچائے،" باپ نہ مارے تیتر یا اولاد نکلے تیرانداز۔"

"اوئے تو چپ کرنا؟" چودھری اپنی جگہ سے اُٹھا اور بیوی کو دالان کی طرف دھکیلنے لگا۔

تارا نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا۔

اور جیسے ہی چودھری ان کی طرف پلٹا، دینا ناتھ نے سوال کیا،'' کا کا جی میرٹھ کا کیا حال ہے۔۔

''اوئے پتر! منے بیٹھنے تو دے یار۔'' چودھری نے اُس کی بات کاٹی۔'' آں ۔۔اب پوچھ۔!''

''وہی۔۔ میرٹھ۔!''

''میرٹھ تو دہک رہیا ہے۔گلی گلی فرنگیوں کے خلاف نفرت پھیلے ہے۔اب تم کو کا بتاویں، کچھ دن پہلے ہی کی بات رہی۔۔آں۔۔۔ہاں وہ دن ۲۳ /اپریل کا رہا تھا۔کمپنی بہادر میرٹھ چھاؤنی اپنا ایک افسر بھیجی کہ نئے کارتوس استعمال کرے کا طریقہ سکھاویں۔اوحرام خور! کرنل اسمتھ آڈر کیا پہلے گھوڑ سوار۔! گھوڑ سوار سپاہی میدان میں آئے۔افسر طریقہ بتاہی دیا۔نوے سپاہی ما صرف پانچ سپاہی فائر کیا، باقی لوگ خاموش رہا۔پوچھے جانے پر وہ جواب دیا، ہم کل سیکھے گا۔''

''وہی گندے کارتوس نہ کا کا جی۔۔جن پر۔۔۔!''

''وہی وہی۔''

''اور پھر دوسرے دن۔۔؟'' دینا ناتھ نے حیرت سے دیکھا۔

''اوئے پتر! دوسرا دن آوے سے پہلے ہی میرٹھ کا جوان اپنا کام بتائی دیا۔ اُس افسر کا تمبورات کو جلائی دیا۔''

''پھر۔۔؟'' دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''اوحرام خور اسمتھ، ۸۵ سولجر کو گرفتار کیا، اُن کو جیل میں ڈال دیا۔''

''اور اُس کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھی۔؟''

''پتر! میرٹھ اے جگراں لوگ دا شہر ہووے،تو کو آج دکھاویں گے اے شہر دا مٹی۔۔۔چل۔۔ل۔۔میرے ساتھ، اُدھر خان صاحب، میاں جی وہ اپنا شیخ۔۔۔ آپی آپی ٹکڑیوں سنگ نو چندی میدان پونچ رئے اُدھر ۲۰۰۰ /فوجی میرے آپنے ہو ویں گے۔چل۔۔ل۔۔۔''

پھر وہ تینوں گھوڑ سوار جیسے ہی نوچندی میدان کے قریب پہنچے، انھوں نے دور سے دیکھا، عورتیں اپنی کلائیوں سے چوڑیاں اُتار کر تماشہ بین مردوں کو دکھا رہی تھیں۔ چودھری کدم سنگھ کے ساتھ اُن کے دوستوں نے بھی اپنے گھوڑوں کو آگے بڑھایا اور اُن کے پیچھے تارا اور دینا ناتھ بھی بڑھے۔ جونہی وہ عورتوں کے مقابل پہنچے، عورتیں اُن کی طرف بھی چوڑیاں لے کر پہنچی۔ چودھری نے اپنا ہاتھ بلند کیا، "اے بہنو !اب جیادہ کچھ کہنے کا جرورت ناہی، ہم سمجھ گئے ہیں تم کا کہت ہو۔۔۔!" پھر اُنھوں نے اپنے ساتھی خان صاحب کی جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا، "رب دی قسم ! اب میرٹھ آگ اُگلے ہے۔"

خان صاحب کا گھوڑا بھی ایک قدم آگے بڑھا، "قسم ہے پرورد گار کی اب جیل میں کوئی ہندوستانی نہیں رہے گا۔" اُنھوں نے بھیڑ کی طرف دیکھا، "تم بھی یہی چاہتے ہو نا؟

بھیڑ نے جواب دیا، نعرۂ تکبیر۔۔۔اللہ اکبر

نعرۂ تکبیر۔۔۔اللہ اکبر

نعرۂ تکبیر۔۔۔اللہ اکبر۔

جیل پر حملہ کرنے چلو۔۔۔!"

ہر ہر مہادیو

ہر ہر مہادیو

ہر ہر مہادیو

جوش وخروش میں ڈوبے ہوئے نعرے دلوں کو گرمانے لگے اور گھوڑ سوار جیل کی طرف روانہ ہوئے۔ اُن کے پیچھے ہزار ہا افراد ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے نعرے لگاتے ہوئے دوڑنے لگے۔

صدر بازار میں خریداری کے لیے نکلے ہوئے انگریز خواتین و بچے خوف کے مارے تیزی سے اپنے بنگلوں کی طرف جانے لگے۔ پورے شہر پر ایک دہشت

طاری ہوگئی ۔ چاروں طرف نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کا شور تھا اور گھوڑ سوار جیل سے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔رات کی سیاہی پھیل رہی تھی ۔دور مشعلوں کی روشنیوں میں ایک بڑے انقلاب کی دستک صاف سنائی دے رہی تھی ۔

آخر مجاہدین نے جیل کو چاروں طرف سے گھیر لیا ۔نعروں کا شور زمین تا آسمان گونج رہا تھا ۔ کوتوالِ جیل ہانپتا کانپتا جیل کے صدر دروازے تک آیا لیکن دروازہ کھول کر دیکھنے کی اُس میں ہمت نہ تھی ۔اُس نے آہستہ سے دروازے کی چھوٹی سی جالی کو کھولا اور سامنے دیکھا مشعلوں کی روشنی میں تلواریں چمک رہی تھیں اور بے چین گھوڑوں کے ٹاپوں سے جیل کا ماحول دہل رہا تھا۔اُس نے کرخت لہجے میں سوال کیا،''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

چودھری کدم سنگھ آگے بڑھا اور اُس سے بھی اونچی آواز میں گویا ہوا،''اوئے دھان سنگھ۔۔دیکھ۔۔ان جیالے سرفروشوں کو دیکھ،ان کی آوازوں کو سُن۔''

مجمع زور سے چلایا،'' نعرۂ تکبیر اللہ اکبر

اللہ اکبر، اللہ اکبر

دھان سنگھ نے دوسری طرف دیکھا،

ہر ہر مہادیو

ہر ہر مہادیو

ہر ہر مہادیو

خان صاحب اور چودھری نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔

سب خاموش ہو گئے

''دھان سنگھ! دیکھ لیا ان کا جوش! اب بھی سمجھ لے۔۔ان کی طاقت کو دیکھ، تمری ہمری کوئی دشمنی نہ ہووے۔۔نا۔۔بھائی ہووے تو ہمرا، ہندوستانی بھائی ۔۔ بھیا تو بس جیل کا دروجہ کھول دے اور پرے ہٹ جا۔۔ تنے کچھ نہ ہووے گا۔بس تو دروجہ کھول دے۔۔کھول۔۔۔''چودھری زور سے چیخا۔

دھان سنگھ نے چاروں طرف دیکھا، ایک لمحہ کچھ سوچا اور پھر جیل کا دروازہ کھول دیا۔

جیل کا دروازہ کھلنا تھا کہ نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کے فلک شگاف نعروں سے ساری جیل دہل اُٹھی ۔ بے تحاشہ افراد اندر داخل ہونا شروع ہوئے اور اُنھوں نے قیدیوں کے تالے توڑنا شروع کیا۔ قیدیوں میں اُن ۸۵ رسپاہیوں کے ساتھ ہی ساتھ وہ جرائم پیشہ مجرم بھی تھے جو مختلف گناہوں کی پاداش میں سزائیں کاٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے قیدی آزاد ہوگئے۔ چیخ و پکار کا وہ عالم تھا کہ کوئی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ جوش میں اُن لوگوں نے جیل کو آگ لگا دی۔ کچھ ہندوستانی سپاہیوں نے مدافعت کی کوشش کی تو وہ بھی مارے گئے۔ جیل سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ نعروں کا شور تھا اور تلواریں چمک رہی تھیں۔

جیل کی فتح نے مجاہدین کے حوصلے بلند کر دیے اور وہ سب وہاں سے انگریزوں کے رہائشی بنگلوں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جو بھی انگریز دکھائی دیا اُسے قتل کر دیا گیا۔ اُن کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ رہائشی بنگلوں پر جیسے ہی مجاہدین پہنچے اُنھوں نے آگ لگانا شروع کیا۔ عورتیں اور بچے جیسے ہی خوف کے مارے بلبلاتے ہوئے بنگلوں سے باہر نکلے اُنھیں قتل کیا جانے لگا۔ اُنھیں بچانے کی خاطر اُن کے ہندوستانی خانساماں، اردلی، دفع دار دوڑے تو اُنھیں بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ بے شمار انگریز قتل ہوئے۔ ہر طرف آہ و فغاں کا بازار گرم تھا۔ جدھر بھی نگاہ اُٹھتی خون ہی خون تھا، لاشیں ہی لاشیں تھیں، آگ ہی آگ تھی۔

کچھ انگریز مرد و خواتین اور بچے مجاہدین کے ہاتھوں بچ نکلے تو وہ پا پیادہ، ننگے سر، چیختے چلاتے بے سروساماں جدھر بھی رُخ تھا اُسی طرف بھاگ نکلے۔ درد میں ڈوبی ہوئی آوازیں دلوں کو دہلا رہی تھیں۔ حالانکہ میرٹھ میں اُس وقت انگریزوں کی دو رجمنٹ موجود تھیں لیکن حکام ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اُنھیں مقابلے کا حکم بھی نہ

دے سکے اور مجاہدین کی فتح نے تاریخ کا ایک نیا باب وا کر دیا۔

جان بچا کر بھاگنے والوں میں کیپٹن جان ہیری بھی تھا۔ وہ اگرچہ زخمی تھا لیکن پھر بھی وہ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ویرانوں کی طرف نکل گیا۔ اُس نے دیکھا ہندل ندی بہہ رہی ہے وہ اُس کے کنارے کنارے بھاگ رہا تھا اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ چیخ وپکار کی آوازیں اب بھی اُس کا پیچھا کر رہی تھیں ۔ اُس نے نظریں سامنے کیں تو اُسے دور ایک چھوٹی سی کٹیا نظر آئی۔ وہ اُسی طرف دوڑنے لگا۔

آہ وفغاں کی آوازیں سن کر گیتا کٹیا سے باہر نکلی۔ اُس نے دیکھا، تاحد نگاہ آگ ہی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ مارو، کاٹو، ختم کر دو کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں اور کوئی سایہ بے تحاشہ دوڑتا ہوا اُس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ وہ فوراً اپنی کٹیا میں گئی اور گھانس کاٹنے کی درانتی لے کر باہر آ گئی۔ آگ کی روشنی میں سایہ اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے درانتی کی مٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

آوازیں اب بھی اُسی طرح آ رہی تھیں۔

ایک بھی فرنگی بچنے نہ پائے۔

مارو۔ کاٹو۔ آگ لگا دو۔

سایہ قریب سے قریب تر ہوتے ہوئے آخر ایک دم اُس کے سامنے آ گیا، گیتا نے جونہی اُس کی طرف دیکھا تو وہ اُس کے قدموں میں گر گیا اور گڑگڑانے لگا،''وہ ہم کو مار ڈالے گا۔ دیوی ہم ہاتھ جوڑتا، ہم کو کسی طرح بچالو۔ ہم تمہارا احسان زندگی بھر یاد رکھے گا۔'' اُس نے اپنا چہرہ اوپر کیا، اور دوسرے ہی لمحہ گیتا نے اُسے پہچان لیا،'' تو یہ تو ہے۔۔۔؟''

کیپٹن جان ہیری نے بھی اُس کی طرف غور سے دیکھا۔

''یاد کر۔'' گیتا نے درانتی اُس کی تھوڑی پر لگا دی،'' وہ۔۔ وہ تو ہی تھا نا؟۔ مجھے میرے گھر سے اُٹھا کر بے آبرو کرنے والا۔؟ یاد آیا۔؟'' اُس کی آواز بلند ہوگئی۔

جان ہیری اُس کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''دلّی، محلّہ بلی ماراں، صبح کا وقت، ایک لڑکی اپنے گھر کے سامنے رنگولی سجا رہی ہے۔ یاد آیا۔؟؟؟'' وہ زور سے چیخی، ''یاد آیا۔؟''

جان ہیری نے اقرار میں گردن ہلائی، ''ہم کو معاف کردو لیڈی۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔

''تیرے کو معاف کردوں؟ میری زندگی برباد کرنے والے، تیرے کو معاف کردوں؟ ارے تو نے تو مجھے کسی آم کی طرح چوس کر پھینک دیا تھا۔ میری غیرت نے مجھے گھر بھی جانے نہیں دیا کہ اب اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں؟۔۔ تب سے آج تک میں بے وطن بے آبرو، اس کُٹیا میں ایک مزدورن کی زندگی جی رہی ہوں، تجھے معاف کردوں؟'' اور پھر اُس نے اندھادھند اُس کے جسم پر درانتی سے وار کرنا شروع کردیا۔ جان ہیری کے حلق سے آواز بھی نہیں نکلی۔ بس خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ مارتے مارتے اور خون کو اس طرح بہتے ہوئے دیکھ کر اُسے چکر سے آنے لگے اور وہ زمین پر گرگئی۔

جان ہیری کے بدن میں اب بھی جان باقی تھی۔ اُس کے سامنے درانتی پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے آہستہ سے اُٹھالیا اور اپنی قوت کو سمیٹ کر درانتی کو گیتا کے پیٹ میں بھونک دیا اور خود بھی اُس کے پائینتی گر گیا۔

بہت دیر تک وہ بے حس وحرکت پڑا رہا۔

اُس کے بدن سے بہت زیادہ خون بہہ چکا تھا۔

اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

لیکن اُٹھ نہ سکا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

☆☆☆

(۸)

مہرولی کے اُس چھوٹی سی ٹیکری پر مشعل روشن تھی اور اُس سے کچھ دوری پر چنبیلی، سبحان میاں اور پنڈت بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ اچانک سبحان میاں نے چنبیلی کو عورتوں کے انداز میں مخاطب کیا، ''اے ہے یہ تم اپنے میاں کو کہاں چھوڑ آئی ہو۔''

چنبیلی ایک دم شرما گئی اور پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگی، ''کہہ گئے ہیں کہ ذرا شہر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

''اور یہ طالب احمد اور بھانو پرتاپ۔؟'' پنڈت نے سبحان میاں کی طرف دیکھا اور سبحان میاں نے چنبیلی کی نقل اُتارتے ہوئے بتانا شروع کیا، ''اے ہے دونوں کہہ گئے ہیں کہ اماں کی بڑی یاد آرہی ہے اس لیے وطن گئے ہیں۔''

دونوں نے قہقہہ لگایا اور چنبیلی جھینپ گئی۔

''حیدر بھائی کے بغیر محفل سونی ہونی ہو جاتی ہے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو پنڈت، پر خدا جانے یہ بندا اس وقت کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔''

''آ جائیں گے سبحان بھائی! انتظار کریں۔''

اور سبحان میاں آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

''اوپر والے کو ڈھونڈھ رہے ہو سبحان بھائی۔۔؟''

''ارے میاں اُسے ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت، وہ تو اپنے بندے کے ساتھ

ہی ہوتا ہے!''

''سچ کہتے ہو۔!'' پنڈت نے تائید کی، ''یہی بات سنت کبیر بھی تو کہہ گئے ہیں۔''

''کیا کہہ گئے ہیں پنڈت جی! ہمیں بھی سناؤ۔'' چنبیلی نے خواہش کی۔

پنڈت نے سبحان میاں کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں۔۔لیکن پنڈت گائیکی کے ساتھ!''

اور پنڈت کی نہایت سُریلی آواز فضاء میں پھیلنے لگی۔

مو کو کہاں ڈھونڈھے بندے
مو کو کہاں ڈھونڈھے بندے
میں تو تیرے پاس میں
نا میں جھگری، نہ میں بھیڑی
نہ میں چُھری گنڈاس میں

مو کو کہاں ڈھونڈھے بندے
میں تو تیرے پاس میں

نا میں دیول نا میں مسجد
نا کابے کیلاس میں

مو کو کہاں ڈھونڈھے بندے
میں تو تیرے پاس میں

نا تو کون کریا کرم میں
نہ یوگ بیراگ میں
کھوجی ہوئے تو ترنت ملے ہوں
پل بھر کی تالاس میں

مو کو کہاں ڈھونڈھے بندے

میں تو تیرے پاس میں

کہے کبیر سنو بھئی سادھو

سب سوانسوں کی سانس میں

مو کو کہاں ڈھونڈھے بندے

میں تو تیرے پاس میں

''واہ پنڈت واہ۔'' سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

''چنبیلی بہن!'' سبحان میاں نے اُسے مخاطب کیا، ''آپ تو خود بھی گائیکا ہیں، بتائیں، کلام افضل یا گائیکی۔''

چنبیلی نے فوراً کہا، ''کلام۔''

''لیکن یہ بھی تو بچار کریں، اگر گائیک نہ گائیں تو کلام دوسروں تک کیسے پہنچے؟ طاق ہی میں نہ پڑا رہ جائے؟''

''یعنی آپ گائیک کو افضل سمجھتے ہیں۔ ہے نا پنڈت۔؟''

چنبیلی نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا، ''پنڈت جی حضرت امیر خسرو کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں۔''

''ہاں ہاں۔۔ بہت اچھی طرح جانتے ہیں، وہ مہان سنگیت کار، گائیک اور کوی تھے۔''

''آپ نے اُن کے کوی ہونے کو آخر میں رکھا ہے۔ ہے نا؟'' چنبیلی نے اُس سے اُس کا اقرار چاہا۔

''بالکل۔''

''لیکن خود خسرو جی کیا کہتے ہیں۔ یہ پتہ ہے آپ کو۔؟''

سب نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ چنبیلی کے چہرے پر عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور وہ کہنے لگی، ''ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک گویا خسرو جی سے کہنے لگا، شاعری کے خزانے سے سنگیت بھلا، جو اپنی نزاکت کے باعث کاغذ اور دلوں پر

چھا جاتا ہے۔''

خسرو جی کے چہرے پر ہنسی آ گئی اور اُنھوں نے فرمایا،'' شاعری ایک ایسا علم ہے جسے گویئے کی ضرورت نہیں لیکن گویئے کو شاعری درکار ہے۔ گویّا اپنے فن سے راگ میں کتنی ہی چٹکیاں، مُرکیاں، چاہے جیسا الاپ لگا لے شاعری کے مفہوم میں نہ تو اضافہ ہوگا اور نا ہی کمی آئے گی۔'' گویّا لاجواب ہوگیا اور اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ خسرو جی کو اُس کی یہ حالت بھی دیکھی نہیں گئی اور اس خیال سے کہ اُس کی دل آزاری نہ ہو، آپ نے فرمایا،'' بھائی یہ بحث چھوڑو، بس اتنا سمجھ لو کہ شاعری دُلہن ہے اور سنگیت اُس کا زیور۔'' چنبیلی نے سبحان میاں کی طرف دیکھا،'' کہیے سبحان بھائی میں ٹھیک جواب دے پائی نا۔؟''

سبحان میاں کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ٹھیک اُسی وقت حیدر خان کا گھوڑا زور سے ہنہنایا اور پھر وہ اپنے دو پیروں پر اُچک گیا، حیدر خان نے اُس کو تھپتھپایا اور پھر نیچے اُتر گیا۔ اُس کے چہرے سے اُداسی ٹپک رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اُن کی طرف بڑھنے لگا۔ چنبیلی مسلسل اُس کی طرف دیکھے جارہی تھی۔

سبحان میاں کا نعرہ بلند ہوا،'' دمادم مست قلندر۔''

لیکن حیدر خان نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آ کر اُن میں بیٹھ گیا۔ سب کے سب اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

'' کیا بات ہے حیدر خان۔؟'' چنبیلی بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ٹک اُس کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکا دی۔

'' ارے کچھ کہو گے تو دل دلا سے کے بول نکلیں گے نا۔''

حیدر خان اُنگلی سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔ چنبیلی نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھا،'' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

حیدر خان نے پھر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک

رہی تھی اور اُس کی زبان سے نکلا،''ہاں سب ٹھیک ہے۔''

''کیا بات ہے حیدر بھائی۔؟ آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں'' پنڈت نے بھی سوال کیا۔

''تارا اور دینا ناتھ ابھی تک میرٹھ سے واپس نہیں آئے ہیں۔''

''تو آجائیں گے۔'' سبحان میاں نے دلاسہ دیا۔

''جانے کیوں مجھے عجیب سے وسوسے آرہے ہیں جیسے کہیں کچھ ہوا ہے۔''

''یونہی۔۔؟'' چنبیلی اُس کے کچھ اور قریب آگئی۔

''یونہی نہیں چنبیلی!'' اُس نے اندھیرے کی طرف دیکھا،''میں نے شہر میں ایک عجیب سا منظر دیکھا ہے۔''

''کیا دیکھ کر آئے ہیں آپ حیدر بھائی۔''

''میں نے دیکھا، ایک فوجی پریشان، پھٹے حال، پسینے میں شرابور، گھبرایا ہوا، ریسیڈنسی کی طرف گھوڑا دوڑائے جارہا ہے۔'' حیدر خان ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا اور سب کے چہروں پر سوالیہ نشان اُبھر آئے۔

''مجھے شک ہوا، اور میں نے محتاط فاصلے سے اُس کا تعاقب کیا۔ وہ سرپٹ گھوڑا دوڑائے جارہا تھا۔ پھر وہ ریسیڈنسی میں داخل ہو گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ باہر نکلا ہی نہیں۔''

''کیا وہ فوجی ہی تھا؟''

''ہاں۔!'' حیدر خان کا چہرا پُر تشویش ہو گیا،''ضرور اُس کے پاس کوئی اہم خبر ہوگی۔''

سبحان میاں نے سب کی طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر اُن کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ زور سے چلائے،''صدقہ پنجتن پاک کا۔''

اور پھر مراقبے میں چلے گئے۔

''لو یہ تو گیان میں ڈوب گئے۔'' پنڈت اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اور چنبیلی

نے حیدر خان کی طرف دیکھا۔

سبحان میاں نے آنکھیں کھولیں، ''حیدر بھائی آپ کا اندیشہ سولہ آنے سچ ہی ہے!''

''کسی نے تمہارے کان میں کچھ کہا ہے۔؟''

''بچھ تم ابھی بچہ ہی ہو!'' پھر وہ حیدر خان سے مخاطب ہوئے،'' حالات بگڑنے والے ہیں۔ میرا بھی دل گواہی دے رہا ہے۔''

''مجھے تارا کی فکر ہوگئی ہے۔''

''دینا ناتھ کی نہیں۔؟'' پنڈت کا لہجہ قدرے بدل گیا۔

''پنڈت! دینا ناتھ مرد ہے، لیکن تارا۔۔۔ تم نہیں جانتے وہ بہت جلد گھبرا جاتی ہے۔'' پھر وہ چنبیلی کی طرف پلٹا،''میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں میرٹھ ہو آؤں۔''

''لیکن میں آپ کو جانے نہ دونگی، وہ فوجی چھاؤنی ہے۔!'' اُس کی آنکھوں میں خوف در آیا،''حیدر خان تمہارے سوا میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''حیدر بھائی چنبیلی ٹھیک ہی کہہ رہی۔ میرا بھی یہی خیال ہے فی الحال کسی کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف وسوسے اور خدشات ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔'' سبحان میاں نے آہستہ سے کہا، اور پھر وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اُن کے قدم مشعل کی طرف اُٹھنے لگے۔

''اور جو کچھ میں نے دیکھا۔''

''کسی نے اُس سے انکار کیا۔؟ جو کچھ تم نے دیکھا اور جو تم سوچ رہے ہو وہ غلط بھی نہیں ہے۔''

سب نے اُن کی طرف دیکھا، وہ واپس اُن کے جانب آنے لگے،'' اگر حالات بگڑتے ہیں یا بگڑنے والے ہوں تو شہر میں ناکہ بندی ہو جائے گی اور ایسی صورت میں نہ تم شہر سے باہر جا سکتے ہو اور نا ہی ہم اندر جا پائیں گے۔''

''تو۔؟'' پنڈت کا منہ کھلا کی کھلا رہ گیا۔

'' ہمیں اب یہاں سے واپس ہونا چاہیے ، اس سے پہلے کہ کہیں کچھ ہو جائے۔'' سبحان میاں نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

چنبیلی بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، ''میرا بھی یہی خیال ہے۔۔ چلو ساتھیو۔''

اور پھر اُن کے قدم اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف بڑھنے لگے۔

گھوڑا دوڑ رہا تھا۔

آسمان میں چاند نکل آیا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی سایہ دار درختوں سے چھن چھن کر راستہ دکھا رہی تھی۔

اُن کے پیچھے شعلے بھڑک رہے تھے۔

وہ ابھی تک میرٹھ کے حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔

لڑکی نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ دور تک آگ ہی آگ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں وہ منظر پھر سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے بنگلے کو باہر سے آگ لگا دی گئی تھی۔ آگ کی روشنی میں وہ سارے خوفناک چہرے اور خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں چمک رہی تھیں۔ اُس کے والد فوجی نہ تھے۔ ڈاکٹر تھے۔ وہ دروازے میں کسی آہنی دیوار کی طرح ڈٹ گئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اُنھوں نے فائر بھی کیے تھے۔ ہجوم گولیوں کی آواز سے سہم کر کچھ پیچھے ہٹا تھا اور وہ دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ وہ اور اُس کی والدہ خوف کے مارے مری جا رہی تھیں اور مسلسل چیخے جا رہی تھیں۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے اُس کے والد کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ دونوں بھی باہر نکل آئی تھیں اور پھر دوسرے ہی لمحے والد کا سر تن سے جدا ہو کر دروازے سے ٹکرایا تھا اور والدہ کی چیخ آسمانوں تک گونج گئی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت یہ نوجوان خدا جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ میں خوف سے چلا رہی تھی اور والدہ کا حشر دیکھنے سے پہلے ہی اُس نے تلواروں کے بیچ میں سے اُسے نکالتے ہوئے اپنے گھوڑے پر

بٹھا دیا تھا اور خود بھی سوار ہو گیا تھا اور شعلوں کو چیرتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ وہ کون ہے اور مجھے کہاں لے کر جا رہا ہے؟ یہ میں کچھ نہیں جانتی۔ مسیح ہی میری مدد کریں گے۔

گھوڑا بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔

دور سے ناکہ نظر آرہا تھا۔ وہاں کچھ لوگ ہاتھوں میں تلواریں لیے کھڑے تھے۔ سوار نے بھی اپنی تلوار سونت لی تھی۔ لڑکی پر خوف اُسی طرح مسلط تھا۔ وہ اُس کی پیٹھ سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی ناکے کے قریب پہنچا اُس کے گھوڑے کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ تلوار بازوں نے زور سے نعرہ لگایا، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

اور سوار کے بھی منہ سے نکلا، "ایک بھی فرنگی بچنے نہ پائے۔" پھر اُس نے اپنا تلوار والا ہاتھ بلند کیا، اور زور سے چلایا، "انقلاب زندہ باد۔!"

تلوار باز راستے سے ہٹ گئے۔

اور اُس نے تیزی سے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

جونہی وہ اُن کے بیچ سے گزرا، انھوں نے انگریز لڑکی کو دیکھ لیا اور اُن میں سے ایک چلایا، "دھوکا۔۔۔!"

"پکڑو اُسے جانے نہ پائے۔"

گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا تھا۔

وہ اُس کے پیچھے بے تحاشہ دوڑے۔

لیکن اُس کا تعاقب مشکل تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت دور نکل گیا اور وہ سب ہاتھ ملتے رہ گئے۔

سوار نے گھوڑے کی باگ موڑ دی لیکن اُس کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔

قلعہ معلی میں رقص و سرور کی محفل آراستہ تھی۔ شہزادہ مرزا سلطان خضر مسند نشین تھے۔ حسب مراتب اُن کے مصاحبین بیٹھے ہوئے تھے۔ کنیزیں دست بدستہ کھڑی تھیں۔

گھنگھروؤں کی چھنا چھن اور طبلے کی دھنا دھن کے بیچ اُستاد تانرس خان کی مدھر لئے کانوں میں رس گھولنے لگی۔۔۔

سا سا گا پا۔ پانی دھانی پا م گا م رے گا

دھا پا م گا رے گا رے م گا رے نی رے گا رے سانی۔۔۔۔

اور رقاصہ گھنگھروؤں کے زور پر آؤبھاؤ دکھانے لگی۔

چھنا چھم چھنا چھنا۔۔۔چھنی چھانی چھم چھم چھنا چھنے چھنا چھنن۔۔ چھنا چھنم چھنا چھنے۔۔۔ چھنا چھنے چھم ۔۔ چھنا چھنے چھم۔۔ چھنا چھنے چھن چھن چھم

اُستاد گائیکی کی اگلی منزل کی طرف بڑھے،

پا پانی دھانی سا سا سا گا گا م رے رے سا سا

سا دھا پا م گا گا رے گا م پا پا م گا گا۔۔۔۔

دھا دھا پا م پا م گا م رے گا رے پا سا م گا پا گا۔۔۔

گا پا دھانی سا دھا پا پا م گا سا رے گا م گا رے سانی سانی دھا پا پا گا رے ما۔۔۔

اور جواب میں تھرکتی ہوئی رقاصہ نے گھنگھروؤں سے جواب دیا۔۔۔

چھنا چھننا چھنا چھننانی چھن چھن چھن چھنا چھام چھنے چھنے چھننا چھننا چھنا چھننا چھم چھنا چھنا چھننے چھنا چھن چھم چھنا چھنا چھم چھنا چھننا چھنا چھننا چھم چھم چھنا چھم چھنے چھننا چھنن چھم چھنا چھننا چھننا چھن چھننا چھنا چھننا چھننانی چھنا چھننا چھنا چھم چھنا چھنے چھام چھان چھنن چھنا چھن چھنا چھننا چھنا چھم چھنا چھنا چھننے چھننا۔۔۔۔

رقاصہ جونہی کمان بن کر پلٹی وہ سُر سے بھٹک گئی، طبلے کی تھاپ نے احتجاج کیا اور وہ دھم سے گر پڑی۔

گھوڑا مسلسل دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا تھا اور اُس کی رفتار کم ہوتے ہوتے

بہت کم ہوگئی تھی۔ جیسے ہی لڑکی کو یہ احساس ہوا وہ گھوڑے سے نیچے کود گئی۔

نوجوان نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور خود بھی گھوڑے سے اُتر گیا۔ دونوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا۔ نوجوان نے اپنے چہرے پر بندھا ہوا ڈھاٹا کھول دیا اور جیسے ہی لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا، وہ اُسے پہچان گئی اور بنا سوچے سمجھے کھیتوں کی طرف بھاگنے لگی۔ نوجوان بھی اُس کے پیچھے لپکا۔ لڑکی ہرنی کی مانند دوڑ رہی تھی تو نوجوان چیتے کی طرح اُس پر جھپٹ رہا تھا۔ آخر نوجوان نے اُسے دبوچ لیا اور اُسے اپنی گود میں بھر لیا۔ لڑکی تلملاتی رہی۔ وہ اُسے گھوڑے کے قریب لایا اور آہستہ سے نیچے اُتار دیا۔ لڑکی نے اُس کی طرف حقارت سے دیکھا، اور پھر زور سے چیخی، ''تم ہم کو کیوں بچایا، یہ اب ہم اچھی طرح سمجھ گیا''

''اوئے گلبدن! تم ابھی تک کچھ بھی نہیں سمجھی۔'' وہ گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

لڑکی اُس کی طرف تیر کی طرح بڑھی اور اُس کی کمر میں لٹکے ہوئے خنجر کو کھینچ لیا اور چاہتی تھی کے خود کو مار لے، لیکن نوجوان نے بھی اُتنی ہی پھرتی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں میں کچھ دیر تک چھینا جھپٹی ہوتی رہی اور آخر نوجوان نے خنجر کو اُس سے چھین لیا اور پھر محبت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''ہم تم کو مرنے کے واسطے نہیں بچائی۔ لالہ کی جان! ہم کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''ہم تم کو اور تمہارا نیت کو اچھی طرح پہچان گیا ہے۔'' لڑکی نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا، ''ہم جب جب بھی چرچ کو جاتا تھا، تم ہمارا پیچھا کرتا تھا، ہم کو اشارے کرتا تھا۔'' اُس نے غصے سے زمین پر تھوکا، ''ہم چاہتا تو اپنے فادر کو تمہارا شکایت کر کے تم کو اریسٹ کروا سکتا تھا، بٹ ہم تم کو معمولی غنڈہ سمجھا تھا اس واسطے تم بچ گیا۔''

نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اُس کے قریب پہنچا، ''اوئے حورشائل! ہم غنڈہ نہیں ہوتی۔ ہم شیر داد خان کا اکلوتا فرزند، دلبر داد خان، تمہارا عاشق، ہم تم سے عشق۔۔ لو(Love) کرتی۔''

''لو۔۔؟''لڑکی دانت پیسنے لگی،''تم لو کا اسپیلنگ بھی جانتا ہے۔؟یو لوفر۔۔ہم تم کو اریسٹ کیوں نہیں کروایا؟ابھی۔۔ابھی ہم پر بُرا ٹائم آ گیا ابھی ہم کچھ نہیں کر سکتا۔'' وہ رونے لگی۔۔۔روتے روتے اُس کے تیور ایک دم بدل گئے اور وہ غصے سے دھاڑی،''تم ہم کو کیوں بچایا ہم جان گیا ہے۔تم کو ہمارا عزت مانگتا ہے نا؟ یو ڈرٹی بُل۔آ۔آگے بڑھ۔ہم اِدھر مجبور کھڑا ہے!۔۔کم آن۔۔!'' وہ زور سے چیخی۔

دلبر خان نے اُس کی طرف غور سے دیکھا،لڑکی کے آنکھوں سے آنسوں خشک ہو گئے تھے۔اُس نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور سختی سے اپنی جانب کھینچا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا،''قسم ہے رب العزت کی،دلبر داد خان کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہوتی،تم کو تمہارے بنگلے سے اُٹھانا چٹکیوں کا کھیل تھی،کسی کا ماں ابھی تک وہ اولاد جنا نہیں جو دلبر کو اُس کے ارادوں سے روکتی؟''

اُس نے اُسے چھوڑ دیا اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھتا ہوا کہنے لگا،''ہم تم سے سچا لو(Love) کرتی ہے،ہم قسم کھائی تھی جب تک تمہارے دل میں اپنے لیے جگہ نہیں بنالیتی تم کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔مگر ابھی ہم کیا کرے گی وقت ہی ایسا آ گئی اور ہم تم کو تمہارے مرضی کے خلاف اٹھا کر لائی۔ہم شیر داد خان کا اکلوتی اولاد،قسم رب العزت کی شیر داد خان آج تک کوئی غلط کام نہیں کری،وہ سارے پٹھان جرگے کا ناک،ہم اُس کی اولاد،اُس کی ناک کو کٹنے نہیں دے گی۔۔سمجھی تم۔؟''

وہ پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔لڑکی نے مجبور نظروں سے اُس کی طرف سے دیکھا اور پھر وہ اُس کے پاس چلی آئی،''تم ہم کو کدھر لے جانا مانگتا؟''

''اُدھر بلند شہر میں ہمارا بہت بڑا دیوڑھی ہے۔'' وہ اُچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔لڑکی نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور اپنے ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیے۔اُس نے اُسے کسی پھول کی طرح اُٹھالیا اور پھر گھوڑا دوڑنے لگا۔

(۹)

قلعہ معلی میں نمازِ فجر سے قبل کے نقاروں پر چوٹ پڑنی شروع ہوگئی تھی۔
نیند کی پریاں تمام قلعے سے غائب ہونے لگیں تھیں۔
کوئی غسل کے لیے بڑھا، اور کوئی وضو کی چوکیوں پر بیٹھنے لگا۔
موتی مسجد سے اذان بلند ہونے لگی تھی۔

میرٹھ کی کامیابی نے مجاہدین کے حوصلوں کو بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک بڑی طاقت کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسی طاقت جو ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلاسکتی ہے۔ چنانچہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ دلّی کی طرف کوچ کرنا چاہیے اور اُسے انگریزوں کے قبضے سے چھین کر پھر سے ایک بار خاندان مغلیہ کو اقتدار سونپنا چاہیے۔ چنانچہ یہ جیالے دلّی کی طرف چل پڑے۔ راستے میں جو بھی مقام ملتا مجاہدین وہاں کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتے اور وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ مجاہدین کے لشکر میں بڑی تعداد اُن سپاہیوں کی تھی جو انگریزوں کی رجمنٹ گیارہ اور بیس میں شامل تھے۔ یہ تربیت یافتہ سپاہی سب سے آگے تھے اور اُن کے پیچھے وہ لوگ شامل ہو گئے تھے جنھوں نے اُن کے مظالم کے خلاف صف آراء ہونا ضروری سمجھا تھا۔ تمام راستہ نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

جوش و خروش کا ایک سیلاب تھا جس میں سبھی بہہ جا رہے تھے۔ آخر یہ فوجِ بے قاعدہ صبح صبح دلّی کے قریب پہنچ گئی۔ اُن کے سامنے دریائے جمنا اپنے پورے غرور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

حضور بادشاہ سلامت ثمن برج میں رونق افروز تھے اور جھروکے میں بیٹھے وظائف میں منہمک تھے کہ اچانک اُن کی نظروں کے سامنے ایک عجیب منظر اُبھرا۔ میرِ بحری کی کوٹھی سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھواں آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ اُن کی پیشانی پر فکر و تردود کے آثار نمایاں ہوئے اور اُنھوں نے فوراً فتح علی کو طلب کیا۔

فتح علی حاضر ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دریا کی جانب دیکھیں۔ جونہی فتح علی نے اُس طرف نگاہ کی اُس کے ہوش اُڑ گئے، ادب سے عرض کیا، "حضور توقف فرمائیں، ابھی تحقیق ہوئی جاتی ہے۔"

وہ وہاں سے فوراً نیچے آیا اور رسالدار کو حکم دیا کہ وہ سپاہیوں کو دریا کی جانب روانہ کریں اور تحقیق کریں کہ معاملہ کیا ہے؟

دو گھوڑ سوار روانہ ہوئے، لیکن ابھی کچھ دور ہی گئے ہونگے کہ دھویں کی لپیٹ میں آ گئے اور جیسے ہی وہ سلیم گڑھ سے نیچے پُل کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جمِ غفیر گھبرایا ہوا حیراں و پریشاں دوڑا چلا آ رہا ہے۔ اُنھوں نے اُنھیں روکا اور سبب دریافت کیا تو اُنھیں جواب ملا، کوئی غنیم دلّی پر چڑھ آیا ہے۔ میرِ بحری قتل کر دیے گئے ہیں۔ اُن کی کوٹھی کو نذرِ آتش کر دیا گیا ہے۔ لوٹ مار ہو رہی ہے اور ہم کسی طرح اپنی جان بچا کر اِدھر بھاگ نکلے ہیں۔

سواروں نے وہیں سے گھوڑوں کی باگیں واپسی کے لیے موڑ دیں اور سرپٹ دوڑتے ہوئے خبریں حضور تک پہنچا دیں۔

حضور نے فوراً میر فتح علی اور حمید خان کو حکم دیا کہ اپنے اپنے دستوں کے ساتھ فوراً وہاں پہنچ جائیں۔ پُل کو اُڑا دیا جائے۔ کشتیاں کھینچ لی جائیں تاکہ غنیم کا لشکر

دریا پار نہ کر سکے۔ کوتوال شہر تک حکم پہنچا دیا جائے کہ شہر کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور کلکتہ دروازے پر وہ خود حاضر رہیں۔ قلعہ دار کو حکم ہو کہ وہ قلعہ کا دروازہ بند کر دے اور مکمل حفاظت کا بندوبست کرے۔ اور ہاں راج گھاٹ کے دروازے کو بھی بند کرنا از حد ضروری ہے۔ ریسیڈنٹ بہادر کو مطلع کریں کہ ہم اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔

شاہی حکم پر عمل آوری ابھی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ مجاہدین نے کشتیوں کے ذریعے دریا کو پار کر لیا اور دلّی دروازے کے ذریعے شہر میں داخل ہو گئے۔ اُن کے نعروں اور گھوڑوں کے ٹاپوں سے سارا شہر دہل رہا تھا۔ دلّی میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ راستے میں جو بھی انگریز دکھائی دیا اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ لوٹ مار بھی شروع ہو گئی۔

ریسیڈنٹ بہادر برق رفتار حضور کے روبرو پہنچے، دیکھا حضور پریشان ہیں۔ شاہی آداب بجا لائے اور حضور گویا ہوئے،'' یہ کیسا فتنہ فساد برپا ہو گیا ہے۔ تعصبِ مذہبی نے کئی سلطنتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ آپ فوری اس کا بندوبست فرمائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عموماً طبقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے اور عقل کے بجائے تلوار کا استعمال کرتا ہے۔ آپ اُنھیں سمجھائیں۔۔ کیا آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔؟''

ریسیڈنٹ بہادر کا سر جھک گیا، وہ کیسے اقرار کرتے کہ رات گئے ایک فوجی پہنچا تھا، اور وہ غالباً یہی سب کچھ گوش گزار کرنا چاہتا تھا لیکن اُنھوں نے اُس سے ملاقات نہیں کی تھی اور صبح حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ وہ وہاں سے شاہی آداب کرتے ہوئے رخصت ہوئے اور بگھی میں سوار ہو کر کلکتہ دروازے کی طرف روانہ ہوئے۔

کچھ ہی دور گئے ہونگے کہ مجاہدین نے اُنھیں گھیر لیا۔ ریسیڈنٹ بہادر نے فائرنگ شروع کی جس کے جواب میں ایک مجاہد اور ایک گھوڑ سوار مارا گیا۔ وہ تیزی سے بگھی سے نیچے اُترے اور ثمن برج میں داخل ہوئے اور لاہوری دروازے پر پہنچ کر گارڈ کو حکم دیا کہ دروازہ بند کر دے۔

ٹھیک اُسی وقت ایک گھوڑ سوار دروازے پر پہنچا اور بولا، ''دروازہ کھول دے۔''

گارڈ نے سوال کیا، ''پہلے تو بتا تو کون ہے۔؟''

تب وہ بولا، ''میں میرٹھ کا سپاہی ہوں۔''

گارڈ نے پھر سوال کیا، ''تیرے دوسرے ساتھی کدھر ہیں۔؟''

''وہ انگوری باغ میں ہیں۔''

''تو پہلے اُن کو یہاں لے کر آ۔'' گارڈ نے مشورہ دیا، ''میں دروازہ کھول دوں گا۔''

سپاہی یہ سنتے ہی وہاں سے سیدھا انگوری باغ پہنچا اور کچھ ہی دیر میں بہت سارے سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا اور گارڈ نے حسب وعدہ دروازہ کھول دیا۔

مجاہدین تیزی سے اندر داخل ہوئے اور ریسیڈنٹ بہادر کو جا لیا اور پلک جھپتے میں اُن کا جسم ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ وہاں سے وہ سیدھا قلعہ دار کے مسکن پر پہنچے اور اُسے اور اُس کی بیوی کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے بچوں کو بھی تہہ تیغ کر دیا۔

مجاہدین کا لشکر کلکتہ دروازے کے بجائے راج گھاٹ کی طرف بڑھا اور کسی طرح شہر میں داخل ہو گیا اور انگریزوں کے رہائشی بنگلوں کو نذر آتش کرنے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔

اس بیچ وطن پرستوں کی ایک اور رجمنٹ شہر میں داخل ہو گئی اور وہ اُن بستیوں کی طرف بڑھی جہاں انگریز رہائش پذیر تھے۔ ان مجاہدین کے جوش اور جذبۂ حب الوطنی کو دیکھ کر دلّی میں موجود فوجی دستے بھی مجاہدین سے آ کر مل گئے۔ ہر سمت آہ و فغاں کا شور تھا۔ بازار لوٹے جا رہے تھے۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ عجب افراتفری کا ماحول تھا۔ انگریز خواتین و بچے پناہیں ڈھونڈھتے پھر رہے تھے۔ قتل ہو رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ ایسے ماحول میں بھی دلّی کے بعض گھرانوں نے انسانیت کا دامن نہیں چھوڑا اور اُن پریشان حال انگریز خواتین و بچوں کو اپنی جان کی بازی لگا کر بچانے کی

کوششیں بھی کیں، لیکن فوج کے آگے عام شہری کر ہی کیا سکتے تھے۔ یا تو وہ بھی اُن کے ساتھ ہی قتل کر دیے گئے یا پھر کسی طرح اُن کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

آخر انگریز سپاہی مقابلے پر آمادہ ہوئے لیکن مجاہدین کے جوش و ولولے کے آگے اُن کی ایک نہ چلی اور دلّی کے ہر محاذ پر اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین نے دلّی پر قبضہ کر لیا۔ شہر کے ہر دروازے پر دو دو توپیں چڑھا دی گئیں ۔شہر میں جس قدر ہتیار اور گولہ بارود موجود تھا سب مجاہدین کے ہاتھ لگ گیا۔

شہزادۂ عالم مرزا مغل جلد جلد قدم اُٹھاتے ہوئے بارہ دری کی طرف چلے جا رہے تھے۔ پھولوں کی کیاریوں کے ارد گرد خوبصورت، خوش رنگ پرندے، جن کے پر تراش دیئے گئے تھے تا کہ وہ پرواز نہ کر سکیں ٹھمک ٹھمک کر ادھر اُدھر چونچیں مار رہے تھے۔ کالے ہرن جن کے سینگوں پر چاندی کی سنگوٹیاں اور پیروں میں جھانجھنیں بندھی ہوئی تھیں اپنی ہرنیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر قدم اُٹھا رہے تھے۔ مختلف پھولوں کے رنگ برنگے گلدستے ہواؤں کے دوش پر سر اُٹھا اُٹھا کر شہزادے عالی وقار کو سلامی دے رہے تھے لیکن شہزادہ اس سارے منظر سے بے نیاز چہرے پر مسرت و شادمانی کا جمال لیے سیدھا چلا جا رہا تھا۔

بارہ دری میں بادشاہ سلامت بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ زینت محل حاضر ہوئیں، شاہی آداب بجا لائیں۔ بادشاہ سلامت نے اپنی ملکہ کی جانب دیکھا اور پھر گویا ہوئے ''ملکہ عالیہ دلّی دہل رہی ہے۔ قتل وخون جاری ہے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ آخر کریں تو کیا کریں؟''

زینت محل نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا ''حضور کا اقبال بلند رہے، وقت کی ہر کروٹ کے پیچھے مصلحت خداوندی پوشیدہ ہوتی ہے۔''

''مطلب۔؟'' بادشاہ نے چونک کر ملکہ کی طرف دیکھا۔

''حضور بادشاہ سلامت مبارک ہو۔!'' زینت محل کے لبوں پر مسکراہٹ

پھیلنے لگی، ''قسمت مغلیہ اقتدار کے سنہرے خوابوں کی تعبیریں پیش کرنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہیں۔''

بادشاہ نے اس بار بھی کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا اور پھر ایک بار بے چینی کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک کنیز داخل ہوئی۔ شاہی آداب بجا لائی اور عرض کیا، ''حضور کا اقبال بلند ہو، شہزادۂ عالم، آفتابِ سلطنت جانِ پدر مرزا مغل باریابی کے طالب ہیں۔''

''انھیں اجازت ہے۔'' بادشاہ نے آہستہ سے کہا۔ کنیز شاہی سلام پیش کرتے ہوئے حجرے سے باہر نکل گئی۔

زینت محل فکر میں ڈوبے ہوئے بادشاہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

مرزا مغل داخل ہوئے، شاہی آداب بجا لائے اور عرض کیا، ''حضور مبارک ہو! انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت کا بگل بج چکا ہے۔''

بادشاہ سلامت تیزی سے پلٹے اور شہزادے کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور پھر فرمایا، ''نادان شہزادے مٹھی بھر جیالے انگریز استحکام کا تختہ نہیں پلٹ سکتے ! آہ یہ تو کھلی خودکشی ہے۔''!

شہزادے نے دلیل پیش کی، ''حضور عالم پناہ! یہ مُٹھی بھر جیالے نہیں ہیں۔ میرٹھ فتح ہو چکا ہے، اودھ اور جھانسی بارود کے ڈھیر پر کھڑے وقت کو اپنا فیصلہ سنانے کے منتظر ہیں۔ مجاہدین کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دلّی میں اپنی فتح کا پرچم بلند کر چکا ہے۔ مسٹر سائمن فریزر اور کیپٹن ڈگلس ختم کر دیے گئے ہیں۔ دلّی انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی ہے۔''

بہادر شاہ ظفر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اپنے ولی عہد کے قریب پہنچے۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور مرزا مغل نے تعظیم سے اپنا سر پھر جھکا لیا اور بادشاہ نے کہنا شروع کیا، ''جانِ پدر! ہواؤں کے شور سے برسات نہیں ہوتی۔ وقتی جذبات معرکے سر نہیں کرتے۔ سراب دھوکا دیتے ہیں، ہماری نظروں میں

تو صحرا ہی صحرا پھیلا ہوا ہے۔''

''حضور کے خدشات کو غلط ثابت کرنے کی جسارت اس غلام میں نہیں ہے۔'' مرزا مغل نہایت ادب واحترام سے گویا ہوا،'' لیکن حضور! انقلاب کی یہ آندھی نہ تو وقتی فیصلہ ہے اور نا ہی صرف ہواؤں کا شور، حضور ظل الٰہی یہ ایک تند و تیز سیلاب ہے اور جو بھی اس کے زد میں آئے گا وہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔ آپ یقین کریں! انگریز اقتدار کا سورج اب غروب ہونے ہی کو ہے۔''

بادشاہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُنھوں نے مرزا مغل کے شانے کو تھپتھپایا،''فرزندِ دلبند! ہمیں بے انتہا مسرت ہو رہی ہے کہ تمہاری آواز میں ہم تیموری و چنگیزی جاہ و جلال کا رنگ دیکھ رہے ہیں۔''

بادشاہ سلامت نے پھر ایک بار ٹہلنا شروع کیا،'' لیکن عزیزم! اپنے اجداد کی مانند فتوحات حاصل کرنے کے لیے اُن کی حکمت و دانائی کا پرتو بھی ضروری ہے۔ اللہ تمہیں سرخرو کرے۔ لیکن شہزادے یہ کبھی مت بھولنا کہ عجلت میں پہاڑ سر نہیں کرتے۔ جاؤ اور وقت کا انتظار کرو۔''

شہزادہ شاہی آداب بجالایا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

بادشاہ نے چھت کی طرف دیکھا، خوشنما جھومر سے رنگ برنگی شعاعیں اِدھر اُدھر پھیل رہی تھیں۔

تارا اور دینا ناتھ گھوڑوں پر سوار جیسے ہی کوچہ چیلاں میں داخل ہوئے تو دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ اُن کے گھوڑے آہستہ آہستہ حیدر خان کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ صدر دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گھوڑوں سے نیچے اُترے اور دروازے پر دستک دی۔

ڈیوڑھی میں چنبیلی اکیلی تھی۔ اُس نے دستک کی آوازیں سنی لیکن حیدر خان اُس سے کہہ کر گیا تھا کہ دروازہ اندر سے بند رکھنا۔ وہ خاموش کرسی پر بیٹھی رہی۔

دستک کی آوازیں پھر ایک بار آئیں۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور بالا خانے کے زینے کو طے کر کے کمان دار کھڑکی کے پاس پہنچی اور آہستہ سے چلمن کی اوٹ سے باہر دیکھنے لگی، دور صدر دروازے کے پاس دو گھوڑے نظر آئے اور دو سائے دروازے سے چپکے ہوئے تھے۔ اُن کی صورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی، جانے کون لوگ ہوں گے۔؟ پھر اُس کے ذہن میں بجلی سی کوندی، کہیں تارا اور دینا ناتھ تو نہیں۔۔؟ وہ فوراً نیچے آ گئی اور صدر دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے سوال کیا، ''کون۔۔؟''

''دروازہ کھولیں ہم ہیں۔''

یہ آواز تارا کی تھی۔ چنبیلی نے پھرتی سے دروازے میں لگی آڑی بلّی کو کھینچا اور دروازے کو کھول دیا۔ تارا فوراً داخل ہوئی اور چنبیلی سے لپٹ گئی۔ دینا ناتھ دونوں گھوڑوں کی لگامیں تھامے اندر داخل ہوا اور پھر دروازہ بند کرتا ہوا اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔

چنبیلی نے تارا کی طرف دیکھا وہ تھکن سے چور چور نظر آ رہی تھی۔ پھر دونوں راہ داری کو طے کرتے ہوئے صحن میں پہنچے اور وہاں سے دالان میں داخل ہوئے۔ سامنے کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ تارا ایک کرسی میں دھنس گئی۔

''میرٹھ کا کیا حال ہے تارا۔؟'' چنبیلی بھی اُس کے مقابل بیٹھ گئی۔

''نہ پوچھو بجو۔'' تارا نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر چونک کر پوچھی، ''حیدر بھائی گھر میں نہیں ہیں؟''

چنبیلی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، ''فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن کر رہے تھے کہ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ اُنھوں نے چونک کر میری جانب دیکھا، اپنی تلوار اُٹھائی، طفنچہ کمر میں لگایا، گھوڑے پر سوار ہوئے اور مجھ سے کہا دروازہ اندر سے بند ہی رکھنا۔ شاید شہر میں بغاوت ہو گئی ہے۔ آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔'' چنبیلی کا لہجہ فکر مند ہو گیا، ''لیکن وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے ہیں۔''

''شہر کے حالات بہت ابتر ہو گئے ہیں۔'' دینا ناتھ نے دور ہی سے کہا اور پھر وہ بھی اُن کے پاس چلا آیا اور ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا کہنے لگا،'' شہر میں قتل و خون کا بازار گرم ہے چُن چُن کر فرنگی لوگ مارے جا رہے ہیں۔ بازاروں میں لوٹ کھسوٹ، اور جگہ جگہ آگ دہک رہی ہے۔ دلّی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا ہے لیکن ابھی تک امن و امان بحال نہیں ہوا ہے۔''

چنبیلی ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا،'' یا مشکل کشا میرے حیدر کو اپنے حفظ و امان میں رکھیئے، اُن کی واپسی پر گھی کے چراغ جلاؤں گی۔''

تارا بھی فکر مند ہو گئی،'' دیوا تو میرے بھیا کی رکشا کر۔''

اور پھر جیسے ماحول پر سناٹا چھا گیا۔ سب وہاں پر ہوتے ہوئے بھی وہاں پر نہیں تھے۔ اپنے اپنے خیالات کی وادیوں میں حیدر خان کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔

اختر علی کی بیٹھک میں کچھ مجاہدین بیٹھے ہوئے حقّہ گڑگڑا رہے تھے اور سلیم ناشتے کے برتن سمیٹ رہا تھا۔

''اختر بھائی ہم نے میرٹھ کے بعد اگرچہ دلّی پر قبضہ کر لیا ہے لیکن یہ فرنگی اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں۔''

''درست فرما رہے ہیں آپ جمال خان۔'' اختر علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا،'' وہ مختلف مقامات سے اپنے تازہ دم سپاہیوں کو یہاں بلوائیں گے اور پھر ایک بار دلّی پر چڑھائی کریں گے۔''

''ہمیں بھی اس کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا۔'' شیو رام پرساد کی آواز اُبھری''یعنی خان ہمیں بھی مزید فوج کی ضرورت پڑے گی۔''

''فوج آ جائیں گے۔'' اختر علی کی زبان سے نکلا۔

''کہاں سے؟ آسمان سے۔؟'' تیسرے مجاہد نے سب کی آنکھوں میں

جھانکا۔

''آسمان سے نہیں۔'' اختر علی نے کہنا شروع کیا، ''ہمیں بھی دلّی سے باہر نکلنا ہوگا۔ لوگوں کی ذہن سازی کرنا ہوگی۔''

''بہت درست فرمایا آپ نے۔'' خان کے منہ سے دھواں نکلنے لگا، ''کل ہم اس کام کے لیے کچھ لوگوں کو آگرہ اور دیگر مقامات پر روانہ کرتے ہیں۔''

''آگرہ جانے والی ٹکڑی میں میں بھی شامل رہوں گا۔'' اختر علی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ویسے آگرہ، علی گڑھ، بلند شہر، نوشہرہ، اٹاوہ، بریلی، اور شاہ جہاں پور میں ماحول تیار ہے بس اُنھیں فوج میں بدلنا ہوگا۔''

''اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔''

''تو پھر چلیں کام بہت ہے اور وقت بہت کم۔'' خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اور پھر وہ سب دروازے سے باہر نکلے اور اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف بڑھے، اور کچھ ہی لمحوں میں اُن کے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

سلیم نے نیلوفر کی جانب دیکھا۔

''ابا جان فوج میں شامل ہو گئے ہیں سلیم۔''

''تم گھبرا رہی ہو۔۔؟''

''بالکل نہیں۔'' اُس کے لہجے میں نام کو بھی گھبراہٹ نہیں تھی، ''ہمارا دل بھی چاہتا ہے کہ ہم فوج میں بھرتی ہو جائیں اور ان فرنگیوں کو یہاں سے بھگا دیں۔''

''مجھے بھی ان فرنگیوں سے نفرت ہے۔''

''تو کیوں نہ آپ اور ہم چپکے سے فوج میں شامل ہو جائیں۔؟'' نیلوفر کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔

''تم نہیں، تم میدان جنگ میں کیا کرو گی۔؟''

''ہاں۔۔ یہ بات تو ہم نے سوچی ہی نہیں، آپ سچ کہتے ہیں ہمیں نہ تو

بندوق چلانا آتی اور نا ہی تلوار۔'' وہ اُداس ہوگئی۔

سلیم اُس کی جانب شریر نظروں سے دیکھنے لگا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے؟'' نیلوفر کو غصہ آ گیا۔

''ارے آپ تو بنا تلوار کے ہی قتل کر سکتی ہیں۔''

وہ اُس کی طرف جھپٹی لیکن سلیم پھرتی سے پیچھے سرک گیا اور اُسے تنگ کرتا ہوا گویا ہوا،''محترمہ آپ کا کاٹا تو پانی بھی نہ مانگے۔''

نیلوفر کے دماغ میں بجلی سی کوندی اور اُس نے جھٹ سے کہا،'' ہم زخمی سپاہیوں کو پانی تو پلا سکتے ہیں نا۔؟''

'' تب تو ہم بھی فوری زخمی ہو جائیں گے،تم ہمیں بھی پانی پلاؤ گی نا۔؟''

''صرف پانی کی خاطر آپ زخمی ہو جائیں گے سلیم۔؟'' اُس نے نہایت معصومیت سے اُس کی طرف دیکھا تو سلیم کہنے لگا،''تمہارے ہاتھوں کا پانی، پانی نہیں آبِ حیات جو ہوگا۔''

''آپ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں جائیے اب ہم آپ سے کچھ نہیں کہیں گے۔''

سلیم نے اُسے اپنے سینے سے لگالیا،''نیلوفر تم سامنے ہوتی ہو تو طبیعت آپ ہی آپ شوخ ہوتی جاتی ہے ہم کیا کریں۔''

''تو پھر جنگ میں ہم اور آپ الگ الگ محاذوں پر ہونگے۔'' نیلوفر نے اُس کے ماتھے پر محبت سے اُنگلی ماری۔

'' نیلوفر ایک بات کہیں۔؟'' سلیم نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا گویا اجازت طلب کر رہا ہو اور اُس نے آنکھوں کے اشارے ہی سے اُسے اجازت دیدی تو سلیم نے اُس کے کان میں آہستہ سے کہا،''الگ الگ محاذوں پر جا کر جدا رہنے سے بہتر ہے کہ ہم دونوں یہیں پر ساتھ ساتھ رہیں اور۔۔۔''

نیلوفر جھٹکے کے ساتھ اُس کی بانہوں سے نکل گئی، اور بھاگتے ہوئے بالا

خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

سلیم محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر وہ بھی آہستہ آہستہ زینے کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

اور وہ سب بے تحاشہ صدر دروازے کی طرف لپکے۔

دینا ناتھ نے دروازے کی اٹکل کو ہٹایا اور چنبیلی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے حیدر خان کھڑا تھا۔ دینا ناتھ نے اُس کے ہاتھوں میں سے گھوڑے کی لگام لی اور اُسے لے کر اصطبل کی طرف بڑھا۔ حیدر خان نے جیسے ہی تارا کو دیکھا اُس کی چہرا کھل اُٹھا اور تارا اُس سے لپٹ گئی۔

وہ سب دالان میں آ کر بیٹھ گئے۔

حیدر خان نے محبت بھرا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا اور پوچھا ''کہو بہنا میرٹھ میں کیا ہوا۔؟''

''حیدر بھائی زندگی کو اس طرح بلکتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انقلاب کے نام پر انسان ،انسان کو ایسے کاٹ رہا تھا جیسے رسوئی کے لیے سبزی ترکاریاں کاٹی جاتی ہے۔خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ چیخ و پکار ایسی کہ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا اور کسی کے دل میں نام کو رحم نہیں۔؟''

''حیدر بھائی یہ زندگی بھر فوجی نہیں بن سکتی۔لوگ تلوار سے مر رہے تھے،اور یہ مرنے والوں کے احساس سے مسلسل مری جا رہی تھی۔'' دینا ناتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا،'' میں کس طرح انھیں سنبھالتا رہا اور کیسے یہاں تک لایا یہ تو میرا ہی دل جانتا ہے۔''

حیدر خان نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا ،اسکے لہجے میں تارا کے لیے بے پناہ اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا چہرا کھل اُٹھا۔

''حیدر بھائی کیا ہم ایسے ہی خونخوار انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے۔؟'' تارا کے لہجے میں دکھ کے ساتھ عجیب سی بے بسی تھی، ''بے گناہ عورتوں اور بچوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹا جائے۔؟ معصوم بچوں پر کوئی رحم نہ کرے، نظر آتے ہی اُن کی گردن ماردیں؟ کیا ظلم کا بدلہ ظلم ہی ہوسکتا ہے؟ اور بدلہ کس سے لیں؟ بے گناہوں سے؟''

''تارا'' حیدر خان اُسے سمجھانے لگا: ''ہمیں ایسے انقلاب کا انتظار نہیں تھا، لیکن ایسا ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ ہر فاتح مفتوح کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔ یہ فرنگی جو دنیا کے سامنے اپنے آپ کو بڑی مہذب قوم ثابت کرتے ہیں، ان کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے۔ دور کی بات میں نہیں کہتا، لیکن روہیل کھنڈ میں ان لوگوں نے جو ظلم توڑا ہے اُس سے تو چنگیز خان اور ہلاکو کی روحیں بھی شرمندہ ہوگئی ہونگی۔ ہر انسان سوچتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئیے لیکن ہر بار یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ دلی میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔''

''یہی سب کچھ ہو رہا ہے؟'' تارا کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہاں۔'' حیدر خان نے کہنا شروع کیا، ''صبح جیسے ہی گولیوں کی آوازیں آئیں، میں گھوڑے پر سوار ہوا اور باہر نکلا، میرا دل کہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں گے تو جمنا پار ہی سے آئیں گے۔ چنانچہ میں جمنا کی طرف بڑھا، کیا دیکھتا ہوں کہ امیر بحری کی کوٹھی آگ کے شعلوں میں دھواں اُگل رہی ہے اور مجاہدین کا لشکر کشتیوں میں سوار جمنا کے پار اُتر رہا ہے اور ملاح، جوان، پہریدار، چوکی دار، سرکاری نوکر چاکر اپنی جان بچاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔''

حیدر خان ایک لمحے کے لیے چپ ہوگیا۔

سبھی ہمہ تن گوش تھے۔

''اور آپ؟'' دینا ناتھ کی زبان سے نکلا۔

''میں وہیں پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔''

''پھر؟''

''مجاہدین کے لشکر سے چار پانچ گھوڑ سوار سلیم گڑھ کی طرف بڑھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ضرور جھروکے کو نشانہ بنانے جا رہے ہیں۔ میں بھی اُن کے پیچھے ہولیا کہ اگر یہ حضور کو نشانہ بنائیں گے تو میں اُن پر ٹوٹ پڑوں گا!''

''تو کیا حیدر بھائی۔۔؟''

''نہیں نہیں۔۔!'' حیدر خان نے سب کی طرف دیکھا ''میں نے دیکھا کہ وہ جھروکے کے نیچے پہنچ کر حضور کو قاعدے سے سلامی دے رہے تھے۔''

سب کے چہروں پر اطمینان بحال ہو گیا اور حیدر خان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں گویا وہ اُس سارے منظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ رہا ہو۔

حضور پرنور نے اُن کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور پھر حکیم احسن اللہ خان کو طلب فرمایا۔ وہ حاضر ہوا۔ شاہی آداب بجالایا۔

''حکیم احسن اللہ خان!'' حضور کی آواز اُبھری ''دریافت کیا جائے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کس کے ملازم ہیں؟ یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور آخر ہم سے کیا چاہتے ہیں۔''

حکیم احسن اللہ خان نے، ''جو حکم'' کہہ کر شاہی آداب بجالایا اور پھر ثمن برج سے نیچے اُترا اور تسبیح خانے میں پہنچ کر مجاہدین کے سامنے حضور کے سوالات رکھ دیئے۔

وہ آگے بڑھے اور پٹری پر کھڑے ہو گئے اور نہایت ادب کے ساتھ، اُن میں سے ایک نے زبان کھولی، ''حضور بادشاہ سلامت! آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو بائیس صوبوں کا مالک بنایا ہے۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم و فرمانبردار ہے۔ ہم میرٹھ کو فتح کر کے حاضر ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی سرپرستی میں ان فرنگیوں سے جنگ لڑیں اور اُنھیں ہندوستان کے طول و عرض سے

اُکھاڑ پھینکیں اور آپ کی شہنشاہیت پھر سے ایک بار سارے ملک پر بحال ہو جائے۔ اور شانِ مغل لوٹ آئے۔"

حضور بادشاہ سلامت نے ان کی جوشیلی باتیں سنی۔ ایک لمحہ آسمان کی طرف دیکھا، کچھ سوچا، اور پھر گویا ہوئے: "سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولادوں کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میں تو اک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ میرے پاس خزانہ نہیں ہے کہ میں تم کو تنخواہ دے سکوں۔ میرے پاس فوج نہیں ہے کہ میں تمہاری امداد کر پاؤں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے۔ البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرے رہو۔ میں نے صاحب ریسیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ آ چکے ہیں۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

حیدر خان خاموش ہو گیا۔

اور سب نے اُس کی طرف دیکھا۔

"پھر کیا ہوا حیدر خان۔!" چنبیلی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہونا کیا تھا۔؟" حیدر خان گویا ہوا، "ریسیڈنٹ مسٹر سائمن فریزر اور کیپٹن ڈگلس مارے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دلّی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا اور حضور کی شہنشاہی کا اعلان ہو گیا اور اُنھوں نے قیادت منظور کر لی۔ کل دربار ہو گا۔"

"چنبیلی بجّو!" دینا ناتھ نے اُسے مخاطب کیا، "حیدر بھائی کی واپسی پر آپ نے گھی کے چراغ روشن کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اب بتائیے ان فرنگیوں کی غلامی سے نجات ملنے پر کیا کریں گی۔؟"

چنبیلی نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا: "بھیا تب میں اکیلی نہیں، گھر گھر گھی کے چراغ روشن ہوں گے۔۔ بس آپ اُس گھڑی کا انتظار کر لیں۔"

اور سب کے چہرے خوشیوں سے جگمگانے لگے۔۔۔۔۔

☆☆☆

(۱۰)

صبح کاذب آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھی۔ دلبر داد خان کھیت میں کنویں کے کنارے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اُس کی گود میں سر رکھے جینفر سو رہی تھی۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور اُس کے سنہرے بال اُڑ رہے تھے۔ خان نے سامنے دیکھا، دور جھاڑیوں کے اُس طرف سڑک سنسان تھی۔ اُس کی آنکھوں میں رات کا منظر پھر سے ایک بار اُبھر آیا کہ وہ کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ جب جب بھی کسی بستی سے قریب ہوتا بستی کے بیس پر ہی اُسے تلواریں چمکتی ہوئی نظر آتیں اور وہ راستہ بدل دیتا۔ ابھی تک وہ مشکل سے غازی آباد کے قریب قریب ہی پہنچا تھا اور یہاں سے بلند شہر تک جانا آسان نہیں تھا۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کی آندھی شدید ہو گئی تھی اور ایسے ماحول میں جینفر کو بچاتے ہوئے سفر کرنا سخت دشوار ہو رہا تھا۔ وہ کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھا کیونکہ جب وہ ندی کو پار کر رہا تھا تو نیند میں ڈوبی ہوئی جینفر کو سنبھالنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ رات بھی کافی ہو چکی تھی۔ اچانک اُسے چاندنی میں دور ایک کنواں نظر آیا اور اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رات میں عموماً کھیتوں میں کوئی نہیں ہوتا۔ وہ آہستہ آہستہ کنویں کے قریب پہنچا۔ کنویں سے لگ کر ہی گھانس پھونس کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی کٹیا تھی۔ وہ گھوڑے سے نیچے اُترا۔ کٹیا میں جھانک کر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ اُس نے پھر لڑکی کو گھوڑے سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے کہا، ”لالہ کی جان! یہ ہمارا

پڑھی لو، اندر جاؤ۔۔اور سو جاؤ۔''

لڑکی نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا، وہ کٹیا کے اندر گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے باہر آ گئی: ''مین۔۔۔ہم کو اکیلے میں بہت ڈر لگتا ہے۔تم بھی ہمارے ساتھ اندر۔۔۔''

''اوئے ہرگز نہیں۔۔!'' اُس نے سختی سے کہا،''ہم شیطان ملعون کو کوئی بھی موقع نہیں دینا چاہتی۔'' پھر وہ کنویں کی طرف پلٹا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھتا ہوا بولا،''ہم ادھر سے تمہارا حفاظت کرے گی۔''

''ہم کو ابھی تم شیطان سے زیادہ طاقت والا لگتا ہے!'' وہ اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگی،''ہم تمہارے پاس ہی سوئے گا'' اُس نے جمائی لی اور پھر اُس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''اوئے خانم تم بھول گئی، تم ہم کو غنڈہ بولی تھی۔''

اُس نے لیٹے لیٹے ہی اُس کی طرف دیکھا۔اُس کی نیلی نیلی آنکھوں میں اعتماد صاف جھلک رہا تھا،''ہم خانم نہیں۔۔جینفر۔۔۔جینی۔۔۔سمجھا؟''

''جینی۔۔؟'' اُس نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا:''اوئے تم یسوع مسیح کی اُمت سے کب نکلا؟۔۔اور کب جینی ہو گیا۔؟''

''ہم بچپن ہی سے جینی ہے۔'' اُس نے پھر جمائی لی۔

''تم مہاویر جی کا ہو گئی۔؟ یہ تو بڑا گڑبڑ ہو گئی۔''

''کون مہاویر جی۔؟''

''مہاویر جی کو نہیں جانتا پھر بھی جینی ہو گئی۔؟'' خان اُس کے بالوں کو چھیڑنے لگا،''اوئے تم ہمارے محمدؐ صاحب کو جانتی۔؟''

''یس۔۔وہ تمہارا پروفٹ۔۔پیغمبر ہے۔''

''پھر بھی تم محمدی کے بجائے جینی ہو گئی۔؟''

جینفر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا پھر بھی اُس کے گالوں میں دائرے بن

گئے۔اور وہ اپنے آپ میں بڑبڑانے لگا،''ابھی ہم خان بابا کو کیا منہ دکھائے گی۔۔؟''
وہ پریشان ہوگیا۔اُس نے آسمان کی طرف دیکھا،''خان بابا بولی تھی، پسرم! یسوع مسیح کا اُمت میں تم شادی بنا سکتی، لیکن کافر کا تو وہ کبھی بات ہی نہیں بولی تھی۔۔ابھی ہم کیا کرے گی۔۔؟''اُس نے جینفر کی طرف دیکھا لیکن اتنی دیر میں وہ نیند کی پریوں کے ساتھ کہیں دور بہت دور جا چکی تھی۔

دلبر داد خان اپنے آپ سے اُلجھتا رہا اور رات اپنا سفر طئے کرتی رہی۔ حالانکہ وہ خود بھی کافی تھک چکا تھا لیکن لفظ 'جینی' نے اُس کی آنکھوں سے نیندوں کو بھگا دیا تھا۔اُس نے پھر جینی کی طرف دیکھا جو خوف کی اس بھیانک گھڑی میں بھی نہایت سکون سے سو رہی تھی۔

اچانک درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں نے پھڑپھڑانا اور چہچہانا شروع کر دیا۔اُس نے نظریں اوپر کیں، سفیدی تیزی سے زمین پر اُتر رہی تھی۔اُس نے جینی کے گال تھپتھپائے،''اُٹھو خانم۔!دن نکل آئی ہے۔ابھی ادھر سے نکلنا مانگتی۔''

جینی نے نیم آنکھیں کھولیں۔نیند کے خمار نے اُس کے چہرے کو اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔اُس نے اُس کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے نہایت نشیلی آواز میں کہا،''اوہ نو۔۔ہم ابھی اور سونا مانگتا۔''

''اوئے خانم۔جلدی اُٹھو۔۔وہ لوگ ادھر آ گئی تو دونوں کا جان مشکل میں پھنس جائے گی۔''

یہ سنتے ہی جینی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور پھر اُس نے اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی،''اے یسوع مسیح ہمارا مدد کرو۔ ہمارا حفاظت کرو۔''

دلبر داد خان نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا،''اوئے پری جمال۔۔ تمہارا دین بتاؤ؟''

''کرسچیئن۔''وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''پھر یہ جینی کیا ہوتی۔۔؟''

''وہ ہمارے نام کا شارٹ کٹ ہوتی۔''

خان کے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا،'' مطلب۔۔۔؟؟؟''

''جیسا تم کو لوگ دلبر کا بجائے 'دلو' پکار سکتی۔''

''اوہ۔۔۔!'' خوشی کے مارے خان کا منہ بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔'' ہم یہ سمجھی ہی نہیں۔۔۔۔ساری رات پریشان رہی۔خان بابا کا خوف کھاتی رہی۔''اُس نے اپنی پگڑی کو پھاڑ پھاڑ کر اور ڈوریوں سے باندھ باندھ کر ایک طرح سے بُرقعہ بنا دیا اور پھر اُس کو پہنا کر چہرے پر نقاب بھی باندھ دیا،''ابھی تم جینی نہیں۔۔محمدی۔۔محمدی خانم ہو گئی۔''

جینی نے منہ ہی منہ میں کہا،''محمدی۔۔محمدی خانم۔''اور پھر وہ ہنس پڑی۔ اُس نے اُسے پھرتی سے گھوڑے پر سوار کیا اور خود اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔گھوڑا اچل پڑا ۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دونوں کو گدگدا رہی تھیں۔

دلبر داد خان کے چہرے پر عجیب سا اطمینان در آیا تھا۔وہ بے حد خوش تھا۔ اُس نے بھی زیر لب بڑبڑایا، محمدی۔۔محمدی خانم۔۔!اور مستی اُس کے رگ رگ سے پھوٹنے لگی۔گھوڑا ابھی اُس کے رانوں تلے پرند ہو گیا اور فضاؤں میں اُس کی بے سُری آواز پھیلنے لگی۔

دلم در عاشقی آوارہ شد ، آوارہ تر بادا

تنم از بے دلی بیچارہ شد ، بیچارہ تر بادا

بہت دیر تک وہ اپنی ہی ترنگ میں ڈوبا رہا۔جینی اُس کے سامنے تھی۔خوشی کے مارے پھر اُس نے کچھ عجیب سی واہیات آوازیں نکالیں ،جینی مسکرا رہی تھی اور راستہ پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔

''اوئے حورِ بے مثال۔۔!''اُس نے اُسے مخاطب کیا،''ہم پوچھی تمہارے دل میں ہمارے واسطے کوئی جگہ بنی۔۔؟''

جینی نے پلٹ کر نقاب میں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں، ''تمہارا لوگ ہمارا فادر اور مدر کا مرڈر کیا۔ ہمارا کالونی کو آگ لگایا۔ You people have Killed all innocent children and women

اور ابھی تم ہم سے پوچھتا ہے؟ ہمارے دل میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈھتا ہے یہ کبھی بھی نہیں ہوسکتا؟

I hate you and your people اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

خان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اُس نے محبت سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو جینی نے اُس کے ہاتھ کو جھٹک دیا، ''خان ہم پر بہت بُرا ٹائم آ گیا ہے۔

"Thats why I am compromising -"

لیکن خان نے کوئی جواب نہیں دیا بس اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

دربارِ شاہی کو زینت بخشنے کی خاطر حضور بادشاہ سلامت کا جلوس روانہ ہوا۔ سب سے آگے نقار خانہ تھا۔ پھر روشن چوکی تھی۔ اُن کے پیچھے پیادہ سپاہی تھے۔ اُن کی کمروں میں تلواریں لٹک رہی تھیں۔ ہاتھوں میں نیزے تھے۔ زعفرانی پٹیوں کے کمر بند اور سروں پر کھڑکی دار پگڑھیاں تھیں۔ پھر گھوڑ سوار دستہ تھا جن کے گلوں میں سونے چاندی کی ہیکلیں لٹک رہی تھیں۔ ماتھوں پر مرصع کلغیاں تھیں۔ سلمیٰ ستارہ کے کام کی چادریں کاٹھیوں پر جھول رہی تھیں۔ اُن کے پیچھے بادشاہ سلامت کی سواری کا ہاتھی تھا۔ ہاتھی پر سنہری عماری تھی۔ نیچے زربفت کی جھول تھی۔ گلے میں سونے کا ہار تھا۔ ماتھے پر مرصع کلغی اور سونے کی ڈھال تھی۔ عماری میں بادشاہ سلامت تشریف فرما تھے۔ بادشاہ سلامت کے دائیں بائیں شاہی چوبدار تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں مرصع عصاء تھے۔ وہ زرق برق پوشاکیں پہنے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ جب شاہی سواری

دیوان عام تک پہنچی تو چرکنوں نے چاندی مڑی ہوئی سیڑھی لگائی۔ حضور ہاتھی پر سے نیچے اُترے اور دیبا کے سرخ فرش پر قدم رکھتے ہوئے جیسے ہی تخت کے قریب پہنچے سارا دربار، حضور بادشاہ سلامت زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ حضور بادشاہ سلامت تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔

ایک طویل عرصے کے بعد دیوانِ عام میں دربار لگا تھا۔ عجیب سی رونق اور چہل پہل تھی۔ وہاں پر موجود ہر چہرا خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا قسمت نے وقت کے چاک کو اُلٹا گھما دیا ہے اور یہ دربار، دربار بہادر شاہ ثانی نہیں بلکہ دربار اورنگ زیب عالمگیر ہے۔ حضور کے چہرے پر مغل جاہ و جلال چھلک رہا تھا۔ تمام شہزادگان حسب مراتب اپنی اپنی مسندوں پر رونق افروز تھے۔ حضور کے مختلف درباری ،عہدہ دار، مصاحب اپنے اپنے حدود میں موجود تھے۔ میر فتح علی، حکیم احسن اللہ خان، اور حمید خان حضور سے قریب ہی کھڑے تھے۔ لشکرِ مجاہدین کے سربراہ بھی با ادب کھڑے تھے۔

بادشاہ سلامت نے ایک نظر طائرانہ دربار پر ڈالی اور میر عرض کی طرف دیکھا،'' دربار کی کاروائی شروع کی جائے۔''

میرِ عرض نے شاہی آداب بجالائے ،'' حضور کا اقبال بلند رہے! لشکر مجاہدین کے ذمہ دار حاضر ہوں۔''

مجاہدین کی جماعت سے دو شخص آگے بڑھے۔ شاہی آداب بجالائے ،'' حضور کا اقبال بلند ہو۔ غلام ،مجاہدین کا مدعا پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔''

بادشاہ سلامت نے آنکھوں کے اشارہ سے اجازت عطا فرمائی۔

'' حضور بادشاہ سلامت! آج میرٹھ اور دلّی آپ کے اختیارات میں داخل ہو چکے ہیں۔ حضور علمائے دین برسوں سے انگریزوں کے خلاف ماحول سازی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ اپنے مدارس میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرتے رہے ہیں۔ یہ اُن ہی کا کارنامہ ہے کہ آج آپ کی رعایا فرنگیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہے۔

اور وہ دن دور نہیں جب خاندان مغلیہ تیموری و چنگیزی کے جاہ و جلال کا سورج سارے ہندوستان میں چمکے گا۔ آپ کے یہ مجاہدین طئے کر چکے ہیں کہ وطن عزیز کی آزادی کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیں گے۔ ہمیں بس آپ کی سرپرستی درکار ہے۔''

بادشاہ سلامت کے چہرے پر کبھی تو مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور کبھی مایوسی اور بے بسی کے بادل چھا جاتے۔ آپ نے نہایت محبت بھری نظروں سے اپنی رعایا کی طرف دیکھا اور پھر زبان عالی وقار گویا ہوئی، ''میرے عزیز بچو! تمہارا بادشاہ جان و دل سے تمہارے ساتھ ہے۔ لیکن یہ فقیر جسے تم بادشاہ کہتے ہو اس قدر مجبور و بے بس ہے کہ نہ تو اُس کے پاس خزانہ ہے اور نا ہی فوج اور نا ہی جوانی کی نعمت! وہ تمہاری کیا خاک مدد کر سکے گا۔''

''حضور کا اقبال بلند رہے۔'' دوسرے مجاہد نے شاہی آداب پیش کیا اور نہایت ادب کے ساتھ گویا ہوا، ''حضور ہمیں آپ سے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس حضور کی سرپرستی ہی ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔''

تمام رعایا کی آواز ایک ساتھ بلند ہوئی،

ہاں ہاں۔۔۔ حضور ہماری سرپرستی فرمائیں۔

ہاں ہاں۔۔۔ حضور ہماری سرپرستی فرمائیں

ہاں ہاں۔۔۔ حضور ہماری سرپرستی فرمائیں۔

بادشاہ سلامت نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا، اور پھر نہایت پُر عزم لہجے میں فرمایا، ''عزیزو! ہم ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری اس جنگ میں شریک ہیں۔ بلکہ ہر مورچے پر شانہ بشانہ تمہارے ساتھ ہیں۔''

رعایا نے پھر جوش میں نعرے لگانا شروع کیا،

حضور بادشاہ سلامت زندہ باد

حضور بادشاہ سلامت زندہ باد

حضور بادشاہ سلامت زندہ باد

نعروں کے گھن گرج میں بادشاہ سلامت کے چہرے کا جلال اور بھی منور ہو رہا تھا۔

''ولی عہد سلطنت مرزا مغل۔'' بادشاہ سلامت نے شہزادے کی طرف دیکھا، اور شہزادہ اپنی مسند سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، ''حضور کا اقبال بلند رہے۔'' اُس نے شاہی آداب بجالائے۔

''ہم تمھیں منصب سپہ سالاری سے سرفراز کرتے ہیں۔''

مرزا مغل نے سر جھکا کر اس عہدے کو قبول کیا، اور رعایا کی زبان سے نکلا،

صاحب عالم زندہ باد

صاحب عالم زندہ باد

صاحب عالم زندہ باد۔

حضور کے چہرے پر مسرتوں کے انار چھوٹنے لگے۔

''شہزادہ جواں بخت!'' حضور کی آواز پھر اُبھری

اور شہزادہ جواں بخت شاہی تعظیم بجالایا، ''حضور کا اقبال بلند رہے۔''

''ما بدولت تمھیں وزارت سلطنت کا جلیل القدر منصب عطا کرتے ہیں۔''

شہزادے نے سر جھکا کر اپنے منصب کا استقبال کیا۔

میر عرض پھر ایک بار عرضی گزار ہوئے، ''حضور ظل الٰہی۔۔ بلند شہر کے قلعہ مالاگڑھ کے بانی نواب حقدار خان کے نبیرۂ محترم نواب ولی داد خان دربار دودمان تیموری و چنگیزی میں لب کشائی کی اجازت کے طالب ہیں۔''

بادشاہ سلامت نے سر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی۔

اور نواب ولی داد خان نے شاہی آداب بجالائے، ''حضور کا اقبال بلند رہے، قلعہ مالاگڑھ کا یہ غلام حضور کو اپنی ہر طرح کی وفاداری کا یقین دلاتا ہے۔ ہم ہر صورت میں اپنے بادشاہ کے ساتھ ہیں۔ اور ہر ممکنہ تعاون کریں گے۔ سر دست ایک

حقیر سا نذرانہ حاضر ہے۔ اسے قبول فرمائیں۔'' ولی داد خان نے پلٹ کر دیکھا اور تورے پوش سے ڈھکی کشتیاں پیش ہوئیں۔

حضور بادشاہ سلامت نے ایک کشتی سے تورے پوش کو اُٹھایا، وہ اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور پھر حکم صادر ہوا، ''انھیں شاہی خزانے میں جمع کرلیا جائے۔''

شاہی ملازموں نے حکم کی تعمیل کی۔

بادشاہ سلامت ولی داد خان سے مخاطب ہوئے،'' ولی داد خان قلعدار مالا گڑھ! ہم تمہارے جذبات اور تمہاری وفاداری کی قدر کرتے ہیں اور تمھیں دوآبہ کی صوبیداری کی سند عطا کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ انتظامی معاملات میں بھی آپ اپنی وفاداری کی مانند اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے۔''

ولی داد خان نے اپنا سر جھکا دیا۔

''بقیہ عہدے بھی بہت جلد مناسب افراد کو تفویض کر دیئے جائیں گے۔ دربار برخاست۔''

حضور اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

تمام درباری، عہدہ داران، شہزادے بھی کھڑے ہو گئے۔

اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔

اور سب آہستہ آہستہ دیوان عام سے رخصت ہونے لگے۔

نقارے پر زور زور سے چوٹیں پڑ رہی تھیں۔

حیدر خان اور چنبیلی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

پھر فوجیوں کے بلاوے کا بگل بجنے لگا۔

حیدر خان جلدی جلدی فوجی لباس زیب تن کرنے لگا۔

چنبیلی بھی تیار ہونے لگی۔

کانوں میں گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

دالان میں بیٹھی ہوئی تارا نے دینا ناتھ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، اور پھر وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگے۔

وقفے وقفے سے نقاروں پر چوٹ اور بگل کی آوازیں بلند ہوتی رہیں اور کچھ ہی دیر میں حیدر خان اور چنبیلی ہتیاروں سے لیس ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلے تو تارا اور دینا ناتھ کو بھی تیار دیکھ کر حیران ہو گئے۔

حیدر خان نے دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر تارا کے قریب پہنچ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا، ''تارا بہن تم دل کی بہت کمزور ہو۔ جنگ، بے مروت آنکھیں اور بے حس دل مانگتی ہے۔ تم یہیں پر رہو۔ تمہارا یہ بھائی تمہاری طرف سے بھی جنگ میں دو چار ہاتھ زیادہ مار دے گا۔'' پھر اُس نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا، ''دینا ناتھ ہم اپنی اس چھوٹی بہن کو تمہارے بھروسے چھوڑے جا رہے ہیں، اسے امانت سمجھنا، وعدہ کرو کہ اگر جنگ میں ہم کام آ گئے تو تم اسے کبھی ہماری کمی محسوس نہ ہونے دو گے۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں حیدر بھائی؟'' تارا اُس سے لپٹ گئی، ''بھگوان آپ کی رکشا کرے۔ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو یہ بہن بھی زندہ نہیں رہے گی۔''

حیدر خان نے اُسے زور سے لپٹا لیا، ''میری زندگی تو آپ ہی میں ہے بھیا آپ ہیں تو تارا ہے۔''

حیدر خان نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''یہ کیسی جذباتی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔'' چنبیلی نے اپنی بندوق کو کاندھے پر لٹکاتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''ہم مرنے نہیں مارنے جا رہے ہیں۔'' پھر اُس کا رُخ حیدر خان کی طرف ہو گیا، ''چلو خان! فوجیں تیار ہو چکی ہونگی۔''

حیدر خان نے چھریرے بدن کی اونچی پوری چنبیلی کا جائزہ لینا شروع کیا، وہ مردانہ لباس میں غضب ڈھا رہی تھی۔

دینا ناتھ کا چہرا اُتر گیا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار ملتجی نظروں سے حیدر خان کی طرف دیکھا۔

''حیدر بھائی۔۔۔!''

''میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ جنگ جلد ختم نہیں ہوگی۔ تم کو بھی اُس میں شریک ہونا ہے۔ بس آج صبر کرلو اور تارا کا خیال رکھو۔''

دینا ناتھ کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلا

اور وہ دونوں اصطبل کی طرف بڑھے۔ اپنے اپنے گھوڑوں کی لگا میں تھامی اور پھر پلٹ کر ایک بار دیکھا اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

دینا ناتھ نے تارا کی جانب قدم اُٹھایا اور تارا نے گردن جھکا دی، اُن کے کانوں میں گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

مختلف گلیوں سے گھوڑ سوار، پیادے ہتھیاروں سے لیس بگل کی آوازوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر ایک عجیب سے چمک اور قدموں کی رفتار سے اُن کے جوش اور ولولوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ حیدر خان اور چنبیلی نے بھی اپنے گھوڑے اُن کے پیچھے ڈال دیئے۔ اُن کے کانوں میں نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

فوجیں تیار ہو چکی تھیں کیونکہ خبریں ملی تھیں کہ کمپنی بہادر کا لشکر غازی آباد میں ہنڈن ندی کے اُس پار پہنچ چکا ہے اور دلی پر حملے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

مقابلے کے لیے چار چار بیلوں کی گاڑیوں پر توپیں لدی ہوئی تھیں۔ دوسری ہنڈیوں میں گولہ بارود کے تھیلے تھے۔ گھوڑ سوار دستہ کاندھوں پر بندوقیں لگائے اور پیادہ سپاہ ہاتھوں میں نیزے، تلواریں اور بندوقیں لیے چلے جاتے تھے۔

مجاہدین کا یہ لشکر سلیم گڑھ کے نیچے سے ہوتا ہوا دریائے جمنا کا پُل عبور کرتا ہوا شاہدرے کی سڑک پر لگ گیا تھا۔ اُس وقت آسمان میں سورج سر پر آ چکا تھا۔ رمضان کے دن تھے۔ لیکن دھوپ کی شدت سے بے نیاز، دلوں میں سرفروشی کی تمنا

لیے۔ آنکھوں میں فتح و نصرت کا خواب سجائے یہ جیالے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھنے کے لیے سفر پر گامزن تھے۔ آگے آگے نقاروں پر تھاپ پڑتی تھی اور پیچھے پیچھے سپاہی نعرے لگاتے خوشی سے قدم اٹھا رہے تھے۔

حیدر خان کی ڈیوڑھی کے بالائی حصے میں، کمان دار کھڑکی کے چلمن سے لگی ہوئی تارا شہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ شہر پر خوف اور دہشت چھائی ہوئی تھی۔ بچے گھروں میں بند تھے۔ لوگ اب بھی گھوڑوں پر سوار بندوقیں کاندھوں پر لگائے، ہاتھوں میں نیزے لیے ہوئے آوازوں کی سمت دوڑے جا رہے تھے۔

دینا ناتھ زینہ طے کر کے جیسے ہی اوپر آیا سامنے تارا نظر آئی۔ وہ اس قدر محو تھی کہ اسے اس کے آنے کی آہٹ تک سنائی نہ دی۔ دینا ناتھ اس کے قریب پہنچا اور آہستہ سے پوچھا: ''کیا دیکھ رہی ہو تارا؟''

''دلی کے مستقبل کا سپنا۔'' اس نے بھی نہایت آہستہ سے جواب دیا۔

''سپنا تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' تارا نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور وہ جیسے خوابوں میں کہہ رہا تھا، ''ہماری دلی فرنگیوں سے پاک و صاف ہو جائے گی، ہمارے بادشاہ سارے ہندوستان کے بادشاہ کہلوائیں گے، سارے ہتھیار طاقوں میں پہنچ جائیں گے، خوش حالی کا راج ہوگا اور لوگ امن و چین کی بانسری بجائیں گے۔''

تارا کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، ''لیکن دینا ناتھ تمہارا یہ سپنا ساکار ہونے سے پہلے ایک بہت بڑی قربانی مانگتا ہے۔ ہمیں اپنے سپنوں تک پہنچنے کے لیے آگ اور خون کی گنگا جمنا بھی تو پار کرنا پڑے گی۔''

''سچ کہتی ہو۔ آج بڑا معرکہ ہوگا بھگوان مجاہدین کے لشکر کو بھیم کی شکتی اور ہمارے بندوق برداروں کو ارجن کی آنکھ دے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، ''میں بھی تو اس یدھ میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن حیدر بھائی نے تمہاری رکشا کی ذمہ داری

ڈال دی ہے۔''

تارا کے چہرے کی مسکراہٹ طنزیہ ہوگئی،''حیدر بھائی کی ڈیوڑھی سے تو مجھے یم دوت بھی نہیں لے جا سکتا ہے۔اُن کی 'بہن بھگتی' کے رکشا کوچ نے مجھے چاروں اور سے سُرکشت کر دیا ہے۔تم میری چنتا نہ کرو۔تم اگر یدھ پر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔مجھے کوئی ہانی نہیں ہوگی۔''

دیناناتھ کا چہرا کھل اُٹھا اور وہ تیزی سے پلٹا،''میں جا رہا ہوں تارا۔''

تارا نے اُس کی طرف دیکھا لیکن تب تک وہ زینے تک پہنچ چکا تھا اور تیزی سے نیچے اُتر رہا تھا۔تارا بھی اُس کے پیچھے پیچھے نیچے اُتر آئی۔

مجاہدین کے گھوڑے اختر علی کی قیادت میں آگرہ میں داخل ہوئے۔اُن کو دیکھتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلنے لگے اور وہ بھی اُن کے پیچھے جامع مسجد کے میدان کی طرف دوڑنے لگے۔کچھ ہی دیر میں لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ نے اُنھیں گھیر لیا۔

''کہاں سے آئے ہیں آپ لوگ۔؟'' ایک سوال اُبھرا۔

''دلّی سے۔''

''دلّی سے۔۔؟''ایک عمر رسیدہ شخص اُن کے بالکل قریب پہنچ گیا،''بھائی دلّی کا احوال سنائیں۔''

''میرٹھ کے بعد مجاہدین نے دلّی کو بھی فتح کر لیا ہے اور ہمارے حضور کی حکومت۔۔''

اختر علی کی زبان سے ابھی پورے الفاظ بھی ادا نہیں ہوئے تھے کہ مجمع زور زور سے نعرے لگانے لگا۔۔،نعرۂ تکبیر اللہ و اکبر۔نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔۔۔۔۔۔

اختر علی نے اپنا ہاتھ بلند کیا،''لیکن بھائیو!میری بات غور سے سنو!فتح کرنا

آسان ہے لیکن فتح کو قائم رکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔''

لوگ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

''تو کیا فرنگی پھر سے اُس پر قابض ہو جائیں گے۔؟''

''وہ تو کوشش کریں گے ہی، لیکن ہمیں اُن کو ناکام بنانا ہے۔'' اختر علی نے اُن سب کی طرف دیکھا، ''آپ بھی تو یہی چاہتے ہونگے نا۔؟''

بھیڑ نے پھر ایک بار اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور زور سے نعرہ لگایا۔ اُن کی آواز آسمانوں تک پہنچ گئی۔ اختر علی نے کہنا شروع کیا، ''اس فتح کو قائم رکھنے کے لیے فوج، ہتھیار اور روپیوں کی ضرورت پڑے گی۔''

''ہم سب ہر طرح سے تیار ہیں۔'' مجمع میں سے ایک آواز اُبھری۔

''بھائیو! صرف ایک آواز سے ان فرنگیوں کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' خان نے اپنا ہاتھ بلند کیا، ''ہمیں آپ سب کی تائید چاہیے۔''

اور پھر پورا مجمع ایک ساتھ چیخ اُٹھا، ''ہاں ہاں ہم سب تیار ہیں۔''

اختر علی نے پھر کہنا شروع کیا، ''بھائیو! ہمارا مقصد صرف دلّی سے ہی ان فرنگیوں کو نکالنا نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کے سارے ہندوستان سے اُن کا صفایا ہو جائے۔ اس لیے ہم آپ کے درمیان آئے ہیں۔ آپ تمام کو نہ صرف متحد ہو کر ان فرنگیوں کے ظلم کا حساب چکانا ہے بلکہ اُن سے جنگ بھی لڑنا ہے۔ اور اپنے ملک کو آزاد کرانا ہے۔''

ایک آواز اُبھری، دلّی چلو۔

اور یہ آواز سب کی زبان بن گئی، سارا میدان جذباتی نعروں سے گونج اُٹھا۔

ہنڈن ندی کے اُس پار انگریزوں کا لشکر تھا۔ انھوں نے توپوں کی قطار کو بلندی پر جما دیا تھا سامنے بندوق بردار تھے اور بندوق برداروں کے دائیں بائیں گھوڑ

سوار دستے تھے۔ درمیان میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کی گہرائی کے ساتھ ندی بہہ رہی تھی۔

مجاہدین نے بھی اپنے لشکر کو آراستہ کیا۔ سامنے توپ خانہ سجا دیا اور توپ خانے کے دائیں بائیں پیادے بندوق بردار تھے اور اُن کے دونوں طرف گھوڑ سوار دستے تعینات تھے۔

''کیا ہمیں حملے کے لیے انگریزوں کا انتظار کرنا چاہیے۔؟''

''بالکل نہیں۔'' حیدر خان نے جواب دیا،''اس وقت اُن کے حوصلے پست ہیں۔ایک کرارا حملہ ہی اُن کے قدم اُکھاڑنے کے لیے کافی ہوگا''

ابھی کوئی فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مجاہدین کے توپچیوں نے گولے داغنا شروع کر دیے۔ انگریز اس اچانک حملے سے گھبرا گئے۔ اور فوراً اپنے توپ خانہ کی جانب دوڑے اور توپیں چلانے کا حکم دینے لگے۔ ان کے توپچی ابھی توپوں میں گولے ہی بھر رہے تھے کہ ایک دم مجاہدین کے پیادے بندوق بردار سامنے آ گئے۔ اُنھوں نے فوراً پوزیشن لی اور توپچیوں کا نشانہ باندھ کر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ انگریزوں کے کئی توپچی موت کے گھاٹ اُتر گئے اور بہت سارے، زخمی ہوکر نیچے گرے۔ اُن کے کپتان نے فوراً بندوق برداروں کو حکم دیا کہ وہ جواب دیں لیکن مجاہدین کی جانب سے گولیوں کی برسات ہو رہی تھی۔ وہ پوزیشن بھی نہ لے پائے تھے کہ لقمہ اجل ہو گئے۔

مجاہدین کے گھوڑ سوار دستوں نے جب یہ نقشہ دیکھا تو اُنھوں نے گھوڑوں کو آگے بڑھا دیا اور اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے اپنے گھوڑوں کو ندی میں اُتار دیا۔ دوسری طرف اُن کا توپ خانہ مسلسل اپنا کام کیے جا رہا تھا۔

انگریز منتشر ہونے لگے۔تلوار باز دستہ پوری قوت کے ساتھ اُن کی طرف لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لد گئے۔انگریز سپاہی پھر ایک بار اپنے توپ خانے کی طرف بڑھے لیکن جو بھی نشانے پر آیا اُس کی لاش ہی گری۔ زبردست رن پڑا۔حیدر خان اور اُس کے ساتھیوں کے گھوڑے دوڑتے ہوئے انگریزوں کے لشکر پر

ٹوٹ پڑے۔ وہ اُن کی صفیں چیرتے ہوئے اندر تک داخل ہو گئے۔ حیدر خان نے نیزہ سنبھالا اور ایک کے بعد ایک کئی دشمن کے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا چلا گیا۔ اس کے بالکل پیچھے چینبیلی کی بندوق پے در پے فائر کر رہی تھی۔ جو بھی انگریز حیدر خان کی طرف بڑھتا، چینبیلی کی گولی اُس کے سینے کے پار اُتر جاتی۔

مجاہدین نہایت شدید حملے پر حملہ کر رہے تھے۔

تلواریں چل رہی تھیں۔

بندوقیں گولیاں اگل رہی تھیں۔

توپوں کے دہانوں سے مسلسل گولے برس رہے تھے۔

انگریزوں کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ اپنی جان بچا کر بے تحاشہ بھاگنے لگے تھے۔

گھوڑ سوار اُن کے تعاقب میں نکل پڑے۔

نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کی آوازوں سے ہنڈن ندی کا سارا علاقہ گونج اٹھا صرف تین گھنٹوں کی جنگ نے انگریزوں کو شکستِ فاش دے دی تھی اور وہ میدان سے فرار ہو گئے۔

مجاہدین نے اُن کی توپوں پر، گولہ بارود پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ بے شمار بندوقیں، گھوڑے، اور بہت سارا جنگی اسلحہ بھی ہاتھ آ گیا۔ ضبط شدہ سامان بیل بنڈیوں پر لادا جانے لگا۔ اور اُسے دلّی کی طرف روانہ کرنے کا کام شروع ہو گیا اور فاتح مجاہدین فتح کا رزمیہ پڑھتے ہوئے دلّی کی طرف روانہ ہوئے۔

سورج ڈھل رہا تھا۔

حیدر خان ڈھلتے سورج کا نظارہ کر رہا تھا کہ چینبیلی اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اُس کے پاس پہنچی اور کہنے لگی، ''حیدر خان یہ ڈھلتا ہوا سورج اشارہ دے رہا ہے کہ اب انگریزی راج کا سورج بھی ڈھلنے کو ہے۔''

حیدر خان نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا، ''ہاں! لیکن ابھی ہم نے انھیں

صرف ہنڈن ندی کے اُس پار ہی بھیجا ہے۔ اُنھیں تو سمندر پار بھیجنا ہے۔''

چنبیلی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اُس کے کانوں میں نعرۂ تکبیر کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

تارا بالا خانے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ سڑک پر جنگ سے واپس آنے والے سپاہی گھوڑوں پر سوار، پا پیادہ، کچھ زخمی، کچھ تھکے ماندے لوٹ رہے تھے۔ تب ہی اُس کی نظریں ایک گھوڑے پر جم گئیں۔ سوار گھوڑے کی گردن پر جھکا ہوا تھا، اور گھوڑا اپنے سوار کو لیے آہستہ آہستہ ڈیوڑھی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ تارا نے اُسے فوراً پہچان لیا، وہ دینا ناتھ ہی تھا۔ وہ فوراً زینے کی طرف دوڑی اور بے تابانہ سیڑھیاں اُترتی ہوئی صدر دروازے تک پہنچی۔ دروازہ جیسے ہی کھولا، سامنے دینا ناتھ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر لگام تھامی اور اُسے اندر لیا۔ دینا ناتھ کے دونوں بازو زخمی تھے۔ اُس نے اُسے تھپتھپایا تو دینا ناتھ نے آنکھیں کھولیں۔ تارا نے اُسے نیچے اُترنے میں مدد کی اور پھر سہارا دے کر اُسے اُس کے کمرے تک پہنچا دیا۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا۔ تکلیف سے اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ تارا فوراً باورچی خانہ پہنچی اور زخموں کو دھونے کی خاطر پانی گرم کرنے لگی۔ تبھی اچانک اُس کے ذہن میں حیدر خان اور چنبیلی کا خیال کسی بجلی کے کوندے کی مانند لپکا اور وہ دوڑتی ہوئی دینا ناتھ کے پاس پہنچی، ''دینا ناتھ!'' اُس نے آواز دی، دینا ناتھ نے آنکھیں کھولیں اور اُس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

''حیدر بھائی اور چنبیلی۔۔۔؟''

دینا ناتھ نے بمشکل اُس کی طرف دیکھا، ''زخمی ہونے سے پہلے حیدر بھائی کو دیکھا تھا، وہ نہایت بے جگری سے لڑتے ہوئے فرنگیوں کے بائیں بازو والی ٹکڑی پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اُن کے پیچھے چنبیلی بھی تھی۔ اس کے بعد پھر وہ مجھے دکھائی نہیں

دیئے۔''

''لیکن وہ۔۔؟'' تارا اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

''یہ تو بھگوان ہی جانتا ہے۔'' دینا ناتھ نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

تارا کی آنکھوں میں آنسوں اُمڈ آئے۔ عجیب عجیب سے وسوسے اُسے پریشان کرنے لگے۔ وہ دل ہی دل میں اُن کی خیر خوبی سے واپسی کے لیے دُعائیں مانگنے لگی۔ دینا ناتھ کے لبوں سے ایک لمبی کراہ نکلی اور وہ اُس کے زخموں پر سے پٹیاں کھولنے لگی۔ زخم گہرے تھے۔ دینا ناتھ تکلیف سے کراہنے لگا۔

وہ پھر ایک بار باورچی خانہ پہنچی۔ گرم پانی لیا اور اپنے دوپٹے سے چروٹی پھاڑ کر اُس کے زخم صاف کرنے لگی۔

شہر میں فاتح مجاہدین اپنی جیت کا جشن منا رہے تھے۔ انگریزوں کے ضبط شدہ اسلحہ کی نمائش کر رہے تھے۔ ڈھول اور تاشے بج رہے تھے۔ سپاہی اور عام شہری خوشی سے تھرک رہے تھے۔ گا رہے تھے۔

دشمن بھاگا رے

نیا سویرا آیا رے

تیغ اُٹھی

بندوق چلی

دشمن بھاگا رے

نیا سویرا آیا رے

تلوار اُٹھی

توپ چلی

دشمن بھاگا رے

نیا سویرا آیا رے

آنکھ اُٹھی

بجلی گری

دشمن بھاگا رے

نیا سویرا آیا رے

ناچ اور گانے کے درمیان کچھ منچلے ہوا میں گولیاں بھی داغ رہے تھے۔ پردہ دار خواتین چلمنوں کی اوٹ سے نظارہ کر رہی تھیں اور بچے حیرت سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔

دینا ناتھ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ زخموں پر دوائی لگ چکی تھی۔ تارا نے پھر سے صاف ستھری پٹیاں باندھ دی تھیں۔ اُس نے اُسے ممنونیت کی نظروں سے دیکھا تو تارا نے پوچھا،''دینا ناتھ یہ تو بتائیں تم اتنے زخمی کیسے ہو گئے۔؟''

''تارا۔''اُس نے ایک لمحہ آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے منظر کو آنکھوں میں بھر رہا ہو اور پھر کہنا شروع کیا،''میں بھی حیدر بھائی کی طرح لڑتا بھڑتا فرنگیوں کے بیچ چلا گیا تھا۔ میری تلوار کی کاٹ کے آگے کوئی نہ ٹھہرتا تھا، جو بھی آتا مارا جاتا۔ تبھی کسی نے میری تلوار پر ایسا وار کیا کہ وہ دور جا گری۔ اب فرنگی مجھے مارنے کے لیے دوڑے اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں اب نہیں بچ سکوں گا۔ تبھی کسی نے اُن پر گولیاں برسائیں اور وہ ایک کے بعد ایک زمین پر گرنے لگے ٹھیک اُسی وقت ہی کسی نیزہ باز نے میرے دائیں بازو کو چھید دیا۔ میں درد سے چلاّ ہی رہا تھا کہ دوسرا نیزہ میرے بائیں بازو کو چھیل گیا۔ میں گھوڑے کی گردن پر جھول گیا۔ پھر میرا گھوڑا کیسے پلٹا اور میں کیسے مجاہدین کے کیمپ تک پہنچا، مجھے کچھ بھی یاد نہیں، لیکن جب میں نے آنکھ کھولی تو تم دکھائی دیں، اور تم نے مجھ پر بڑا اُپکار کیا ہے۔ تم۔۔''

''دینا ناتھ۔''تارا نے اُس کی بات کاٹی،''ہم نے کیا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ دیکھا جائے تو تمہارے زخمی ہونے کا کارن بھی ہم ہی تو ہیں۔''

دیناناتھ نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''حیدر بھائی نے تو تم کو منع کیا تھا، ہم بھی اگر تم کو روک لیتے تو تم کیوں زخمی ہوتے۔؟''

دیناناتھ مسکرانے لگا تھا۔

ٹھیک اُسی وقت صدر دروازے کی زنجیر زور زور سے بجنے لگی اور تارا پھر ایک بار دروازے کی طرف دوڑی۔

اُس کے سامنے حیدر خان اور چنبیلی کھڑے تھے۔ تارا فوراً حیدر خان سے لپٹ گئی، اور اُس کے ہاتھ اُس کے بدن پر زخموں کو تلاش کرنے لگے۔

''پگلی مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔''

''ارے ہمیں تو معمولی خراش تک نہیں آئی۔'' چنبیلی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ تینوں اندر داخل ہوئے اور حیدر خان دونوں گھوڑوں کو لیے اصطبل کی طرف بڑھا۔

''تارا بہن! آج تو جنگ میں خوب مزہ آیا۔'' چنبیلی نے چلتے چلتے کہنا شروع کیا۔'' تمہارے بھیا کے سنگ میں نے بھی وہ ہاتھ دکھائے کہ فرنگیوں کے قدم اُکھڑ گئے اور فتح ہم اُٹھا لائے۔''

تارا نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''اگلی جنگ میں تم بھی شریک ہوں گی نا۔؟''

''ہاں۔'' تارا نے آہستہ سے کہا۔

''تارا بہادر بنو۔۔۔کل تم بھی چاند بی بی کہلائیں گی۔''

''چاند بی بی۔'' اُس نے آہستہ سے دوہرایا، اور اُس کے ذہن میں دکن اُبھر آیا۔ بہت دنوں کے بعد یاد کی کوئی چنگاری اُس کے دل میں سلگ اُٹھی اور ماضی کے دریچے آپ ہی آپ وا ہونے لگے۔ وہ چنبیلی کے ساتھ چپ چاپ قدم اُٹھا رہی تھی اور یادوں کے انار اُس کے دل میں چھوٹ رہے تھے۔ وہ اُس وقت چونکی جب

دینا ناتھ کے کراہنے کی آوازیں اُس کے کانوں سے ٹکرائیں۔

''دینا ناتھ کی مرہم پٹی ہو گئی۔؟'' چنبیلی نے ایک دم تارا سے سوال کیا۔

''آپ جانتی ہیں کہ وہ زخمی۔۔!''

''اری ہنو۔۔ میں نے ہی تو اُسے بچایا ہے۔'' اُس نے کہنا شروع کیا، ''اگر میں ٹھیک وقت پر نہ پہنچتی اور میری بندوق کی گولیاں نہ چلتیں تو آج وہ یہاں پر واپس نہ آتا۔''

پھر اُس نے آواز دی، ''دینا ناتھ۔'' اور سیدھا اُس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ دینا ناتھ مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ اُٹھنے لگا۔ چنبیلی اُسے منع کرتے ہی رہ گئی لیکن وہ اُٹھ بیٹھا۔

''آپ کہنا مانتے ہی نہیں''

دینا ناتھ نے شرمندگی سے گردن جھکا دی۔

اتنی دیر میں حیدر خان بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اُس کی مسہری پر بیٹھ گیا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا، ''دینا ناتھ۔۔ زیادہ تکلیف ہو رہی ہو تو ہم حکیم فضل الحق کے مطب چلتے ہیں۔ اُن کی دوائی سے بہت جلد فائدہ ہو جاتا ہے۔''

''تارا نے مرہم پٹی کر دی ہے۔ اب ٹھیک ہوں۔'' دینا ناتھ نے آہستہ سے کہا، ''کل جائیں گے۔''

حیدر خان نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا، اُس کے سر پر پھر ایک بار محبت سے ہاتھ پھیرا اور پھر تارا سے مخاطب ہوا، ''بہنا ہم ابھی منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ جب تک تم دستر لگاؤ۔۔ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔''

وہ دونوں حمام کی طرف بڑھے اور تارا دالان میں دسترخوان بچھانے لگی۔

رات اگر چہ ابھی زیادہ نہیں گزری تھی لیکن پھر بھی حالات ایسے ہو گئے تھے کہ لوگ جلد از جلد اپنے گھروں میں مقفل ہونے لگے تھے، اور سڑکیں سنسان رہنے

لگیں تھی۔ نیلوفر نے باہری دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور اوپر نظریں کیں تو نیم کی شاخوں سے چاند مسکرا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندی صحن میں چھن چھن کر پھیل رہی تھی۔ یہ سہانا پن اُسے بے حد بھلا معلوم ہوا۔ وہ ٹہلنے لگی تھی کہ اچانک اُس کی نظریں بیٹھک کی طرف اُٹھ گئیں اور اُسے اُس کے ابا جان یاد آ گئے۔ وہ سوچنے لگی پتہ نہیں وہ اس وقت کس مقام پر ہونگے؟ جب سے ابا جان گئے ہیں چچی جان اُس کے ہی پاس ہیں۔ وہ جلد سونے کی عادی ہیں۔ ذرا رات نے کروٹ بدلی اور وہ گہری نیند میں پہنچ جاتی ہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک اُس کے ذہن میں سلیم اُبھر آیا۔۔ بیچارہ۔۔ چچی جان کی موجودگی میں اُسے مجھے چھیڑنے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہے اور میں بھی تو اُسے کوئی موقع نہیں دے رہی ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں اُس کا بے بس چہرا گھوم گیا اور اُسے ہنسی آ گئی۔ وہ صحن سے دالان کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ اُسے دیوار پر کسی کا سایہ دکھائی دیا۔ وہ وہیں رُک گئی۔ اُس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ سلیم ہی تھا جو بہت احتیاط سے نیچے اُتر رہا تھا اور جیسے ہی اُس نے زمین پر قدم رکھا نیلوفر کی سرگوشی سنائی دی، ''آپ کو شرم نہ آئی اپنے ہی چچا کے گھر کی دیواریں پھاندتے ہوئے۔؟''

سلیم نے اُس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا، ''دیوار کے اُس طرف اگر چچیری بہن ہو، تو یہ دیوار تو کیا میں دیوارِ چین بھی پھلانگ سکتا ہوں۔''

نیلوفر نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھی اور اُسے آہستہ کہنے کا اشارہ کیا۔

''امّی جان سو گئیں۔؟''

''وہ۔۔؟'' نیلوفر نے دیدے مٹکائے، ''آپ کی والدہ ہیں اور آپ ہی کی طرح رات تمام جاگتی رہتی ہیں۔''

''تم بدتمیزی پر اُتر آئی ہو۔'' اُس نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''لو ہم نے ایسی کیا بات کہی ہے۔؟''

''تم نے ہم دونوں کو اُلّو کہا ہے۔''

''اچھا میاں جی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ ہم اپنے کہے ہوئے الفاظ میں

سے چچی جان کو نکالے لیتے ہیں۔ اب تو خوش ہو نا۔'' نیلوفر کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔ اُس کی اس ادا پر سلیم کو پیار آ گیا اور اُس نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پھر بہت دھیمی آواز میں کہنے لگا، '' سچ کہنا نیلوفر۔۔۔ تم میرا ہی انتظار کر رہی تھیں نا۔؟''

''ہاں۔ الیکن دیوار سے آیا ایک چور۔''

''چور؟'' سلیم نے اُسے زور سے بھینچا اور پھر اُس کے کان میں سرگوشی کی، '' آپ ہمیں کس روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں۔؟''

نیلوفر سوچنے لگیں، '' آں ں ں ں ایک بانکے فوجی کے روپ میں۔'' وہ جھٹ سے بولی۔

''لاحول ولاقوۃ۔۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تم کہو گی۔ دولہا کے روپ میں۔'' نیلوفر تیزی سے اُس کی بانہوں میں سے نکل گئی، '' آپ تو بس ہر دم بلّی کی طرح خواب دیکھتے ہیں۔''

''اور تم۔۔ تم کیا کرتی ہو۔؟''

''ہم آپ کی طرح بے وقوف نہیں ہیں۔''

''یہ بات کسی اور کے سامنے نہ کہیں، لوگ ہنسیں گے۔''

''اب جایئے بھی نا، چچی جان جاگ جائیں گی۔''

''بس ایک بار۔۔'' وہ اُس کی طرف جھپٹا اور نیلوفر تیزی سے پیچھے سرک گئی اور اُسے انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہنے لگی، '' میاں جی کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔''

''نیلوفر۔'' اُس نے اُسے پھر ایک بار جھپٹ لیا اور زور سے بھینچ کر بولا، '' ہم وہ ہیں جو ہنڈیا کو بھی چڑھائیں گے اور ہنڈیا والی پر بھی قابو پالیں گے۔''

''جی۔'' نیلوفر نے ایک ادائے خاص سے کہا، '' آپ کے چچا غالب نے غالباً آپ ہی کے لیے کہا ہے کہ دل کہ بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔''

سلیم نے اپنے لب اُس کے رُخسار پر رکھ دیئے، '' چچا غالب کہیں یا چچا اختر

علی، بیوی تو تم کو میری ہی بننا ہے۔"

نیلوفر پھر اُس کے بانہوں سے نکل گئی "جانے نا اب۔"

"پہلے ایک بار کہہ دیں۔"

"کیا کہہ دیں۔؟"

"وہی جو ابھی ابھی ہم نے کہا ہے۔"

"وہ تو ہم نہ کہیں گے۔"

"تو پھر ہم بھی یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"چچی جان۔!" نیلوفر نے قدرے زور سے آواز نکالی اور سلیم سٹپٹا گیا "ارے جاتے ہیں جاتے ہیں۔۔۔ہونہہ۔۔ بڑی آئیں چچی جان والی۔"

اُس نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی اور اُس کا ہاتھ پھسل گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ نیلوفر کو ہنسی آ گئی۔

"ارے میری مدد تو کریں۔" وہ دانت پیسنے لگا۔

نیلوفر نے ہنستے ہنستے کہا "دیوار کے اس طرف کھڑی ہوئی کسی چچیری بہن نے کبھی اپنے چچیرے بھائی کو اس طرح بھاگنے میں مدد بھی کی ہے۔؟"

سلیم کسی طرح دیوار پر چڑھ گیا اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑانے لگا "کچھ دن عیش کر لیں پھر دیکھتے ہیں دیوار کے اُس طرف سے اس طرف تم کیسے آ پائیں گی۔"

نیلوفر نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیئے اور سلیم کو انگوٹھے دکھانے لگی اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہنسے بھی جا رہی تھی۔

☆☆☆

(۱۱)

دلبر داد خان ابھی بھی بلند شہر سے بہت دور تھا۔ انقلاب کا جوش اور انگریزوں سے بڑھتی ہوئی نفرت دیہات دیہات پہنچ گئی تھی۔ جہاں بھی کوئی انگریز نظر آتا وہ مارا جاتا۔ ایسے حالات میں جینفر کے ساتھ کسی بستی سے گزرنا تقریباً ناممکن ہی ہو گیا تھا۔ وہ غازی آباد بھی نہیں گیا۔ بلکہ اُس کا گھوڑا جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ وہ مختلف تنگ پہاڑی راستے طے کرتا ہوا ایک ایسے جنگل میں پہنچ گیا جہاں کوئی ڈر نہ تھا۔

وہ دونوں ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں آرام کر رہے تھے۔ جینفر نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگی، ''خان! ہم اِس طرح کب تک بھٹکتا رہے گا۔؟''

''یہ تو ہم بھی نہیں جانتی۔'' دلبر داد خان کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اس طرح ڈیلی مرنے سے تو اچھا تھا کہ ہم اُدھر میرٹھ ہی میں مر جاتا۔'' اُس کی آواز میں شدید مایوسی تھی اور پھر وہ زمین کریدنے لگی۔

''جینی۔'' خان اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس کے قریب اُکڑوں بیٹھتا ہوا بولا، ''ایسا مایوسی کا بات نہیں کرتی۔۔ ہم تم کو مرنے کے واسطے نہیں بچائی، ہم پر بھروسہ رکھو فرنگی بلبل، ہم تمہارا حفاظت کرے گی۔''

''اوہ شِٹ۔۔۔ لیکن کب تک؟'' وہ سینے کے بل لیٹی ہوئی تھی۔۔ اُس نے اپنا سر اوپر اُٹھایا، ''خان یہ آگ بجھنے والا نہیں۔''

خان نے اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا،''خانم اگر ہم دکن کی طرف نکل گئی تو اُدھر امن ہوتی۔ ہم دکن جائینگی۔''

''دکن۔'' اُس نے آسمان کی طرف دیکھا،''دکن میں اس جنم میں پہنچنا ایک دم امپاسیبل ہے مین۔ کوئی اور بات سوچو۔''

''ایک ترکیب ہے۔ تم بھی نہیں مرے گی اور ہم بھی گناہ گار نہیں ہوں گی!''

خان کا سوال اُس کی نظروں میں جھانکنے لگا۔

''تم سے شادی بنا کر، تمہارا دین کا کلمہ پڑھ کر۔ اوہ نو۔۔ نیور۔۔ جینی مر جائے گا بٹ یہ سودا نہیں کرے گا۔''

خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جینی پھر ایک بار زمین کریدنے لگی۔ اوپر سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

''پھر ہم ایک کام کرتی۔''

''کیسا کام۔'' جینی بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ہم تم کو کسی طرح تمہارا فوجی کیمپ تک پہنچا دیتی۔!''

جینفر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے کچھ سوچا،''بٹ خان۔۔ اُس میں تمہارا جان کو خطرہ ہو سکتی۔'' وہ اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئی۔ دلبر داد خان نے اُس کی آنکھوں میں کہیں اپنائیت کو محسوس کیا اور پھر آہستہ سے کہا،'' گلبدن! تم ہمارا پرواہ مت کرو۔ تم اپنے لوگ میں پہنچ جائے گی تو خوش ہو جائے گی۔ تم کو خوش دیکھ کے ہم بھی خوش ہو جائے گی۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے خان کی آواز گہرے غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جینفر نے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا،''لِسن خان۔۔ نو ڈاؤٹ ہم تم سے کبھی بھی پیار نہیں کر سکتا۔ بٹ تمہارا احسان بھی نہیں بھول سکتا۔ ہم تم کو کیسے موت کے حوالے کر سکتا۔؟''

''تو بولو۔۔ ابھی ہم کیا کر سکتی؟'' خان نے لاچاری سے اُس کی طرف

دیکھا،'' ہم کو بتاؤ''۔

جینفر نے کچھ فاصلے پر بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھا، ''ابھی ہم اُس میں باتھ کرے گی۔۔ چلو اُدھر۔!''

''باتھ۔۔؟'' خان نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اوہ۔۔اُدھر نہائے گا۔۔چلو۔''

''ہم۔۔ہم۔۔!'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''اوہ یس۔۔تم بھی نہالو۔۔'' اور پھر وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ندی کی طرف دوڑنے لگی۔

خان کے دماغ میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ندی کے پاس پہنچے۔جینفر نے بلندی سے جھک کر ندی کو دیکھا۔شفاف پانی پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے چاندی کے فرش پر ہیرے جگمگا رہے ہوں۔ وہ خان سے دو قدم آگے بڑھی اور پھر اُس کی طرف پلٹ کر کہنے لگی، ''خان! ابھی سویمنگ ڈریس تو نہیں ہے۔ بٹ نیچرل ڈریس میں بھی باتھ کرنا اچھا لگتا ہے۔۔'' اور پھر وہ اپنے اسکرٹ کا بیلٹ کھولنے لگی۔خان فوراً پیٹھ پلٹا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اُس کا قہقہہ سنائی دیا۔اُس کے بدن پر سے ایک ایک کپڑا اُتر رہا تھا اور خان کے بدن میں خون کی گردش بڑھنے لگی تھی۔ پھر اُس نے زور سے اُسے آواز دی، ''خان۔۔!''

اور خان جیسے ہی پلٹا سنگِ مرمر کے مجسمے نے فوراً پانی میں چھلانگ لگا دی۔ خان اُسے دیکھتا رہ گیا۔وہ پانی میں مختلف زاویوں سے غوطے لگا رہی تھی۔اُس کے بدن کا ایک ایک حصہ نمایاں ہوتا جاتا اور پھر پانی میں ڈوب جاتا۔ جیسے لمحہ بھر کے لیے بجلی کوندتی، روشنی کا جھماکہ ہوتا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

وہ بہت دیر تک غوطے لگاتی رہی اور خان کے بدن کا گھوڑا بار بار بے قابو ہوتا رہا اور وہ پوری قوت سے اُس کی باگ کھینچتا رہا۔

''خان۔۔!'' اُس نے پھر آواز دی، ''کم آن۔۔ پانی میں آجاؤ۔''

خان نے اُس کی طرف دیکھا۔خوبصورت سُنہری مچھلی نے سر کے بل پانی میں غوطہ لگایا اور آگ پانی کے بجائے خان کے پورے بدن کو جھلسا گئی۔اُس نے اپنا کرتا اُتارا اور ندی میں کود گیا۔

پانی زور سے اُچھلا۔

اور پھر آگ اور پانی ایک دوسرے کی طرف لپکنے لگے۔

اختر علی اپنے دوستوں کے ساتھ مختلف مقامات پر ماحول سازی کرتے ہوئے جیسے ہی مین پوری پہنچے تو وہاں بھی اُن کا شاندار استقبال ہوا۔وہاں پر تو پہلے ہی سے لوہا گرم ہو چکا تھا۔اور لوگ انگریزوں کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔مین پوری انگریزوں سے پاک ہو چکا تھا۔اور مجاہدین سر سے کفن باندھے دلّی کی طرف جا رہے تھے۔

اختر علی اور اُن کے ساتھی اگلے پڑاو پر نکلنے سے پہلے ایک سرائے میں پہنچے تھے اور اُن کی ملاقات مولوی کریم الدین سے ہوئی جو ابھی دلّی سے یہاں پہنچے تھے۔دلّی میں اُن کا چھاپا خانہ تھا۔اختر علی نے اُن سے پوچھا،''مولوی صاحب دلّی کے کیا حالات ہیں۔؟''

کریم الدین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی،''اب فرنگی اپنے وطن لوٹ جائیں یہی اُن کے لیے بہتر ہے۔''

اختر علی اپنی خوشی کو دبا نہ سکے،''مولوی صاحب تفصیل سے بتائیں۔''

کریم الدین نے کہنا شروع کیا،''دلّی میں مجاہدین پے در پے فرنگیوں کو شکست پر شکست دے رہے ہیں۔''

''نئی کمک بھی تو پہنچ رہی ہونگی۔؟''خان نے سوال کیا۔

''خان صاحب گوڑگاؤں میں جو پلٹن تھی اس نے بھی بغاوت کر دی۔اپنے افسروں کو قتل کر دیا۔خزانے پر قبضہ کر لیا اور دلّی میں داخل ہو گئے۔''

''یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے۔''اختر علی کا تجسس بڑھ گیا،''اور۔۔؟''

''اور جناب۔''مولوی صاحب نے آسمان کی طرف دیکھا،''سفر مینا کی دو پلٹنیں دریائے جمنا پر پہنچی۔حضور بادشاہ سلامت بہ نفسِ نفیس اُن کے استقبال کو پہنچے۔اُن کی رہائش کا انتظام سلیم گڑھ میں کروایا۔اُنھیں مٹھائیاں کھلائیں اور تو اور۔۔!''کریم الدین نے مقابل میں بیٹھے ہوئے مجاہدین کی طرف دیکھا،''آپ کو الہ آباد کا قصہ معلوم۔۔؟''

''بھائی ہم تو کئی دنوں سے دلّی سے باہر ہیں اور لوگوں کو جنگ کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔''

''بھائی صاحب! الہ آباد میں مولویوں اور برہمنوں کے اتحاد نے انگریزوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ وہاں پر موجود چھٹی رجمنٹ نے رات کے کھانے کے بعد جنگ کا بگل بجا دیا۔ سپاہیوں نے تلواریں سونت لیں اور انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔''

''تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''بے اختیار اختر علی کی زبان سے نکلا ، اور کریم الدین اُسی انداز میں کہتے رہے،''افسران نے اپنی دوسری رجمنٹ کو حکم دیا کہ اُن کا مقابلہ کریں۔لیکن صاحب۔۔اُنھوں نے صاف انکار کر دیا اور وہ بھی مجاہدین کی صف میں شامل ہو گئے۔لفٹنٹ الگزینڈر کو قتل کر دیا۔قلعہ پر قبضہ کرلیا اور تیس لاکھ روپیہ اپنے ساتھ لے کر دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔۔جی''کریم الدین نے زور دے کر کہا،''اور جناب۔۔اُن کے سردار سر جان لارنس نے اپنے رپورٹ میں واضح طور پر لکھا کہ۔۔زرا ٹھہریں میں آپ کو وہ پرچہ ہی سناتا ہوں۔''کریم الدین نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ کا پُرزہ نکال کر پڑھنا شروع کیا،''نوشیراں میں پچپن نمبر کی پلٹن بگڑی اور چوبیسویں رجمنٹ نے اُس کا صفایا کر دیا۔ پٹنہ اور تھانیسر سے دیسی رجمنٹوں کے پاس خطوط پہنچے۔ ماؤں نے بیٹوں کو لکھا کہ دین کی حفاظت اور ملک کی خاطر اُٹھو۔ مارے جاؤ گے تو شہید ہو جاؤ گے اور جنت کے حقدار بنو گے اور عزت ملے گی۔ میوات اور ستھانہ کی پلٹنوں میں بھی یہ خطوط پہنچے۔ پشاور میں اکیاون نمبر کی

پلٹن نے چونسٹھ نمبر پلٹن کو ایک خط لکھا کہ بھائیو! ہندو اور مسلمان کا مذہب ایک ہے۔ وہاں جتنے حولدار، صوبیدار، میجر، جمعدار ہیں وہ سب ہم سے متعلق ہیں۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، بس انقلاب کی آواز سنو اور ملک کی جنگِ آزادی میں کود جاؤ۔''

اختر علی نے پھر ایک بار اللہ کا شکر ادا کیا اور مجاہدین کی طرف دیکھا، ان کی زبان سے نکلا، ''بھائی اب ہم بھی دلّی کی طرف لوٹ چلیں۔ ماحول سلگ چکا ہے۔ اس جنگ کو فتح مبین میں بدلنے کی خاطر اب ہمیں بھی ان فرنگیوں کے ناک کان کاٹنا ہی چاہیئے۔''

اور اُن کے چہرے جوش سے تمتمانے لگے۔

تارا کی تیمارداری نے دینا ناتھ کے زخموں کو بہت حد تک اچھا کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی نیم کے پانی سے اُس کے زخم دھو رہی تھی اور دینا ناتھ اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو دینا ناتھ۔'' اُس نے زخموں پر پٹی باندھتے ہوئے اُس سے سوال کیا اور وہ سٹپٹا گیا، ''میں۔۔میں۔۔۔وہ۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''وہی چہرا ہے جو تم نے کل دیکھا تھا۔'' اُس نے پانی کا برتن اُٹھایا اور باہر جاتے ہوئے کہا۔

''تارا۔'' وہ قدرے زور سے چہکا، ''ہر بار تم مجھے پہلے سے زیادہ سندر لگتی ہو۔''

وہ پانی پھینک کر دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی، ''تو کیا اب تمہاری آنکھوں میں بھی دوائی لگانا پڑے گی۔؟''

دینا ناتھ کو ہنسی آ گئی، ''تارا میں جھوٹ نہیں کہتا ہوں۔ تم سچ مچ بہت ہی سندر ہو۔''

تارا نے اُس کی طرف شریر نظروں سے دیکھا، ''لیکن یہی سندر تارا تمھیں

کبھی درگا دیوی لگی تھی۔''

دینا ناتھ کی ہنسی قہقہے میں تبدیل ہوگئی۔

''کیا کھی کھی کرتے ہو، ہم کیا درگا جی کی مورت جیسے نظر آتے ہیں۔؟''

دینا ناتھ نے ہنستے ہنستے کہنا شروع کیا، ''اُس سمئے تمہارا سوبھاؤ ہی کچھ ویسا تھا۔''

''اور اب۔۔۔؟''

دینا ناتھ نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا، ''اب تو تم۔۔۔''

''ماتا کالی لگتی ہوں۔۔ ہے نا۔؟''

''ارے نہیں نہیں۔'' دونوں ہی ہنس پڑے، ''تم تو بڑی سندر ہو، جیسے کوئی مرگ نینی، جیسے شیتل تلاؤ میں کوئی کنول، جیسے سورگ کی کوئی اپسرا، سب کے دکھوں کو سمیٹ لینے والی گنگا جی سمان ہو۔''

''پھر کہنے میں تم سے غلطی ہوگئی ہے دینا ناتھ۔''

''غلطی۔۔۔؟ کیسی غلطی۔؟''

''گنگا کو کوئی بھی گنگا جی نہیں کہتا۔'' وہ شوخی سے کہنے لگی، ''وہ تو گنگا میا کہلاتی ہیں اور تم نے مجھے گنگا سروپ کہا ہے۔ یعنی میں بھی تمہاری۔۔۔''

''ارے نہیں نہیں۔۔۔!'' اُس نے اس کی بات کاٹی، ''تم تو۔۔''

''بس اب چپ رہو۔'' اُس نے بناوٹی غصّے سے ڈانٹا، ''ہائے رے میرے بھاگ۔ ایک آس بندھی تھی عزت دار سیندور کی سو وہ بھی تم نے چھین لیا۔'' اُس نے جھوٹ موٹ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''تارا۔'' دینا ناتھ کی آواز میں بے بسی تھی، ''اب ہم کیا کریں ہم ہیں فوجی، نہ بھاشا جانتے ہیں نہ سنسکرتی کو پہچانتے ہیں، جو بھلا لگا وہ کہہ دیتے ہیں، اگر ہمیں عقل ہوتی تو کیا ہم تمہیں گنگا میا۔۔ مطلب گنگا کہتے۔؟''

تارا کھلکھلا کر ہنس پڑی، ''کبھی کوئی پریم گرنتھ بھی پڑھی ہے؟''

''بھجن گا نا جانتے ہیں بس۔''

''تو مہاراج ہم کہیں سے ایک تارے کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ آپ بھجن گاتے رہیے۔'' وہ جانے کے لیے جیسے ہی پلٹی، دینا ناتھ نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ کو زور سے پکڑا اور پھر درد سے بلبلا اُٹھا۔ تارا بے چین ہو گئی۔ زخم کی پٹی پر خون کا ایک دھبہ اُبھر آیا۔

''بہت تکلیف ہو رہی ہے دینا ناتھ؟'' اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں تو۔ تم لوٹ آئی ہو تو تکلیف بھاگ گئی۔'' وہ پھر مسکرانے لگا۔ اور تارا اُس پر جھک گئی۔

''بیٹھو نا۔'' اُس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ اُس کے پاس مسہری پر بیٹھ گئی۔

''تارا۔؟''

''ہوں۔''

''کچھ تو اپنے بارے میں بتائیں۔''

''دینا ناتھ۔'' اُس نے دروازے سے باہر جھانکا، ''تمہارے اور میرے بیچ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، میں نہیں جانتی پھل بھی ہو گا بھی یا نہیں، لیکن پھر بھی میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔ کیا کرو گے میری کہانی سن کر؟ چلو میں کہتی ہوں میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں تو؟''

''تو میں کبھی نہیں مانوں گا۔ تم تو میرے نزدیک ستی ساوتری ہو۔''

''یہ تم مجھے بار بار دیوی کیوں بنانے لگ جاتے ہو۔۔ ہاں۔؟ دینا ناتھ میں ایک عورت۔۔۔ عام سی عورت ہوں اور وہ سب کچھ جھیل رہی ہوں جو ایک ابھاگن کا نصیب ہو سکتا ہے۔ میری تم سے بنتی ہے۔ مجھے کیول میرے ہی استھان پر رہنے دیں۔''

دینا ناتھ خاموش ہو گیا اور زمین کو تکنے لگا۔ دونوں کے بیچ سناٹا چھا گیا۔

''بُرا مان گئے ہو میری بات کا۔؟'' تارا نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں

میں اٹھایا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی، ''میری کہانی جاننا چاہتے ہو نا۔؟۔۔سنو۔! میں دکن دیس کی رہنے والی ہوں۔دکن کا ایک صوبہ ہے اورنگ آباد۔ اور اورنگ آباد کی ایک تحصیل ہے جس کا نام ہے پٹن۔تم نے یہ نام کبھی سنا ہے۔؟''

''جانتا ہوں۔''

''میرے پتا جی ہری چندر سوامی کپڑوں کے بڑے بیوپاری تھے۔پٹن کی پیٹھنی ساڑی سارے دیش میں مشہور ہے۔سونے چاندی کے تاروں سے اُس کی بنائی ہوتی ہے اور اُسے کیول ملکائیں، رانیاں، نواب زادیاں، جاگیرداریناں ہی خریدتی ہیں۔اُن ساڑیوں کو لے کر میرے پتا جی شہر شہر جاتے اور ڈھیروں روپیہ کما کر لاتے تھے۔وہ مجھے اپنی بیٹی نہیں ہمیشہ بیٹا ہی سمجھتے تھے۔میری پڑھائی کا اُنھوں نے بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ میں نے فارسی اور اردو مولانا غلام دستگیر سے سیکھی تھی تو سنسکرت بابا بھٹ جی سے۔ پتا جی مجھے وید اور پرانوں کی کہانیاں سناتے یہی نہیں شمشیر خان نے میری فوجی تربیت کی اور ماں نے مجھے وہ سب کچھ سکھایا جو ایک گرہستن کا زیور ہوتا ہے۔میری سگائی بھی بنارس کے ایک پنڈت گھرانے میں ہوگئی تھی۔''

پنڈت نے مسکرا کر کر اُس کی طرف دیکھا، ''تم اُس سمئے بہت چھوٹی ہوگی۔۔ہے نا۔؟''

''ہاں اتنی ناسمجھ کے میں نے اپنے ہونے والے پتی کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔'' اُس نے بھی مسکرا کر دینا ناتھ کی طرف دیکھا، ''سگائی کی بات سن کر تم پریشان تو نہیں ہو گئے دینا ناتھ؟ آگے تو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔'' تارا اُسے چھیڑنے لگی۔

''چاہے جو بھی ہوا ہو۔آج تو تارا میری ہے'' دینا ناتھ نے آہستہ سے کہا، ''میرے لیے یہی بہت ہے۔''

''اس خوش فہمی میں نہ رہیں دینا ناتھ۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کے میرے

مالک ومختار صرف حیدر بھائی ہی ہیں اور میں کبھی اُن کے آگے نہ جاوں گی۔'' تارا نے اُسے پھر شریر نظروں سے دیکھا۔

''تارا شادی سنجوگ ہوتی ہے، اور میں حیدر بھائی کومنا نا خوب جانتا ہوں ،تم بس آگے کا حال بتاو۔؟''

میں گوداوری کے تٹ پر کھیلتی کودتی ،سنت ایکنا تھ مہاراج کے مندر میں بھجن سنتی ، درشن لیتی ،سید سادات اور مولانا صاحب کی درگاہوں میں حاضری دیتی ہوئی بڑی ہوئی ۔ایک دن ماں نے مجھے بتایا کہ پتاجی ایک بڑے بیوپاری قافلے کے ساتھ شمالی ہند جانیوالے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں بھی مچل گئی اور پتاجی سے ضد کرنے لگی کہ ہم کو بھی بڑے شہروں کی سیر کروادیں ۔ ماں نے بھی میری آواز میں اپنی آواز ملائی کہ بٹیا ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ پتہ نہیں بیاہ کے بعد گھر سے نکلنے کا مہورت نکلے نہ نکلے ۔آپ اُس کی اس خواہش کو پورا کردیں۔''

''پتاجی مان گئے۔'' تارا کا چہرا ایک دم اُتر گیا،'' کاش وہ نہ مانے ہوتے ۔''
وہ خاموش ہوگئی اُس نے آنکھیں موندلیں اور دوموٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اُس کے گالوں پر رینگ آئے۔

''تارا'' دینا ناتھ نے تڑپ کر اُسے آواز دی،''بس ۔۔اب آگے کچھ نہ کہیں،آگے کی کہانی ہم خود ہی جان گئے ہیں۔''

اور تارا روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور اپنے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اُس کی آنکھوں میں وہ سارا منظر در آیا کہ کس طرح دلّی سے اگلے پڑاؤ پر جاتے وقت اُس کے قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور کس بے دردی سے اُس کے ماں باپ کا قتل ہوا، مال واسباب لوٹا گیا اور کس بے رحمی سے اُن ڈاکوؤں نے اُسے بھی لوٹا اور پھر کس طرح ایک فرنگی جیلر کے ہاتھوں اُسے فروخت کر کے روپیہ حاصل کرلیا۔۔اگر حیدر بھائی اُس جیل میں نہ آتے اور اُسے وہاں سے نہ نکالتے تو اُس کی زندگی تو ختم ہو ہی گئی تھی۔

وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ دینا ناتھ اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اپنے دونوں زخمی ہاتھ اُس کے شانوں پر رکھ دیئے، "تارا اب رونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں تو تم کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا کہ تم ہی میری تارا ہو، مگر اطمینان کے لیے ہی بار بار تم سے تمہاری کہانی سننے کا اصرار کرتا رہا۔" اُس نے اُس کے چہرے کو اوپر اُٹھایا، "میری طرف دیکھو تارا، میں ہی بنارس کا وہ پنڈت دینا ناتھ ہوں جس کے ساتھ کبھی تمہاری سگائی ہوئی تھی۔"

تارا کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے اُسی طرح موجود تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، اور وہ دینا ناتھ کے سینے سے لگ گئی۔

سپہ سالارِ اعظم مرزا مغل نے اپنے حسنِ انتظام سے بڑی حد تک شہر میں بے جا ہونے والے قتل وخون کو بند کروا دیا تھا۔ وہ تاجر جو پہلے لٹ چکے تھے۔ مرزا مغل کے وعدے پر کہ اب اُنھیں کوئی نہیں لوٹے گا پھر سے دکانیں کھولنے لگے تھے۔ بازاروں میں آہستہ آہستہ رونق واپس آنے لگی تھی۔

خود بادشاہ سلامت بھی دل و جان سے دلّی کی حفاظت میں جٹ گئے تھے۔ وہ بہ نفسِ نفیس فوجیوں سے ملاقاتیں کرتے۔ مورچوں کا معائنہ کرتے، مجاہدین کی ہمت افزائی فرماتے اور آنے والے مجاہدین کے ہر لشکر کا خود استقبال کرتے اور اُن کے لیے جو بھی مناسب اقدامات اُن کے بس میں تھے اُسے پورا کرتے۔

دلّی اور اُس کے اطراف واکناف مجاہدین کا لشکر برسرِ پیکار تھا۔ آئے دن انگریزوں سے جھڑپیں ہوتی۔ توپیں گولے اُگلتی، بندوقوں سے گولیوں کی برسات ہوتی۔ تلواریں اور نیزے اپنا ہنر دکھاتے اور انگریزوں کے قدم اُکھڑ جاتے۔ کئی مورچوں پر مجاہدین نے انگریزوں کے لشکر کو شکستِ فاش دی اور اُن کے فوجی اسلحے پر قبضہ کرلیا۔

لیکن انگریز پھر بھی ہار ماننے والے نہیں تھے ۔ وہ مکاریوں کے جال پھیلانے لگے اور اپنے قدیم حربوں کو استعمال کرنے لگے ۔ اُن کے جاسوس اپنا کام کر رہے تھے ۔ وہ ملک کے غداروں کو خرید رہے تھے ۔ انھیں مستقبل کے سہانے خواب دکھا رہے تھے ۔

شام ڈھل چکی تھی ۔ اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا ۔ گھروں میں اور سڑک پر قندیلیں روشن ہونے لگی تھیں ۔ دکانیں کھلی ہوئی ضرور تھیں لیکن گاہک برائے نام تھے ۔ اختر علی کا گھوڑا سرپٹ اپنے گھر کی طرف دوڑ رہا تھا اور اُن کے خیالوں میں نیلوفر کا چہرا بار بار گردش کر رہا تھا ۔ وہ جب جب بھی شہر سے باہر جاتے اُس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے تھے لیکن آج یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ خالی ہاتھ لوٹ رہے تھے ۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھے اور اُن کا گھوڑا اُن کے دروازے پر پہنچ چکا تھا وہ گھوڑے سے نیچے اُترے اور اُسے نیم کے درخت سے باندھا اور پھر آہستہ سے دروازے پر دستک دی ۔

''کون ۔ ۔ ؟'' سلیم کی والدہ کی رعب دار آواز اُبھری ۔

اور اُنھوں نے جواب دیا ''دروازہ کھولیں زینت دلہن ، ہم ہیں ۔''

دروازہ نیلوفر نے کھولا اور بے ساختہ باپ سے لپٹ گئی اور کئی سوالات اُس نے ایک کے بعد ایک کرڈالے ''ابا جان جنگ ختم ہوگئی ۔ ؟ ہم جیت گئے ۔ ؟ آپ کو کوئی زخم تو نہیں آیا ، ابا جان مجھے آپ کی بہت یاد آتی تھی ۔''

اور وہ بیٹی کے ہر سوال پر اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے اور پھر جب وہ خاموش ہوگئی تو اُنھوں نے آہستہ سے کہا ''اب ہم اندر چلیں ۔''

''ہم دروازے کے باہر ہی ہیں ابا جان ۔ ؟'' وہ ہنسنے لگیں ، اور باپ بیٹی مکان میں داخل ہوئے ، ''چچی جان ۔ ۔ !'' اُس نے آواز دی ، '' آپ ابا جان سے باتیں کریں ہم سماور تیار کیے دیتے ہیں ۔'' پھر وہ باپ سے مخاطب ہوئی ، '' آپ غسل

فرمائیں گے ناابا جان۔؟''

اختر علی جواب میں صرف مسکرا کر رہ گئے۔

اور وہ تیزی سے حمام کی طرف بڑھی۔

اختر علی دالان میں پہنچے۔زینت دُلہن نے جھک کر سلام کیا۔خیریت پوچھی اور پھر باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔اختر علی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہی تھے کہ اُنھیں سلیم کا خیال آ گیا اور اُنھوں نے نیلوفر کو آواز دی،''نیلوفر۔۔''

''جی ابا جان۔!'' کہتی ہوئی وہ اُنکے پاس پہنچی۔

''سلیم کہاں ہے؟ کیا اُس نے بھی اب اوروں کی طرح راتوں کو گھومنا پھرنا شروع کر دیا ہے۔؟''

''نہیں تو ابا جان۔'' وہ ایک سانس ہی میں کہنے لگی،''وہ۔۔وہ تو فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔بہت خوش تھا۔کہتا تھا، میں بھی اب چچا جان کی طرح جنگ جیت کر آؤں گا۔خوب پیسہ کما کر لاؤں گا اور پھر میری۔۔۔!''

وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

اختر علی نے بیٹی کی طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھا۔اُن کے کانوں میں بھی شہنائیاں گونجنے لگیں،''وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ارے بہادر چچا کا بہادر بھتیجہ ہے وہ۔''

''بھائی صاحب وہ مجاہدین کے لشکر میں بھرتی ہو گیا ہے۔''باورچی خانے سے زینت دُلہن کی آواز اُبھری۔

'' کچھ بتایا بھی کہ کس چھاؤنی میں ہے وہ؟''

'' کچھ نہیں بتایا بھائی صاحب،فوج میں کیا بھرتی ہوا ہے اُس کے تو پاؤں زمین پر ٹکتے نہیں،بس ایک ہی رٹ لگا تا ہے کہ جنگ جیت کر آؤں گا۔''

اختر علی کے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔وہ فوجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن پھر بھی چھوٹی بھاوج کو دلاسے کی خاطر کہنے لگے،''زینت دُلہن تم

پریشان ہو۔؟''

''نہ'' ان کے لہجے میں بھر پور اعتماد تھا۔'' یہیں سے کئی ماؤں نے اپنے بیٹوں کو خوشی خوشی جنگ پھر روانہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ بیٹا جنگ میں پیٹھ نہ دکھائیں۔شہیدوں کا بڑا رتبہ ہوتا ہے۔ بسلامت روی و باز آئی''

اختر علی کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔'' اگر ہر ماں کا یہی جذبہ ہو تو اس ملک کو فرنگیوں سے آزاد ہونے میں اب کوئی دیر نہیں لگے گی'' پھر وہ بھاوج سے مخاطب ہوئے۔'' ہم بھی بس آپ سب سے ملنے آ گئے ہیں۔''

'' ابا جان میں نے تو بی بی سیدہ کی منت مانی ہے کہ سلیم جنگ جیت کر آئیں گے تو میں ان کی کہانی بھی سنوں گی اور ان کے نام سے گھی کے چراغ بھی جلاؤں گی۔'' نیلوفر کی آواز میں خوشی کے ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب سا دکھ بھی تھا۔ اختر علی نے اس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے سمجھانے لگے۔'' بیٹی دعا ایسی نہیں کرتے۔ سلیم اکیلا ہی جنگ نہیں لڑ رہا ہے۔ دعا یوں کرو کہ اے اللہ مجاہدین کے لشکر کو فتح و نصرت عطا کر۔ ان کے حوصلوں کو برقرار رکھ۔ ان کے اتحاد کو ہمیشہ قائم رکھ اور ان کی حفاظت فرما۔'' پھر انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔'' تمہارا سلیم یقیناً فتح یاب ہو کر آئے گا۔''

نیلوفر کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی اور اختر علی اس کی کیفیت کو خوب سمجھ رہے تھے۔

'' بھائی صاحب سلیم جب سے گیا ہے یہ تو باولی ہو گئی ہے۔ نہ ڈھنگ سے کھاتی ہے نہ نیند بھر سوتی ہے۔ عجب پریشان پریشان سی رہنے لگی ہے۔'' زینت دلہن نے نیلوفر کی جانب دیکھا اور اس نے جھٹ سے کہا۔'' ابا جان پانی گرم ہو گیا ہے۔''

اختر علی اپنی جگہ سے اٹھے تو زینت دلہن نے کہا۔'' بھائی صاحب جب تک میں دستر خوان لگاتی ہوں۔ سب مل کر کھائیں گے۔''

اختر علی نے جاتے جاتے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا اور پھر ان کے

چہرے پر ایک عجیب سے اطمینان بحال ہو گیا۔

''بھئی کمال ہے۔'' حیدر علی نے خس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے لطف اُٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''تارا نے گرما کی اس شدت کو بھی دیوڑھی میں جنت بنا دیا ہے۔''

''ادھر عصر کی اذان ہوئی اور اُدھر اُس نے خس کی ٹٹیاں صحن کی دیواروں پر ٹانگنا شروع کیا تھا اور جیسی ہی بانگی صاحب نے مغرب کی اذان کہی تارا نے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ شروع کیا'' دینا ناتھ نے تحسین آمیز نظروں سے تارا کی طرف دیکھا، ''اور حیدر بھائی جب زمین ٹھنڈی ہو گئی تو چارپائیاں لگا دیں۔ اب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بھلی لگنے لگی ہیں۔''

ان چارپائیوں پر حیدر خان، چنبیلی، تارا اور دینا ناتھ بیٹھے شربتِ انار سے لطف اُٹھا رہے تھے۔

''حیدر بھائی آج آپ دونوں دن تمام غائب رہے ہیں اور آئے بھی تو کافی رات ہو گئی ہے۔ کہاں رہیں آپ لوگ۔؟''

''ہاں بھئی۔'' حیدر خان نے شربت کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اُتارا اور گلاس کو رکھتے ہوئے کہنے لگا، ''ہم شہر میں مختلف مورچوں کو دیکھنے گئے تھے۔ شہر شہر سے سپاہیوں کے دستے دلّی آ رہے ہیں، اور مجاہدین کے لشکر میں شامل ہو رہے ہیں۔ اُن میں کچھ ہمارے پُرانے احباب بھی تھے، بس اُن کی باتوں میں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔''

حیدر خان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

''تو گویا دوستوں سے ملنا ملانا رہا ہے۔''

''صرف ملنا ملانا ہی نہیں رہا بھائی، آج کا دن تو بہت ہی بڑھیا رہا ہے۔'' چنبیلی بتانے لگی، ''وہ تمام ہندوستانی جو کبھی انگریزی فوج میں تھے وہ سب اُن سے

بغاوت کر کے اب ہماری فوج میں آ گئے ہیں ۔اُن کی وجہ سے خوب چہل پہل ہو گئی ہے۔''

دینا ناتھ نے اپنے زخمی بازوؤں کی طرف دیکھا اور ایک حسرت بھری آہ اُس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی ۔اُس کا سر جھک گیا اور چہرے پر مُردنی سی چھا گئی ۔ ایک احساس بار بار اُسے کچو کے لگا رہا تھا کہ وہ مجاہدین کے معرکوں میں محض زخمی ہونے کے سبب شریک نہیں ہو پا رہا ہے ۔حیدر خان نے اُس کی تڑپ کو محسوس کر لیا تھا ۔اُس نے نہایت محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''کیا ہوا ہے دینا ناتھ ۔؟''

'' کچھ بھی تو نہیں ۔'' اُس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی اور پھر بولا ،'' حیدر بھائی آپ نے بادلی سرائے کے معرکے کی کوئی تفصیل نہیں سُنائی ۔؟''

''ہاں ۔'' حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا ،'' دینا ناتھ ابھی بہت سارے معرکہ باقی ہیں ۔ابھی تک وہ جنگ ہی نہیں ہوئی جو ہندوستانیوں اور فرنگیوں کے مقدر کا فیصلہ کر سکے ۔اور تم اُس جنگ میں ضرور شریک ہوں گے ۔اب دل نہ چھوٹا کرو۔''

دینا ناتھ نے پھر ایک بار مسکرانے کی کوشش کی ،'' بادلی سرائے کا معرکہ تو بڑا زبردست رہا ہوگا ۔ ۔ ۔ ہے نا ۔؟''

'' ہاں اُس نے کہنا شروع کیا ،'' فرنگیوں کا لشکر علی پور سے دلّی کی طرف بڑھا تھا اور ہماری فوج جوش وخروش میں ڈوبی ہوئی دلّی سے پانچ میل باہر نکل آئی اور بادلی سرائے کے پاس مورچہ بنالیا ۔دونوں لشکر کے درمیان آدھے کوس کا فاصلہ تھا ۔ دونوں نے اپنے اپنے حساب کا جنگی نقشہ تیار کیا ۔مجاہدین نے بڑی توپوں کو اپنے بائیں بازو کھڑا کیا ۔جن کی تعداد تین تھی ۔چھوٹی توپوں کو قلبِ لشکر میں سجا دیا گیا ۔ اس کے علاوہ بچی ہوئی توپوں کو اوپر پہاڑی پر چڑھا دیا گیا اور قریب دو ہزار سپاہی وہیں پر کھڑے کر دیئے گئے تا کہ اُن کی حفاظت ہو سکے ۔لشکر کا بڑا حصہ علی پور پہنچ گیا ۔

''حیدر علی کچھ سوچنے لگا اور سب ہمہ تن گوش تھے۔

''پھر جنگ کا آغاز کس طرح ہوا۔؟'' تارا نے سوال کیا۔

حیدر علی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہی پھیلی ہوئی تھی اور یہ گہری سیاہی بارود کے دھوئیں اور شعلوں میں تبدیل ہوگئی۔ توپ کے گولوں، گھوڑوں کے ٹاپوں اور بندوق کی گولیوں نے آسمان سر پر اُٹھا دیا تھا۔

مجاہدین کی تین بڑی توپیں فرنگیوں کے لیے قیامت ثابت ہوگئیں۔ اُن کی زد میں فرنگیوں کی فوج کا جو بھی حصہ آیا روئی کے گالوں کی طرح اُڑ گیا۔ چھوٹی توپیں قلب پر طوفان مچا رہی تھیں۔ بندوق بردار گولیوں کی برسات کر رہے تھے۔

فرنگیوں کا سالار برنارڈ سمجھ گیا تھا کہ جب تک یہ بڑی توپیں موت اُگلتی رہیں گی فتح تو دور کی بات جنگ میں قدم جمانا بھی مشکل ہے۔ اُس نے فوراً گھوڑ سوار دستے کو حکم دیا کہ پوری طاقت کے ساتھ آگے بڑھو اور اُن تین توپوں کو اُلٹ دو۔ انگریزوں کا گھوڑ سوار دستہ پوری قوت کے ساتھ چیختے چلاتے توپوں کی طرف بڑھا۔ حیدر خان زور سے چلایا، ''توپوں کی حفاظت کرو۔''

توپیں اُسی طرح چل رہی تھیں لیکن اُن کے محافظ بہت کم تھے۔ مجاہدین کا گھوڑ سوار دستہ باوجود اس کے کہ انگریزوں کے مقابلے میں کم تعداد پر مشتمل تھا تلواریں سونت کر انگریزوں کے گھوڑ سوار دستے اور توپوں کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔ دونوں طرف سے زبردست مقابلہ آرائی ہو رہی تھی۔ کسی کا سر اُڑا، کسی کا ہاتھ کٹ کر گرا، کسی کا گھوڑا اُلٹ گیا، کسی کا پیٹ چاک ہوا۔ خون میں گھوڑے نہا رہے تھے۔ زمین سرخ ہوگئی تھی۔ بے شمار جاں بازلقمۂ اجل ہوگئے۔ ایک ایک انچ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی۔ حیدر خان نے دیکھا چنبیلی دشمنوں میں گھر گئی ہے۔ اُس کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی ہے۔ اُس کا لباس خون سے لت پت ہو رہا ہے۔ وہ فوراً اُس کی طرف بڑھا، اُس کی تقلید میں کچھ گھوڑ سوار بھی بڑھے اور اُنھوں نے چنبیلی کو اُن کے نرغے سے نکال لیا۔ لیکن اتنی دیر میں انگریزوں کے کچھ سپاہی توپوں تک پہنچ

گئے اور اُنھوں نے اُن کا رُخ مجاہدین کی طرف موڑ دیا۔ فائر ہوئے اور مجاہدین کے بہت سارے سپاہی شہید ہو گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین نے سنبھالا لیا اور اُن کی مدد کے لیے قلب سے اور دائیں بازو سے کمک پہنچ گئی۔ توپوں پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ اور وہاں پر موجود انگریز سپاہیوں کو واپسی کا موقع نہیں دیا گیا۔ جنگ تباہ کن موڑ اختیار کر چکی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت ہوپ گرانٹ تازہ دم گھوڑ سوار دستے کے ساتھ وارد ہو گیا اور لشکر کے پیچھے سے بائیں حصے پر حملہ کر دیا۔ سپہ سالار اعظم مرزا مغل گھوڑے پر سوار دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے فوراً پیادوں اور گھوڑ سواروں کو حکم دیا کہ آگے بڑھیں اور مقابلہ کریں۔ وہ تیزی سے بائیں جانب حملہ آور ہوئے۔

مجاہدین اس جنگ کو جس بہادری اور جرأت سے لڑ رہے تھے اُس نے انگریزوں کو دم بخود کر دیا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت لکھنؤ سے مجاہدین کے لیے کمک پہنچ گئی اور انھوں نے کہا، ''ساتھیوں اب تم پیچھے ہٹ جاؤ اور میدان ہمارے حق میں چھوڑ دو ہم ان فرنگیوں کو دانتوں چباتے ہیں۔ چنانچہ پہلا دستہ میدان سے نکلا اور دوسرے دستے نے ایسا حملہ کیا کہ انگریزوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز کمانڈر نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنے توپ خانے کا رُخ ان مجاہدین کی طرف پھیر دیا۔ مجاہدین کا دستہ انتشار کا شکار ہو گیا اور پیچھے ہٹتا چلا گیا، یہاں تک کہ ترپولیہ کی سڑک کے دونوں طرف باغوں کی چاردیواریوں کے پیچھے چھپ گیا۔ انگریزوں نے پیچھا شروع کیا۔

مجاہدین کی یہ ایک چال تھی وہ دراصل انگریزوں کو گھیرنا چاہتے تھے۔ اور وہی ہوا، جیسے ہی اُن کا لشکر ترپولیہ کی سڑک پر پہنچا۔ سڑک کے دونوں طرف سے مجاہدین نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے اُن پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ مجاہدین اس طرح کی چال بھی چل سکتے ہیں۔ اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ حواس باختہ اپنی چھاؤنی کی طرف دوڑ پڑے۔ مجاہدین اب بھی اُن کا پیچھا کر رہے تھے اُنھیں قتل کر رہے تھے۔

آخر انگریز فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور مجاہدین اُن کے فوجی اسلحہ کو سمیٹ رہے تھے۔

حیدر خان کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف تھیں اور بادل ایک دوسرے میں پیوست ہو رہے تھے۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی۔

تارا چنبیلی سے لپٹ گئی، ''اب میں آپ کو جنگ پر نہیں جانے دوں گی۔''

چنبیلی نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا، ''لیکن میں تو اب تم کو بھی جنگ پر لے جانے کا سوچ رہی ہوں۔''

''ساتھیو! ابھی تک تو مجاہدین کا دلّی پر قبضہ ہے اور وہ اس لیے کہ عوام بھی مجاہدین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ بادلی سرائے اور علی پور کے لوگوں نے بھگوڑے انگریزوں کو دیکھا تو وہ بھی اُن پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ نیچ اور نصیر آباد کی وہ فوج جو غوث خان اور سدھاری سنگھ کی کمان میں دلّی کے لیے نکلی تھی جیسے ہی وہ آگرہ سے آگے بڑھی تو انگریزوں کے نمک حلال بنی سنگھ نے اُسے اچنیرہ کے مقام پر روکنے کی کوشش کی، اور منہ کی کھائی۔''

''حیدر بھائی ایسا محسوس ہوتا ہے اب سبھی اس جنگ میں شریک ہو جائیں گے۔''

''بھائی ہو رہے ہیں۔''

''اور سب سے اہم بات تو یہ ہے دینا ناتھ کہ جنرل بخت خان بھی اپنے لشکر کے ساتھ دلّی پہنچ گئے ہیں، اور آتے ہی اُنھوں نے آگے بڑھ کر فوج کی کمان بھی سنبھال لی ہے۔۔''

تارا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اب تو بادشاہ سلامت کی سواری بھی ہر جگہ دکھائی دے رہی ہے۔''

''اور دینا ناتھ۔۔'' ابھی حیدر خان کچھ اور بتانے والا ہی تھا کہ آواز اُبھری،

''دما دم مست قلندر۔۔ دما دم مست قلندر۔۔''

''سجان بھائی۔'' سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

حیدر خان دروازے کی طرف بھاگا۔

تارا اور چنبیلی پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔

جونہی دروازہ کھلا، اُن کے سامنے ایک صوفی تمام تر صورت اور سیرت کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور آواز بلند ہوئی، ''صدقہ پنجتن پاک کا۔ یا علی المدد۔ د۔۔ یا پیر دستگیر یا مولا مشکل کشا۔ مجاہدین کا بیڑہ پار لگا۔ حق حق حق حق ۔۔۔۔۔۔''

اور پھر دونوں نے تھرکنا شروع کیا دونوں کے لبوں سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ حق حق حق حق حق۔۔''

اور ادھر چنبیلی اور تارا بھی دائیں بائیں تالیاں بجاتے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر تھرکنے لگی تھیں۔ کچھ دیر تک یہی عالم طاری رہا اور پھر سجان میاں حیدر خان کے گلے میں جھول گئے۔

چنبیلی اور تارا ہنسنے لگیں۔

حیدر خان گھوڑے کی طرف بڑھا اور اُس کی لگام تھام کر اصطبل کی طرف چلا گیا۔ سجان میاں تھکے ماندے چارپائیوں کی طرف بڑھے۔ اُن کا سب نے استقبال کیا۔ اُنھوں نے سب کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھا اور ایک چارپائی پر بیٹھے اور پھر اپنی پیٹھ لگا دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

''سجان بھائی۔'' چنبیلی اُنھیں چھیڑنے لگی، ''ماشاءاللہ سے آپ تو پورے مرشد لگ رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' تارا نے بھی تائید کی، ''اب بھلا کون جانے کہ اس صوفی کے ویش میں ایک مجاہد چھپا ہوا ہے۔۔؟''

''کہاں غائب ہوئی گئے تھے حضور۔؟'' حیدر خان کی آواز اُبھری اور وہ اُن کے مقابل پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھتا ہوا کہنے لگا، ''کیا آپکو ہماری یاد نہیں آتی تھی۔''

سجان میاں نے اُسی حالت میں لیٹے لیٹے کہنا شروع کیا،

اوڑھو   اندھ   کوپ   اندھیرا

یا گھٹ بھیتر سات سمندر یاہ میں ندی نارا

یا گھٹ بھیتر کاشی دوارکا یاہ میں ٹھاکر دورا

یا گھٹ بھیتر چند سورج ہے یاہ میں نولکھ تارا

کہے کبیر سنو سادھو یاہ میں مت کر تارا

''سجان بھائی ہم کو اس قدر گہرے پانیوں کی سیر نہ کروائیں۔'' حیدر خان نے اُن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے،'' کہاں رہے اتنے دن آپ؟''

''ہم تو مولانا احمد اللہ شاہ کے مُرید ہو گئے تھے، اور کبھی بندوق کا ورد تو کبھی تلوار کی ضرب تو کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر گیان دھیان کی گنگا میں ڈبکیاں لگا رہے تھے گھٹ پٹ گھا گھن گھی رے پھٹ پھٹ۔۔''

''احمد اللہ شاہ۔؟'' چنبیلی نے اپنے آپ میں بڑبڑایا، اور پھر جیسے اُسے سب کچھ یاد آ گیا اور وہ فوراً کہنے لگی،'' وہی مردِ مجاہد نا؟ جس کے ایک ہاتھ میں تلوار، کاندھے پر بندوق اور بغل میں قرآن رہتا ہے۔؟''

''ہاں ہاں۔۔وہی مولانا احمد اللہ شاہ۔''

''سجان بھائی آپ اُن کے اتنے قریب رہے ہیں، میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلوں۔''

''دمادم مست قلندر۔۔دمادم مست قلندر۔ جو پیر کا ہووے۔۔۔''

''وہی سہاگن کہلائے۔'' دینا ناتھ نے شرارتاً کہا، اور سجان میاں نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا،'' بچہ وہ کہاوت اس طرح ہے کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔۔ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے۔۔؟''

''جو پیر کا ہووے۔۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''ہاں۔۔جو پیر کا ہووے۔۔سب اُس کے ہوویں، صدقہ پنجتن پاک کا

۔۔ یا علی المدد یا مشکل کشا، میری مشکل کردے آسان، حق کی ہو منزل آسان، مجاہدین کی بڑے شان۔ گھر گھر اُن کا چرچا ہو، فرنگی اپنے گھر جاؤ۔ حق حق حق حق حق۔''

''سبحان بھائی اب یہ ناٹک بند کریں۔'' حیدر خان نے اُن کی طرف دیکھا اور دونوں کے لبوں سے قہقہہ بلند ہوا۔

''حیدر خان میں مولانا کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔''

تارا اور دینا ناتھ نے چنبیلی کی طرف دیکھا گویا وہ بھی اُن کے بارے میں سننے کے لیے بے چین ہیں۔

''جہاں تک میری یاداشت بتاتی ہے۔'' چنبیلی نے سب کی طرف دیکھا،'' مولانا لکھنؤ میں معتمد الدولہ کی سرائے میں گھسیاری منڈی میں ہمیشہ بسیرا کرتے تھے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا؟''

''غالباً تم اُن دنوں لکھنؤ ہی میں رہیں تھیں۔'' حیدر خان نے استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' چنبیلی نے کہنا شروع کیا،'' وہ جب بھی شہر میں نکلیں تو وہ اور اُن کے سارے ساتھی ہتیار لگا کر نکلیں۔ سواری کے گھوڑے پر ڈنکا رہتا۔ اور ایسی شان سے یہ سب جائیں گویا کوئی نواب یا بادشاہ کی سواری شہر میں گشت کر رہی ہے۔''

''لیکن مولانا کا اس سے مقصد کیا تھا۔؟''

''یہی کہ ہم یہاں کے مالک ہیں۔ ہر دوشنبہ اور پنج شنبہ کو وہ قوالی کا اہتمام کرتے تا کہ لوگ جمع ہوسکیں۔ بعد قوالی مولانا کا بیان ہوتا جس کے آخر میں وہ کہتے کہ اے لوگوں ان فرنگیوں کے خلاف متحد ہوجائیو، اور بار بار احساس دلادتے کہ یہ ملک ہمارا ہے تو حاکم بھی ہمارے ہی رہیں گے۔ وہ سب سے کہتے ان فرنگیوکو اُکھاڑ پھینکو۔''

''مولانا اتنی کھلم کھلا باتیں کریں اور فرنگیوں کی نظر میں نہ آئیں یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا چنبیلی۔''

چنبیلی نے تارا کی طرف دیکھا،''پولس نے اُن کے بارے میں رپورٹ

لکھنؤ کے مجسٹریٹ کے حوالے کی فرنگی حکم نکلا۔ مولانا اپنے ہتیار کچہری میں جمع کردیں یا یہاں سے چلے جائیں، اور مولانا لکھنؤ سے فیض آباد جا بسے۔ ہے نا سبحان بھائی ؟''

''بالکل۔'' سبحان میاں نے اُس کی تائید کی اور پھر کہنا شروع کیا، ''فیض آباد میں بھی مولانا کا یہی طریقہ رہا۔ وہاں بھی بہت بڑی تعداد میں لوگ اُن کے ہمنوا ہوگئے۔ کیا مسلمان کیا ہندو سب ہی مولانا کے گرویدہ تھے۔ آخر مولانا نے فیض آباد میں بغاوت کا بگل بجا ہی دیا۔ ایک بڑا جلوس نکلا۔ مفتی گنج تک پہنچے ہی تھے کہ فرنگیوں سے جھڑپ ہوگئی اور فرنگیوں نے قابو پالیا۔ مولانا کو گرفتار کرلیا گیا۔ اُن پر مقدمہ چلا اور پھانسی کا حکم جاری ہوا۔''

''پھر۔؟'' سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

''پھر کیا۔؟ آگ کا جاگ تو اُٹھنے ہی والا، مولانا کی پھانسی اُن کے ہی گلے کا ناپ ہوگئی۔''

سبحان میاں نے گردن جھکادی اور اپنے دل پر نظریں گاڑھ دیں اور زور سے الا اللہ کی ضرب لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ گویا سارا منظر دیکھنے لگے تھے۔

پورے فیض آباد میں مولانا کی سزا کے خلاف ہنگامہ شروع ہوگیا اور دلیپ سنگھ کی قیادت میں بپھرا ہوا شہر جیل کی طرف بڑھا۔ نعرۂ تکبیر کی آوازیں گونج اُٹھیں۔ جیل کو توڑ دیا گیا اور مولانہ کو آزاد کرالیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین کا سارے شہر پر قبضہ ہوگیا۔ پورے شہر پر دہشت طاری ہوگئی۔ انگریز سہمے، ڈرے، گھبرائے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگنے لگے۔ پناہیں ڈھونڈھنے لگے۔

جیل سے آزاد ہوتے ہی مولانا نے حکم جاری کیا، شہر میں کوئی لوٹ مار نہیں ہوگی۔ بے گناہ انگریز بچوں اور خواتین کا قتل عام نہیں ہوگا۔ اُن پر کوئی ظلم نہیں توڑا جائے گا۔ اُن کے گھروں کو آگ نہیں لگائی جائے گی۔ پھر مولانا نے نائب سرجن نجف علی کو بلوایا اور اُن کے زریعہ انگریزوں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنی اپنی وردیاں ہمارے پاس جمع کروادیں اور جس قدر ممکن ہوسکتا ہے فیض آباد خالی کردیں۔ بطور

خرچ ہر فرنگی کو نو سو روپیہ دیا گیا۔ اُن کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا گیا اور اُن کے گھروں پر پہرے بٹھا دیے گئے تاکہ کوئی اُن کی املاک کو نہ لوٹے۔ اُنھیں یہ بھی آزادی دی گئی کہ وہ اپنا مال و اسباب اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

اور پھر فرنگیوں کے قافلے روانہ ہوئے۔

سبحان میاں نے آنکھیں کھولیں اور سب کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہرے پر شدید تھکاوٹ تھی اُنھوں نے آہستہ سے کہا، ''اودھ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اعلان ہو گیا ہے۔''

پھر اُن پر نیند کا غلبہ حاوی ہو گیا اور وہ سو گئے۔

''اب انھیں کوئی آواز نہ دیں۔'' حیدر خان نے سب کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں گیا اور ایک چادر لا کر اُنھیں اُڑھا دیا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے قدم اپنے اپنے کمروں کی طرف اُٹھنے لگے۔

بغاوت کی یہ آگ رفتہ رفتہ ہر شہر ہر قریہ پھیلتی جا رہی تھی۔ مجاہدین کی طاقت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے تن من دھن کی قربانیاں دے رہے تھے اور وطن کی آزادی کے سنہرے خواب دیکھ رہے تھے۔

اور دوسری طرف غداران وطن انگریزوں سے ساز باز کر رہے تھے۔ سازشیں رچ رہے تھے۔ مطلب پرستی اور خودغرضیوں پر اُتر آئے تھے اور ملک و ملت کے سودے کر رہے تھے۔

یہ رات قلعہ معلیٰ پر بھی اتری تھی۔ لیکن یہ رات وہ رات نہ تھی۔ نہ کہیں سے پائلوں کی چھنا چھن گونج رہی تھی نہ کوئی مُغنّی اپنی لئے میں مست تھا نہ شعراء کی محفل تھی۔ بس ایک سناٹا تھا اور پہریدار خاموش اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ تمام شہزادے، شہزادیاں، ملکائیں، خواب گاہوں میں موجود تھے۔ کوئی جاگ رہا تھا، اور کوئی غم فردا

میں ڈوبا ہوا تھا۔کوئی نیند میں غرق تھا اور کہیں سازشی ذہن اٹکل لگانے میں مصروف تھے۔انسان خواہ پارسائی کے کتنے ہی لبادے اوڑھ لے،لیکن فطرتِ انسانی سے بچ نہیں سکتا۔خودنمائی کی خو، مقابل پر اثر انداز ہونے کی جبلت،مکر وفریب کی علت، خواہشات،نفسانی محرومیاں،جلن،حسد جیسے مکروہ صفات سے اُسے مفر ممکن نہیں ہے۔مرزاالٰہی بخش،تیموری النسل کا بوڑھا شہزادہ بھی اس وقت ان ہی منصوبوں میں اُلجھا ہوا تھا ار کوئی سرا اُس کے ہاتھ نہیں آرہا تھا۔سامنے شراب کی صراحیاں رکھی ہوئی تھیں۔اور اُس کی منہ چڑھی کنیز گل افشاں اُس کے پہلو میں بیٹھی دعوتِ عیش دینے کے لیے بے تاب تھی۔لیکن مرزاالٰہی بخش اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔کنیز نے اُسے آنکھ بھر کر دیکھا اور پھر اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔دوطوفانوں کے بیچ اُس کا ماتھا سلگ رہا تھا اور دوطرفہ بپھری ہوئی افواج دھک دھک کرتی اُس پر شدید حملے کر رہی تھی اور اُس کے بدن کا منہ زور گھوڑا مچلنے لگا تھا۔اُس نے اپنا ماتھا اُٹھایا تو گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دی،''کس سوچ میں ڈوبے ہیں عالم پناہ۔؟''

وہ ایک دم چونکا اور برق رفتار دستے کی باگیں پوری قوت سے کھینچ لیں۔ گھوڑے اب بھی پیر پٹک رہے تھے۔''عالم پناہ۔۔؟ یہی کہا نہ تم نے۔؟''

''جی عالم پناہ۔۔ یہ نیا اندازِ تخاطب آپ کو پسند آیا؟''

''بہت پسند آیا۔۔ یہ بہت مسرور کن ہے۔پھر سے کہو۔۔کہتی رہو۔۔اور کہو اور کہو۔۔۔''

اور کنیز نے اپنے لب شہزادے کے کان سے لگا دیے اور اُس کی ہر سانس کے ساتھ آواز اُبھرنے لگی۔عالم پناہ۔عالم پناہ۔عالم پناہ۔عالم پناہ۔۔۔۔۔۔۔''

شہزادے نے اُسے اپنی گود میں بھر لیا اور کنیز کی باہیں شہزادے کے شانوں کو جکڑی ہوئی تھیں۔اُس کی زلفیں کھلی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے ہوس کا آبشار پوری بے حیائی کے ساتھ گر رہا تھا۔

''یہ لفظ عالم پناہ تمہاری زبان پر اچانک کیسے آ گیا۔؟''

کنیز نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، ''وہ دماغِ عالی میں کلبلا رہا تھا۔ مچل رہا تھا۔ حضور کی بے اعتنائی کا شکوہ کر رہا تھا۔ کنیز نے جرأت سے اُسے آواز دی تو وہ ہمک کر کنیز کے لبوں پر آ گیا۔''

''مرحبا۔۔!'' شہزادے نے اُسے پوری قوت سے بھینچ لیا اور کنیز کی مٹھاس بھری سسکاری شہزادے کے رگ و پے میں دوڑ گئی اور اُس نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا، ''تم صرف حُسن کا ماہتاب ہی نہیں بلکہ ذہانت کا آفتاب بھی ہو۔'' کنیز نے اپنا سر اُس کے سینے میں چھپا لیا۔

''حضور، عالم پناہ کا اعزاز حاصل ہوتے ہی اس کنیز کو بھول نہ جایئے گا۔ آپ کو بادشاہی کی مبارکباد سب سے پہلے اسی کنیز نے دی ہے۔''

''اور مبارک بادی کا نذرانہ۔۔؟'' شہزادے نے شوخ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور کنیز نے شہزادے کے چہرے پر اپنا رخسار رکھ دیا، ''حضور کنیز کا سارا خزانہ حاضر ہے جو چاہیں لے لیں۔''

اوپر آویزاں روشن فانوس بوس و کنار کے عجیب مناظر دیکھ رہے تھے۔ کبھی اُن کی لویں شرم و حیا سے سرخ ہو جاتیں اور کبھی وہ اپنی نگاہیں ریشمی پردوں میں چھپا لیتے اور پردوں کی سرسراہٹ اُنھیں پھر ایک بار اُسی منظرِ بے باکانہ میں پہنچا دیتی اور وہ دلوں کی دھڑکنیں گننے میں مصروف ہو جاتے۔

نقارچی نے نقارے پر دو ٹول لگائے اور نیند اور خمار میں ڈوبی ہوئی کنیز نے شراب کا آخری جام شہزادے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''حضور یہ جامِ جرأت ہے۔ اسے حلق سے اُتار لیں اور مقابل کی صفوں کو اُلٹ کر بادشاہت کا تاج اپنے سر پر سجا لیں۔''

''میری جان یہ مہم اتنی آسانی سے سر نہ ہو گی، درمیان میں سگِ فرنگی بھی ہیں۔''

''تو حضور کتوں کو ٹکڑا ڈال دیں اور پھر وفاداری کا تماشہ دیکھیں۔''

مرزا الٰہی بخش نے اُس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا، ''کمال کی ذہین ہو تم! جانِ عزیز یہ ہمارا وعدہ ہے اگر ہم منصبِ شہزادگی سے بلند ہو کر بادشاہت سے سرفراز ہوئے تو تم یقیناً ہماری ملکہ ہو گی ۔۔ ملکہ عالیہ ۔۔۔ دودمان تیموری و چنگیزی کا مستقبل۔''

''مستقبل۔'' کنیز نے حیرت سے مرزا الٰہی بخش کی طرف دیکھا۔

''کیا ملکہ کے منصب کے اعلان نے تمہاری ذہانت کو گہن زدہ کر دیا؟ جانِ جاناں! تم ہی وہ مادرِ ذیشان ہو گی جس کے بطن سے سلطنتِ مغلیہ کا اگلا وارث پیدا ہو گا۔''

کنیز پر نشہ سا چھا گیا اور وہ سرور سے جھوم اُٹھی اور جب اپنے آپ میں واپس لوٹی تو کہنے لگی۔۔۔

''حضور شہزادے کنیز جانتی ہے یہ سفر سنگلاخ چٹانوں سے گزرنے کا عمل ہے۔ یہ کام آپ اس کنیز پر چھوڑ دیں، تاکہ آپ پر غداری کا الزام بھی عائد نہ ہو۔ عالم پناہ تک پہنچنے کے اس سفر میں کس کس کو اعتماد میں لیا جا سکتا ہے اور اس سنہرے جال میں کون کون سی مچھلیاں پھنس سکتی ہیں۔ یہ سب اس کنیز پر چھوڑ دیں اور پھر وقت اور قسمت کے چاک پر لکھی جانے والی نئی داستان کا متن ملاحظہ فرمائیں۔

مرزا الٰہی بخش نے کنیز کو پھر سے ایک بار اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور ہواؤں کے جھکڑ پردوں سے ٹکرانے لگے۔

(۱۲)
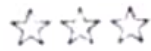
نمازِ فجر سے فارغ ہوتے ہی حیدر خان اور چنبیلی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور شہر کا جائزہ لینے نکل پڑے۔ جنرل بخت خان کی آمد سے بہت ساری تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ تاجر طبقہ بھی کسی حد تک اطمینان کی سانس لے رہا تھا۔ کیونکہ لوٹ کھسوٹ کے معاملات کو اب جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور واضح الفاظ میں بتا دیا گیا تھا کہ جو بھی اس کاروائی میں ملوث پایا جائے گا اُسے سخت سزا ملے گی۔

وہ دونوں جمنا کے کنارے کنارے آگے پیچھے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ جمنا کے معمولات لوٹ رہے تھے۔ گو خواتین اور بچوں کی تعداد نہیں کے برابر تھی لیکن پھر بھی ڈبکیاں لگائی جا رہی تھیں۔ پجاری، بھگت، سادھو اپنی اپنی عبادتوں میں مصروف تھے۔ آسمان میں پرندے اُڑ رہے تھے۔ حیدر خان نے چنبیلی کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرا سنجیدہ ہو رہا تھا، اور وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ وہ اُس کے مقابل ہوا اور نہایت اپنائیت سے پوچھا، ''کیا سوچ رہی ہو چنبیلی؟''

اور چنبیلی ایک دم چونکی، ''نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

''پھر بھی۔''

''لکھنؤ کی یاد آ رہی ہے۔'' چنبیلی کی پھیکی سی مسکراہٹ کا رُخ اُس کی طرف تھا۔''

''لکھنؤ۔؟'' حیدر خان نے آہستہ سے کہا اور اُس کے ذہن میں بھی لکھنؤ کی

یادیں اُبھر آئیں۔

''سبحان بھائی نے تو بتایا ہے کہ وہاں بھی بغاوت ہو چکی ہے۔''

''ہاں۔'' حیدر خان نے پانی کے بہتے دھاروں کی طرف دیکھا۔ ''رائے بریلی، سندیلہ، خیر آباد، ملیح آباد وغیرہ سینکڑوں دیہاتوں اور چھوٹے بڑے شہروں میں انگریزوں کے خلاف صف آرائی ہو رہی ہے۔''

''خان! یہاں سے بھی کچھ فوجی لکھنؤ بھیجے جا رہے ہیں۔''

''ہاں! میں نے بھی سُنا ہے۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ ہم بھی لکھنؤ چلیں۔''

خان نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''لکھنؤ کی یاد آپ کو بھی تو ستاتی ہوگی؟ آپ نے بھی تو وہاں پر افسری کی ہے۔''

''افسری تو خیر۔۔لیکن لکھنو نے مجھ پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔''

چنبیلی نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا تو خان کے چہرے پر شوخی عود آئی، ''لکھنؤ نے مجھے تم جیسی حسین، وفا شعار، بہادر ہمسفر بھی تو بخشا ہے۔''

چنبیلی شرما گئی، ''مجھے تو عزیزن آپا کی یاد ستاتی ہے۔''

حیدر خان نے اُس کی طرف آنکھیں بھر کر دیکھا۔

''خان میں آپ کی بیوی ہوں، لیکن آپا کو بھی تو بھول نہیں سکتی۔''

حیدر خان مسکرانے لگا، ''ٹھیک ہے ہم کل ہی روانہ ہو جائیں گے۔''

اور پھر دونوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔

سبحان میاں نے دینا ناتھ سے اُس کی اور تارا کی پوری کہانی سنی۔ اُن کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اُنھوں نے اپنا مخصوص نعرہ لگایا، ''دمادم مست قلندر، دمادم مست قلندر۔'' اور پھر کہنے لگے، ''میاں صوفیوں نے عشق کو ہمیشہ ہی افضل جانا

ہے ،اور ہم تو کہتے ہیں کہ جب جب بھی دنیا کے کسی کونے میں عاشق اور معشوق سچی محبت کی پینگیں بڑھاتے ہونگے تو خالق باری بھی اوپر سے اُنھیں دیکھ کر خوش ہوتا ہوگا، کیونکہ کوئی بھی تخلیق کارعشق کے رمز سے بے گانہ نہیں ہوسکتا اور وہ سب سے بڑا تخلیق کار ہے۔'' اُنھوں نے دونوں کی طرف دیکھا،''بس حیدر خان کو آنے دو۔''

تارا سہم گئی ،'' سبحان بھائی مجھے حیدر بھائی سے بہت ڈر لگتا ہے ۔ وہ کہیں ناراض نہ ہوجائیں ۔میں اُن کے لیے سب کچھ تیاگ سکتی ہوں۔''

'' بھئی عجیب پگلی ہوتم ۔؟ جب اللہ ناراض نہیں ہوگا تو حیدر کیوں ناراض ہونے لگا۔''

چنبیلی اور حیدر خان کے گھوڑے دیوڑھی میں داخل ہوئے۔

تارا گھبرا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور دینا ناتھ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے ۔سبحان میاں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا،''اماں تم بھی تو جاؤ یہاں سے ۔اب کیا بے شرمی سے یہیں پر بیٹھے رہو گے۔''

اور دینا ناتھ سرخ چہرا لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''آؤ حیدر خان۔''

''اور میں۔؟''حسب عادت چنبیلی نے اُنھیں چھیڑا ،'' مجھے آنے کی اجازت نہیں ہے۔؟''

''نہیں نہیں ۔۔تم بھی آؤ۔'' سبحان میاں نے اُس کی طرف دیکھا،''تو کیا تم اب بھی اپنے آپ کو حیدر خان سے الگ سمجھتی ہو۔؟''

'' نہ !ہم دونوں ویسے تو دو جسم ہیں مگر ہماری روح ایک ہی ہے۔''

''بیٹھ جاؤ۔''

دونوں بیٹھ گئے۔

''حیدر خان ۔۔!'' سبحان میاں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا،''مسماۃ تارا بیگم۔۔''

''جی وہ میری چھوٹی بہن ہے۔'' وہ مسکرانے لگا، ''سبحان بھائی آج آپ کچھ عجیب لہجے میں بات کر رہے ہیں۔''

''تم بھائی ہونے کا دعوی کرتے ہو لیکن کبھی یہ سوچا کہ بہن کا گھر بھی آباد ہونا چاہیے۔؟''

حیدر خان نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔

''بی بی ہماری خاطر داری کریں، ہم مسماۃ تارا بیگم کے لیے ایک رشتہ لے کر آئے ہیں۔''

''جی ابھی حاضر ہوتی ہوں۔'' چنبیلی فوراً وہاں سے اُٹھی اور حیدر خان نے سوال کیا، ''بھائی کس کا رشتہ لے کر آئے ہیں آپ۔؟''

''ہمارے چھوٹے بھائی کا۔''

حیدر خان خاموش ہو گیا اور اُس کے چہرے پر کئی سوالات اُبھر آئے۔

''سوچ لو اس سے عمدہ رشتہ مسماۃ کو پھر نہیں آئے گا۔''

''سبحان بھائی آپ جانتے ہیں کہ ہم دونوں بھائی بہن ضرور ہیں لیکن ہماری مثال اُس درخت کی طرح ہے جس کی دو شاخیں ہیں اور دونوں کے پھل پھول جدا جدا ہیں۔''

''ہم وہ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''اور پھر بھی آپ۔۔؟'' حیدر خان کی پیشانی پر کئی شکنیں اُبھر آئیں، ''نہیں نہیں یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکتا، یہ تو تارا پر ظلم ہوگا۔ سبحان بھائی یہ رشتہ۔۔''

''آپ ہماری اور ہمارے رشتے کی توہین کر رہے ہیں'' سبحان میاں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''سبحان بھائی آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔؟''

''آپ اپنی بہن سے دریافت کر لیں۔ وہ راضی ہے۔''

''کیا۔۔؟ تارا راضی ہے۔؟''

''اجی جناب وہ تو آپ کے احسان سے دبی ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے بھیا کے لیے سب کچھ تیاگ سکتی ہوں۔ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔''

''اور سبحان بھائی، اُس کا یہ بھائی اُس سے کسی قسم کی قربانی نہیں چاہتا ہے، اور تارا بہن اگر بھائی کی محبت کو احسان سمجھتی ہیں تو لعنت ہے اُس بھائی پر۔'' حیدر خان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور اتنے میں کھانے پینے کی چیزوں سے سجی ہوئی کشتی لے کر چنبیلی وہاں پر پہنچی۔

''اسے رکھ دو۔'' سبحان میاں نے قدرے تیز لہجے میں کہا، ''اور جاؤ۔ تارا سے پوچھ کر آؤ اُسے ہمارے بھائی کا یہ رشتہ منظور ہے یا نہیں۔''

''جی۔'' چنبیلی نے دونوں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''ارے تم جاؤ۔ جو ہم نے کہا۔ وہ کام کرو۔ جاؤ۔''

چنبیلی سیدھا تارا کے کمرے میں پہنچی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ تھی، اور دینا ناتھ دروازے پر کھڑا دونوں کی باتیں سننے کے لیے بے چین تھا۔ چنبیلی نے کہنا شروع کیا، ''بہن تارا سبحان بھائی تمہارے لیے اپنے چھوٹے بھائی کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔ کیا تمھیں یہ رشتہ منظور ہے۔

تارا نے جھک کر چنبیلی کے پاؤں چھوئے۔

''ارے یہ کیا کرتی ہو۔؟''

چنبیلی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

دینا ناتھ بے چین ہو رہا تھا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے تارا۔؟''

''میرے بھیا کو اگر یہ رشتہ پسند ہو تو مجھے انکار نہیں ہے۔'' اور وہ اس سے لپٹ گئی۔

آواز سبحان میاں اور حیدر خان کے کانوں تک بھی پہنچی۔ سبحان میاں مسکرا رہے تھے اور حیدر خان جھٹکے سے اُٹھ گیا، ''وہ یہ سب کچھ اخلاقی دباؤ میں کر رہی ہے

سبحان بھائی۔ یہ مجھے منظور نہیں ہے۔''

''ٹھہرو حیدر خان! میں تمہاری کیفیت کو خوب سمجھ رہا ہوں لیکن ایک نظر میرے بھائی کو بھی تو دیکھ لیں۔'' پھر اُنھوں نے دینا ناتھ کو آواز دی،' بھیا دینا ناتھ یہاں آؤ اور پتا سمان تارا کے بڑے بھائی کے چرن چھولو۔''

حیدر خان تیزی سے پلٹا،''سبحان بھائی آپ کسی بھی جگہ ناٹک کھیلنے سے باز نہیں آئیں گے۔''

''اب کہو یہ رشتہ منظور ہے۔۔ یا نہیں؟''

''جی۔'' اُس نے خوشی سے کہا،''صدفی صد منظور ہے۔'' اور سبحان میاں کو گلے سے لگا لیا اور اُن کا نعرہ گونجا،''دمادم مست قلندر۔ دمادم مست قلندر۔''

اور خوشی سے وہ دونوں تھرکنے لگے۔

چنبیلی نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہ بھی اُن میں شامل ہوگئی اور اُس کے ہونٹوں پر گیت مچلنے لگا،

اوہی رے دیس بابل
چنری بھئی مہنگی
تو سیندور ہوا بڑا مول رے
اوہی سیندور وا کے کارن
چھوٹا ہے بابل کا دیس رے ۔۔۔۔
اور پھر تینوں کے قہقہے فضاء میں گونجنے لگے

نیلوفر سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ آئینے میں جو اُس کا عکس دکھائی دے رہا تھا وہ اُس نیلوفر کا قطعی نہیں تھا۔ جو چنچل، شوخ، باتونی اور خوش لباس تھی۔ اُس کے بال بے ترتیب تھے۔ آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ چہرے کی تازگی و شادابی غائب تھی۔ گلابی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور بدن پر میلا کچیلا لباس تھا۔ اُس نے آنکھیں

بند کرلیں تو اُس کے تصور میں سلیم در آیا، کندھے پر بندوق لگائے گھوڑے پر سوار سپاہیوں کے ساتھ منزل بہ منزل طئے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔فوجی نعرۂ تکبیر لگا رہے ہیں۔ زمین دہل رہی ہے اور گھوڑے شاہی عمارتوں کے قریب سے، اور بلند دروازوں سے نکلتے ہوئے سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔سلیم کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی ہے۔وہ تصور میں اُس کے پیچھے دوڑنے لگی۔اوبڑکھابڑ پتھریلا راستہ ہے۔ سر پر سخت دھوپ ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی ایک ٹیکری پر رُک گئی، گھوڑے دور بہت دور نظروں کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں اور اب غائب ہی ہونے والے تھے کہ نیلوفر زور سے چلائی، ''سلیم، سلیم، سلیم۔۔۔''

سلیم کا گھوڑا پلٹ کر اُس کی طرف آ رہا ہے اور اُس کے کانوں میں آوازیں آ رہی ہیں۔

اُس کی آنکھیں اُسی طرح بند ہیں۔

''کیا بات ہے نیلوفر، تم اس طرح کیوں چیخ رہی تھیں؟''

''سلیم ہم نے ہی آپ کو جنگ میں جھونک دیا، لیکن آ کر دیکھیں ہم آپ کے لیے کس قدر بے چین ہیں۔ ہر لمحہ آپ کی صورت ہماری آنکھوں میں رہتی ہے۔ نہ ہمیں بھوک لگتی ہے اور نا ہی ہم کو نیند آتی ہے۔ جانے کیوں بار بار ہمارے قدم اُس دیوار کے پاس رُک جاتے ہیں اور کان آپ کی آواز سنتے ہیں۔انار کی ڈالیاں لد گئی ہیں۔سرخ انار آپ کے ہاتھوں کا انتظار کرتے ہیں۔ہم ابھی بھی آپ ہی کو دیکھ رہے تھے۔آپ گھوڑے پر سوار فوجیوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ہم ہر لمحہ آپ کے لیے اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ آپ کی حفاظت فرمائیں۔آپ کے خون کا ایک بھی قطرہ زمین پر نہ گرے۔سلیم آپ کے بنا ہم کیسے جی پائیں گے۔'' اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگی۔

''روتی کیوں ہو نیلوفر۔۔۔ہمیں پانی نہیں پلاؤ گی۔''

اُس کی ایک دم ہچکی بندھ گئی، ''نہیں نہیں۔۔۔آپ کبھی زخمی نہیں ہوں گے۔

ہم تو یہ سن کر ہی مر جائیں گے۔''

''آپ کچھ کچھ دیوانی سی لگ رہی ہیں۔ آنکھیں کھولیں اور ہماری طرف دیکھیں۔''

''نہیں۔۔ہم آنکھیں نہیں کھولیں گے۔!''

''نیلوفر۔'' اُس نے قدرے زور سے آواز دی اور نیلوفر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ آئینے میں سلیم مسکرا رہا تھا۔

''آپ۔۔۔؟'' اُس نے حیرت سے دیکھا،'' آپ کب اور کیسے آ گئے ہیں؟''

''نیلوفر ہم بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔''

''کیوں نہیں رہ سکتے ہیں۔؟'' وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہوگئی،'' جب ہم رہ سکتے ہیں تو آپ بھی رہ سکتے ہیں۔'' وہ کہے جا رہی تھی،'' کتنی خوشامد سے، منتوں مرادوں سے، امام ضامن باندھ کر آپ کو ہم نے بھیجا تھا۔ اور۔ اور آپ۔۔ آپ پیٹھ دکھا کر واپس آ گئے؟'' اُس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں،'' سلیم آپ سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم آپ کو کئی بار بتا چکے ہیں کہ ہمارے ابا جان۔۔۔ اب آپ کو اور کیسے سمجھائیں؟''

''نیلوفر ہماری بات تو سنیں۔''

''کیا سنیں۔۔ یہی کہ ہم نکھٹو ہیں۔؟''

''نہیں نیلوفر!'' سلیم ایک دم سنجیدہ ہو گیا،'' ہم نہ تو پیٹھ دکھا کر آئے ہیں اور نا ہی بھاگ کر آئے ہیں۔ ہم تو صرف آپ کو ایک نظر دیکھنے آئے ہیں۔ کل ہمیں فوج کے ساتھ لکھنؤ کوچ کرنا ہے۔ کیا پتہ جنگ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔؟''

''سلیم!'' نیلوفر کے آنسوں ٹپ ٹپ گرنے لگے اور وہ ایک دم اُس سے لپٹ گئی،'' ہمیں معاف کر دیں سلیم۔۔ معاف کر دیں۔''

اُس نے پوری قوت سے اُسے بھینچ لیا۔

''آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے آپ کو امام ضامن باندھا ہے۔ آپ فاتح

بن کر آئیں گے۔ ہم آپ کا استقبال کریں گے۔'' وہ اُس سے اُسی طرح لپٹی ہوئی تھی، ''چلو نیچے چلتے ہیں۔ چچی جان کے پاس۔''

''ہم اُن کی دعائیں لے کر ہی آپ کے پاس آئے ہیں۔'' اُس نے نیلوفر کا چہرا اوپر اُٹھایا۔ اُس کی نظریں اُسی طرح جھکی ہوئی تھیں۔

''نیلوفر! ہم اُس پہلے اور آخری لمس کو اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں، جو کبھی اتفاقاً بے اختیار ہمیں مل گیا تھا اور آپ ناراض ہوگئی تھیں۔''

نیلوفر نے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے واضح کیا کہ وہ ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اُس کے اور قریب آگئی، بہت قریب۔۔۔

یہاں تک کہ دونوں کے ہونٹوں کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا۔

سپہ سالارِ اعظم مرزا مغل اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھے جنگی اُمور پر مشورے سُن رہے تھے کہ اُن کی کنیز خاص حاضر ہوئی۔ شہزادے نے خشمگیں نظروں سے اُس کی جانب دیکھا تو اُس نے شاہی آداب بجالائے اور عرض کیا، '' شہزادۂ عالم کا اقبال بلند رہے۔ اس بے وقت کی مداخلت پر کنیز شرمندہ ہے اور معافی کی خواستگار ہے۔ حضور آپ کے بزرگ حضرت مرزا الٰہی بخش آپ سے ابھی اور اسی وقت ملاقات کے متمنی ہیں۔''

مرزا مغل نے اپنے مشیروں کی جانب دیکھا، لیکن وہ سب خاموش رہے، اور شہزادے نے اُن کی خاموشی کو رضامندی خیال کیا، اور کنیز سے کہا، '' اُنھیں اجازت ہے۔''

کنیز نے شاہی آداب بجالائے اور بنا پیٹھ دکھائے وہاں سے رخصت ہوگئی۔ کچھ ہی لمحوں میں مرزا الٰہی بخش داخل ہوئے۔ اُن کے استقبال کے لیے شہزادہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جونہی مرزا الٰہی بخش نے شاہی سلام کے لیے گردن جھکائی، شہزادہ فوراً کہہ اُٹھا، ''رُک جایئے میرے بزرگ۔ ہم آپ کے مرتبے سے خوب واقف

ہیں۔ حضور ظلِ الٰہی بھی آپ کا ادب فرماتے ہیں۔ ہمیں گناہ گار نہ کیجیے گا۔''

مرزا الٰہی بخش کا چہرا خوشی سے تمتما اُٹھا،''شہزادے کی عمر دراز ہو۔ یہی وہ آپ کا اعلیٰ کردار ہے جس نے عالم کو آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے اور ہمیں آپ کے ساتھ ہونے والی کسی بھی حق تلفی کو برداشت نہ کرنے کی قوت عطا کر دی ہے۔''

''ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکے بزرگِ عالی وقار۔''

''مشیرانِ با عظمت سے نہایت معذرت کے ساتھ، یہ نمک خوار شہزادے عالی وقار سے تنہائی میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔''

مشیران کے دل دھڑکنے لگے، وہ اس مکار بوڑھے کی فطرتوں سے خوب واقف تھے۔ لیکن چونکہ اُس کا تعلق شاہی خاندان سے نسبی تھا اور اُس کا ادب شاہی خاندان کا ہر فرد کرتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر جانے لگے۔

''نہیں نہیں۔۔ آپ تمام یہیں پر موجود رہیں۔ ہم خود اپنے بزرگ کے ساتھ گوشہ تنہائی میں جاتے ہیں۔''

مرزا مغل نے محل کے اندر قدم اُٹھایا اور مرزا الٰہی بخش اُن کے پیچھے پیچھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ دونوں کے قدموں کی چاپ بھی معدوم ہو گئی۔

مشیران کی سرگوشیاں اُبھرنے لگیں۔

''شاہی گودام کا یہ کیڑا سب کچھ چاٹ جائے گا۔''

''ہاں۔ اس پر نظر رکھنا ضروری ہے۔''

''لیکن اس کے وقار اور بزرگی کا کیا کریں گے۔''

''خدا جانے آج یہ کس رنگِ دگرگوں کا سامان لے کر آیا ہے۔''

مرزا مغل نے دریچے سے باہر جھانکا۔ قلعہ معلیٰ میں ابھی تک سب کچھ درست تھا۔ رونقیں حسبِ حال تھیں۔ پہرے دار مستعد تھے۔ اور نقار خانے کے پاس نقارچی وقت کا تعین کر رہا تھا۔ مرزا مغل نے پلٹ کر مرزا الٰہی بخش کی طرف دیکھا،'' ہم ہمہ تن گوش ہیں۔''

''حضور! گستاخی معاف فرمائیں۔ بحیثیت سپہ سالارِ اعظم آپ کی کار کردگی بے داغ ہے۔ آپ نے اپنے حسنِ انتظام سے سب کا دل اور اعتماد جیت لیا ہے۔''

شہزادے کا سینہ فخر سے پھول گیا اور وہ مسکرانے لگا۔

''لیکن حضور ظلِ الٰہی خواہ مخواہ ایک میان میں دو تلواریں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔''

''سپہ سالارِ اعظم یہ بھی آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود صبر کا دامن نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ غلام کی اس تلخ کلامی کو معاف فرمائیں۔ وہ ناخواندہ بخت خان جو کبھی انگریزی فوج میں شامل تھا۔ اُسے تو سر پر بٹھایا جا رہا ہے۔ شہزادے جو اپنے سابق آقا سے وفاداری نہ کر سکا وہ خستہ حال خاندانِ مغلیہ کا وفادار کیسے رہ سکتا ہے؟ لیکن حضور عالم پناہ ہیں کہ اُس پر عنایات پر عنایات کیے جا رہے ہیں؟ ایک تو اُس نامراد کو آپ کے مقابل کھڑا کر دیا اور سپہ سالاری کا منصب اُس کے حوالے کر دیا اور اب سنا ہے کہ اُسے گورنر بہادر کا خطاب بھی عطا کیا گیا ہے۔ شاہی خاندان اس بے عزتی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمیں آپ کی ذاتِ باہمت پر پورا پورا اعتماد ہے، اور آپ کے خلاف ہونے والی ہر ناانصافی کے لیے یہ بوڑھا احتجاج کرتا رہے گا۔''

اس خوشامدانہ چرب زبانی نے ناعاقبت اندیش شہزادے کی عقل کو سلب کر دیا اور اُس کے دل کا چور پوری عجلت کے ساتھ باہر آ گیا، ''میرے شفیق بزرگ یہ باتیں تو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں اور آپ کی طرح، شاہی خاندان کا ہر فرد بھی یہی سوچ رہا ہے۔ مرزا ابوبکر، مرزا کوچک سلطان بھی آپ ہی کہ ہم خیال ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں، تیموری النسل اپنے خاندان کی عظمت اور اپنی انا کو خوب سمجھتی ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ دیکھتے ہیں بخت خان اپنی فتوحات کی تاریخ کیسے مرتب کرتا ہے۔''

مرزا الٰہی بخش کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی، وہ جس چنگاری

کو بھڑکانے کے لیے آیا تھا۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں شعلہ بن جائے گی یہ تو اُس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ فوراً جھک گیا اور شاہی آداب بجالاتے ہوئے کہنے لگا، ''شہزادے اب مجھے اس تعظیم سے نہ روکیں۔ میں کسی نوعمر شہزادے کے آگے اپنا سر تسلیم خم نہیں کر رہا ہوں بلکہ کسی غیور مستقبل کے شہنشاہ کی تائید کا اعلان کر رہا ہوں۔''

باہر تیز دھوپ میں ہر چیز جھلس رہی تھی۔

اور نقارچی نے بدلتے وقت کی کروٹ کا اشارہ سمجھا اور اس کے نقارے کی آوازیں پورے قلعہ معلّیٰ میں گونج اُٹھیں۔

حیدر خان کی ڈیوڑھی میں بہن کی سگائی پر خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ پکوان کی خوشبو مہک رہی تھی۔ تارا پھولوں سے لدی ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھوں پر مہندی کی سرخی عجب بہار دکھا رہی تھی۔ دینا ناتھ کچھ فاصلے سے اُس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے گلے میں بھی پھولوں کے ہار مہک رہے تھے۔ حیدر خان نے برسوں بعد اپنی خاندانی پگڑی باندھی تھی، اور کلف شدہ طرّا اُس کے خاندانی وقار کا اعلان کر رہا تھا۔ سبحان میاں گھر کے کسی بڑے بزرگ کی طرح ایک تخت پر الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے اور چنبیلی کی تھاپ ڈھولک پر پڑ رہی تھی اور اُس کی شوخ آواز کا جادو سب کا دل موہ لے رہا تھا۔

مالنیا میں کا لادے بیلا کی کلی
مالنیا میں کا لادے بیلا کی کلی

اللہ میاں کو چڑھیو بیلا کی کلی
مالنیا میں کالادے بیلا کی کلی

جہی کلی پنج پیراں کو چڑھیو
جہی کلی پنج پیراں کو چڑھیو

مالنیا میں کالادے بیلا کی کلی

مالنیا مئیں کا لادے بیلا کی کلی

جہی کلی سلطان میاں کو چڑھئیو

جہی کلی سلطان میاں کو چڑھئیو

کلی پکارے ۔۔ علی ۔۔۔ علی

کلی پکارے ۔۔ علی ۔۔۔ علی

ڈھولک پر تھاپ جم کر پڑنے لگی اور سبحان میاں وجد کی سی کیفیت میں اپنی جگہ سے اُچھلے اور اپنا نعرہ لگایا۔۔۔''دمادم مست قلندر۔۔دمادم مست قلندر۔۔۔

پھر اُنھوں نے تھرکتے تھرکتے گانا شروع کر دیا۔۔۔۔

مورے پیر کے صدقے مبارک ہووے یہ گھڑی

میں پی پی پکاروں، سہاگن بنی عجب گھڑی

آج رنگ ہے ری ماں آج رنگ ہے

دولہا پیا کے گھر رنگ ہے ری ماں رنگ ہے

حیدر خان نے بھی جواب دیا، حق ہے حق ہے حق ہے۔۔۔۔۔

اور پھر وہ بھی تھرکنے لگا، اور دونوں کے سر ایک ہو گئے۔

موہے پیر پائیو نجام الدین اولیا

نجام الدین اولیا، نجام الدین اولیا

نجام الدین اولیا، نجام الدین اولیا

آج رنگ ہے ری ماں رنگ ہے

آج رنگ ہے ری ماں رنگ ہے

نجام الدین اولیا جگ اُجیارو

جگ اُجیارو وہ تو جگ اُجیارو

جب دیکھے مورے سنگ ری ماں

آج رنگ ہے ری ماں رنگ ہے

پھر وہ دونوں تیز تیز قدموں سے رقص اور تالیوں سے ردم بناتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ چنبیلی نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہ بھی اپنی جگہ سے تھرکتی ہوئی اُٹھی اور تارا کے اردگرد پھیرے لینے لگی اور اُس کے بھی لبوں سے نکلا،

بن کے پنچھی بھئے باورے، ایسی بین بجائی سانورے
تار تار کی تاد نرانی، جھوم رہیں سب بن کی ڈاری
پنگھٹ کے پنہاری ٹھاری، بھول گئیں خسرو پنہیا بھرن کو
اے ری ماں۔آج رنگ ہے ری ماں
آج رنگ ہے ری ماں رنگ ہے۔۔۔

پھر تینوں رقص کرنے لگے۔ دینا ناتھ اور تارا کے چہروں پر خوشی پھولے نہ سماتی تھی۔ پھر دینا ناتھ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، اُس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور کلمے کی اُنگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے گانے لگا،

کیسے دن کٹے ہے جتن بتائے جی او
ایہی پار گنگا او ہی پار جمنا
بیچواں منڈیا ہم کو چھوائے جی او
انچرا پری کے کاگد بنا ال
اپنی سُرتیا ہیرے لکھائے جی او
کہت کبیر سنو بھائی سادھو
بہیاں پکر کے رہیا بتائے جی او
آج رنگ ہے ری ماں رنگ ہے
رنگ ہے ری ماں رنگ ہے

پھر ایک بار زور و شور سے رقص شروع ہو گیا، تالیاں گونجنے لگیں، قہقہے بلند ہونے لگے۔

دینا ناتھ اور تارا دونوں چپکے چپکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی لیتے اور

پھر نظریں جھکا لیتے تھے۔رقص رنگ اور تال کے بیچ اچانک ایک آواز اُبھری، ''حیدر بھائی۔۔!''

اور سب کے سب آواز کی طرف متوجہ ہوئے، اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔آواز پھر اُبھری، ''حیدر بھائی۔۔!''

''ارے یہ تو اپنا دوست پنڈت ہے!'' سبحان میاں کے منہ سے نکلا اور حیدر خان اور دینا ناتھ دروازے کی طرف بھاگے۔

''لو بہنیا، ایک براتی اور پہنچ گیا ہے۔'' چنبیلی نے تارا کو چٹکی لی اور تارا نے شرما کر سر جھکا لیا، ''اری بنو۔۔اب شرمانے سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ اُسے چھیڑنے لگی، ''تمہارے بھیا تھال بھر مٹھائی لائے ہیں۔اب سب کا منہ بھی میٹھا کرو اور اپنی سگائی کا اعلان بھی۔''

تارا نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

حیدر خان، سبحان میاں اور پندت نے دالان میں قدم رکھا۔

پندت نے حیرت سے تارا کی طرف دیکھا، ''یہ کیوں دُلہن بنی ہے؟''

''اُس کی سگائی جو ہو رہی ہے۔''

''کس کے ساتھ۔؟''

''اپنے ہونے والے دولہا ساتھ۔''

پنڈت نے جھوٹ موٹ اپنے دانت پیسے، ''ہم اُدھر جنگ میں اپنی جان دے رہے ہیں اور یہ اِدھر سگائی کے لڈو توڑ رہی ہیں؟''

''پنڈت جی شکوہ چھوڑیں۔'' چنبیلی اُسے بھی ستانے لگی، ''آپ ہی کا تو انتظار ہو رہا تھا، اب آپ جلدی سے تارا کا پاٹ لگا دیں۔''

''ایں۔۔۔؟'' پنڈت نے سب کی طرف دیکھا، ''ہم تو کنوارے ہی رہ گئے؟''

''بھائی پنڈت کیا کریں، ایک ہی بہنیا تھی، سو اُسے دینا ناتھ کو سونپ دیئے

ہیں۔''

''لیکن حیدر بھائی یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' پنڈت نے شوخ لہجے میں کہنا شروع کیا،''بہن کی سگائی اور بھائی کو ٹھینگا۔؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' سبحان میاں نے زور سے کہا،''میں تو سمجھا تھا کہیں رقیب روسیا تو نہیں آ گیا۔؟''

''سبحان بھائی تارا تو میری بھی بہن ہے نا۔ تارا کو میں ہمیشہ تارا بجو کہتا ہوں۔''

تارا کو ہنسی آ گئی۔

''اری اے لڑکی! وہاں بیٹھی کیا دانت دکھا رہی ہو۔؟'' سبحان میاں نے اُس کی جانب دیکھا،''ہمارا منہ کب میٹھا ہوگا۔؟''

تارا اپنی جگہ سے اُٹھی اور مٹھائی کی کشتی لیے سب سے پہلے حیدر خان کے پاس پہنچی۔ حیدر خان نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور مٹھائی کا ٹکڑا اُٹھایا اور تارا کو کھلایا،''میری بہنا سدا خوش رہو۔''

''تارا نے بھی مٹھائی کا ایک بڑا سا ٹکڑا اُٹھایا اپنے ہاتھ سے حیدر خان کے منہ میں ڈالا، اور کشتی کو رکھ کر اُس کے پاؤں چھونے لگی۔

''ارے میری لاڈلی بہنیا جُگ جُگ جئیو۔'' اور اُسے اپنے پیروں سے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

''بس کیا بہن بھائی ہی مٹھائی کھائیں گے۔؟''

''آپ کے پاس بھی آتی ہوں سبحان بھائی۔''

سبحان میاں نے مٹھائی کے دو ٹکڑے اُٹھا لیے اور پہلا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہنے لگے،''یہ رشتہ لانے کا تھا۔'' پھر دوسرا ٹکڑا بھی منہ میں ڈال لیا،''اور یہ ہے دولہا کے باپ کی حیثیت کا۔''

''اے نوج تو کیا آپ دولہا والوں میں شامل ہو گئے؟''

ابھی سبحان میاں چنبیلی کو جواب دینے کی سوچ ہی رہے تھے کہ دینا ناتھ تیزی سے اُٹھا اور اُن کے پاؤں چھوتے ہوئے کہنے لگا،''بھگوان تیری لیلا کا بھی جواب نہیں،تو نے دُلہن بھی دی بیاہ کا خرچ اُٹھانے کے لیے باپو بھی دے دیا۔''

سب نے قہقہہ لگایا اور سبحان میاں نے بڑے پیار سے اُس کے گال تھپتھپائے۔ تارا کشتی لیے چنبیلی کی طرف بڑھی اور چنبیلی فوراً تخت پر ماندی ڈال کر بیٹھ گئی۔ تارا نے اُسے مٹھائی کھلائی اور جیسے ہی پاؤں چھونے جھکی تو چنبیلی نے بوڑھی عورتوں کی طرح کہا،''اشٹ پُتر سو بھاگیہ وتی۔''

تارا نے گردن جھکا دی اور حیا اُس کے لبوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔

''ارے ہمیں دُلہنیا کا رشتہ دار نا سہی دولہے کا بھائی سمجھ کر ہی کوئی تو مٹھائی کھلائے؟''

''صبر کرو پنڈت۔۔صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''چنبیلی نے قدرے زور سے کہا۔

''بھابھی آپ ہی کے اُپدیش پر صبر کی غلطی کے کارن اب تک کنوارے پن کی سزا بھگت رہا ہوں۔''

سب کے لبوں سے پھر ایک بار قہقہے گونجے اور پنڈت اپنی جگہ سے اُٹھا، تارا کے پاس پہنچا، مٹھائی کا ٹکڑا اُٹھایا اور اُس کی آنکھوں میں شرارت سے جھانکتے ہوئے کہنے لگا،

''کاہے بیاہی یہ پردیس رے
بھیا ڈھونڈھے بیچارہ رے
گلیاں دو گلیاں ڈھونڈھے شہر سارا رے
کاہے یہ بیاہی پردیس رے۔۔۔''

پھر مٹھائی والا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا اور جیسے ہی تارا نے منہ کھولا، اُس

نے جھٹ خود ہی کھالیا۔

سب نے پھر ایک بار اور قہقہہ لگایا۔

ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ کی یہ محفل اسی طرح بہت دیر تک یونہی چلتی رہی۔

کانپور کے حالات بھی بدل رہے تھے۔ انگریزوں پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ جگہ جگہ منادی کے نقارے بج رہے تھے۔ چوراہوں پر جلی حرفوں میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا اعلان آویزاں کیا جارہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ یا تو اعلان ناموں کے قریب ہوتی یا پھر منادی کے نقاروں کے پاس پہنچ جاتی، اور منادا اعلان کرتے،

''سنوسنو۔ اورغور سے سنو۔! شہنشاہِ ہند کا فرمان سنو۔!''

پھر نقارہ زور سے بج اُٹھتا اور تمام لوگ ہمہ تن گوش ہوجاتے، اور منادا اعلان سناتا،

''میرے عزیز ہم وطنو! فرنگی اس ملک میں تجارت کے بہانے آئے اور حاکموں میں بدنظمی پھیلا کر، دھوکے اور فریب کی چالوں سے ہندو مسلمانوں کی ریاستیں چھین لیں۔ سابق حکمرانوں کو قید کیا اور فقیر بنادیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔ پھر ہمارا مذہب بدلنا چاہا اور جب کامیاب نہ ہوئے تو طاقت کے استعمال کا ارادہ کیا۔ ظلم زیادتی اور ناانصافیاں کیں۔ میں خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہوں کہ ان فرنگیوں کو نیست و نابود کروں اور ہندو مسلمان ریاستیں دوبارہ قائم کروں۔ میں نے نربدا کا شمالی علاقہ فتح کرلیا ہے۔ بہادرو! وقت آگیا ہے کہ اپنی تلواریں بے نیام کرو اور اس ظلم و زیادتی

کا بدلہ لو، جو تمہارے باپ دادا اور بادشاہوں کے
ساتھ روا رکھا گیا۔۔۔۔!''

اور پھر نقارہ گونجنے لگا اور اگلے چوراہے کی طرف مناد روانہ ہوئے۔ اس اعلان کی تشہیر پیشوا کی جانب سے کی جا رہی تھی۔ لوگ بھڑک اُٹھے۔ انگریزوں سے نفرت کا لاوہ پھٹ پڑا۔ مجاہدین کا لشکر تیار ہونے لگا اور وہ حملے کی تاک میں لگ گئے۔

الہ آباد میں بھی یہی اعلان پہنچا اور مہدی علی خان نے وہاں کی باگ ڈور سنبھال لی بلکہ چوتھائی کے حساب سے مالگزاری بھی جمع کرنا شروع کر دیا۔ اُن کی مدد کے لیے سنگرام سنگھ اور بینی بہادر سنگھ بھی پہنچ گئے۔ اطلاع یہ بھی تھی کہ رجمنٹ نمبر پانچ کی بے قاعدہ فوج سہسرام سے نکل کر کنور سنگھ کے ساتھ شامل ہو گئی ہے۔

انگریز پریشان تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے موت رقصاں تھیں اور وہ محفوظ پناہ گاہوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اُنھیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ انقلاب، خونی انقلاب بن چکا ہے۔

چنبیلی نے دالان کے بیچوں بیچ ایک کرسی لا کر رکھ دی، پھر سبحان میاں کو اُس پر بٹھا دیا اور پنڈت کی طرف دیکھا،'' بھائی پنڈت اب آپ تیار ہو جائیں۔ آقائے فاقہ مستان یعنی کے ہمارے سلطان، حضرت سلطان میاں کے دربارِ بے اعتبار میں آپ کی پیشی ہے۔''

''ہم حاضر ہیں۔''

''پنڈت دیا رام ولد۔۔!'' چنبیلی اٹک گئی،'' اپنے پتا جی کا نام بتائیں۔''

''پنڈت سکھا رام۔'' پنڈت نے فوراً کہا اور پھر سبحان میاں کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کرنے لگا،'' حضور، ثانی عدل جہانگیر! مدعی جب میرے باپ ہی کو نہیں جانتی ہے تو وہ مجھے کیا جانے گی؟ مقدمہ کیا خاک پیش ہو گا۔؟''

سبحان میاں نے چنبیلی کی طرف دیکھا،'' لیلیٰ حیدر خان! مدعی علیہ کا شک

بے بنیاد نہیں ہے۔ تم کو اپنی ناقص معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے۔''

''حضور انجمن محبانِ وطن دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وفاداری اور جان نثاری کی قسم کھانے کے باوجود یہ دلی سے کہاں فرار ہو گئے تھے۔''

''حضور مائی باپ! کانپور میں میرے نانا بہت بیمار ہو گئے تھے۔ اُن کا بلاوہ آ گیا تھا اور میں اُن کے حکم کو ٹال نہیں سکا۔ بس اسی لیے۔''

''سبحان بھائی واجد علی شاہ کی ناٹک منڈلی سے باہر آئیں۔'' اُس نے سب کی طرف دیکھا،''ایک نے اسی چکر میں سلطنت ڈبو دی، دوسرے اگر اب بھی یہ ناٹک بند نہ ہوے تو ہم ایک دن دلی بھی ہار جائیں گے۔''

پنڈت نے حیدر خان کی طرف دیکھا۔

'' بھائی پنڈت کانپور کا احوال سنائیں۔''

پنڈت نے ایک لمبی سانس لی اور کہنا شروع کیا،'' کانپور کا احوال بھی وہی ہے جو یہاں دلی میں ہو رہا ہے۔ میرٹھ میں کارتوس کے سبب انقلاب آیا اور کانپور میں وجہ بنا آٹا۔''

''آٹا۔؟'' چنبیلی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا،'' وہ کیسے؟''

''بازار میں سستا آٹا بکری کے لیے آیا، جو بدبودار تھا اور افواہ پھیل گئی کہ اس آٹے میں گائے اور سور کی ہڈیاں پیس کر ڈالی گئی ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ معاملہ گرم گیا ،اور فرنگی گھبرا گئے۔ جنرل وہیلر نے نانا صاحب کو پیغام بھیجا کہ وہ کانپور آئیں اور شہر کو بچائیں۔''

''اور نانا صاحب کانپور پہنچ گئے؟''

''ہاں۔'' پنڈت نے پھر کہنا شروع کیا،'' صوبے دار ٹیک سنگھ اور شمس الدین نے کانپور کو ان فرنگیوں سے پاک کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ عام آدمی اور فوج اُن کے ساتھ تھی۔ خبر یہ بھی گرم تھی کہ انگریزوں کی ہندوستانی رجمنٹ نمبر ۵۲ اور ۵۶ بہت پہلے ہی سوکھا گھاٹ پر نانا صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ مار چکی ہے۔''

''مطلب ساری تیاری ہو چکی تھیں۔'' سبحان میاں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

پنڈت نے اُن کی طرف دیکھا،'' سبحان بھائی یہ ہمارے نانا صاحب بڑے شریف انسان ہیں نا۔ فرنگیوں سے کہدیا کہ جاؤ اپنے بال بچوں کو کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا کر آو۔ ہم جب تک حملہ نہیں کریں گے۔''

''لیکن ان فرنگیوں نے تو ہمیں کبھی ایسا موقع نہیں دیا؟''

'' وہ ٹھہری ایک شاطر قوم، وہ بھلا ایسا موقع کیوں دینے لگی؟ خیر۔۔ مجاہدین کا لشکر نواب گنج کی طرف بڑھا۔ نانا صاحب کچہری کے پاس تھے۔خزانہ اُن کو مل گیا اور جنگی اسلحہ پر بھی اُن کا قبضہ ہو گیا مجاہدین نے فرنگیوں کے بنگلوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ مذہب کے نام پر لڑنے والے مولوی سلامت علی اور قاضی وصی الدین نے بھی اُس وقت نانا صاحب کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اپنی فوج کے ساتھ آ کر مل گئے۔ جنرل وہیلر نے نانا صاحب کو اُن کا وعدہ یاد دلایا اور وہ اُس کو پورا کرنے میں جُٹ گئے۔''

پنڈت کچھ سوچنے لگا اور سب بے چینی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پنڈت نے نظریں بلند کیں اوپر آسمان میں سیاہ بادل سفید بادلوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے، ہوائیں چل رہی تھیں، اور ایسا لگتا تھا کسی بھی وقت آسمان کا ایک ہی رنگ ہو جائے گا، ستی چورا کے گھاٹ پر نجاروں کی بڑی تعداد کشتیاں تیار کر رہی تھیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے نہایت آرام دہ چالیس کشتیاں تیار ہو گئیں، اُن پر شامیانے لگائے گئے، غلاف چڑھائے گئے، کھانے پینے کا سامان لادا گیا انگریز خواتین اور بچے گاڑیوں پر سوار ہو کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ ستی چورا کے گھاٹ پر پہنچ گئے۔ جنرل وہیلر خود پالکی میں سوار ہو کر آیا اور اُس کے خاندان کے افراد ہاتھی پر سوار ہو کر آئے۔ گھاٹ پر کشتیاں لگ گئیں۔ تاتیا ٹوپے، عظیم اللہ خان اور بالا صاحب مندر کے چبوترے پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جنرل وہیلر نانا صاحب کے قریب پہنچا اور

اُن کے ہاتھ کو جھک کر بوسہ دیا، ''یو آر گریٹ نانا صاحب۔۔! برٹش آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گا۔ آپ ہم لوگوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔''

نانا صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، ''جنرل کشتیاں تیار ہیں۔ آپ سب اُن میں سوار ہو جائیں۔''

جنرل وہیلر کی آنکھیں احسان سے جھک گئیں، ''تھینک یو نانا صاحب۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ گھاٹ پر کھڑے ہوئے مجاہدین کے لشکر کی جانب دیکھا، پھر کشتیوں پر نظریں ڈالیں اور پلٹ کر نانا صاحب کی طرف دیکھا، '' نانا صاحب ہم کو پھر بھی بہت ڈر لگتا ہے۔''

نانا صاحب نے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا، ''اب ڈر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ آرام سے الہ آباد پہنچ جائیں۔'' نانا صاحب نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور پھر اُنھوں نے قدرے سخت لیکن دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا، ''جنرل اس بات کا خیال رکھیں کہ دوبارہ میری زمین پر قدم رکھنے کی غلطی نہ کریں ورنہ آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو ہمیں اس وقت بھی کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے ہم ہندوستانیوں پر بہت ظلم کیے ہیں لیکن ہمارا دل دیکھیے۔ ہم پھر بھی آپ کو معاف کر رہے ہیں۔۔ جائیے۔''

جنرل وہیلر اپنے خاندان کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہو گیا، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہی انگریز خواتین و بچے کشتیوں میں بیٹھ گئے۔ تاتیا ٹوپے نے ہاتھ ہلا ہلا کر کشتیوں کو روانہ ہونے کا اشارہ کیا اور کشتیاں دریا کی لہروں پر آگے بڑھنے لگیں۔ عجیب منظر تھا۔ انگریز عورتیں اور بچے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر خیر خوبی سے پہنچنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ کشتیاں ستی چورا کے گھاٹ سے کچھ آگے بڑھ چکی تھیں کہ اچانک بندوقوں سے گولیاں اور توپوں سے گولے برسنے لگے۔ چیخ و پکار سے ماحول لرز اُٹھا۔ رونے دھونے کا شور تھا۔ خوف کے مارے انگریز عورتیں اور بچے دریا میں کودنے لگے۔ دریا میں گویا آگ لگ گئی تھی۔ ہلاکتوں کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہنے

والوں کو بچانا ناممکن تھا۔ نانا صاحب فوراً تاتیا ٹوپے کے پاس پہنچے اور اُن سے کہنے لگے، ''تاتیا یہ کیا ہو رہا ہے؟ کسی طرح اُن کو بچاؤ۔۔کچھ کرو۔''

لیکن اُس وقت اُن کو بچانا تاتیا ٹوپے کے بھی اختیار میں نہ تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے فوج کو حکم دیا کہ کسی طرح اُن کو بچائیں۔ چنانچہ بہت ساری خواتین اور بچوں کو بچالیا گیا۔ ستی چورا کے گھاٹ پر قیامتِ صغرا کا منظر تھا۔

پنڈت خاموش ہو گیا۔

سبھی خاموش تھے۔

بس سناٹا بول رہا تھا۔

آخر حیدر خان کی زبان سے نکلا، ''یہ تو وعدہ خلافی ہو گئی۔ جب اُنھیں پناہ دے دی گئی تھی اور اُن کے جانے کا بندوبست کر دیا گیا تھا تو پھر۔۔!''

اُس نے جملہ ادھورہ چھوڑا اور پنڈت کی طرف دیکھنے لگا۔

''حیدر بھائی یہ سوال آپ کی طرح تاریخ بھی ہمیشہ پوچھتی رہے گی، لیکن یہ ایک بڑی غلط فہمی تھی۔ ان پھنسے ہوئے انگریزوں کی مدد کے لیے ایک بڑے لشکر کے ساتھ جنرل ہیولاک کانپور کی طرف نکلا تھا۔ یہ سبھی کو پتہ تھا، کانپور میں جہاں ان فرنگیوں کی پناہ گاہ تھی اُس کے پاس ہی بارود کا ایک گودام تھا کسی وجہ سے اُس میں آگ لگ گئی اور دھماکے پر دھماکے سنائی دینے لگے۔ مجاہدین سمجھے ہیولاک نے حملہ بول دیا ہے، اور یہ سب کچھ ہو گیا۔''

''یہ جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا پنڈت۔'' حیدر خان نے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت پر سر کا پچھلا حصہ ٹیک دیا، ''جب بھی فرنگیوں کو کوئی ایسا موقع ملے گا وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔''

''اور جو عورتیں اور بچے ڈوبنے سے بچ گئے تھے بعد میں اُن کے ساتھ کیا سلوک۔۔؟''

''نانا صاحب نے اُن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔'' پنڈت نے چنبیلی

کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہنا شروع کیا، ''اُن کے ٹھہرنے کا عمدہ انتظام کیا، انھیں ہر طرح کی سہولت دی بس باہر نکلنے پر پابندی تھی۔'' پنڈت نے آسمان کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ سے کہا، ''اب دیکھنا یہی ہے کہ نانا صاحب اور ہیولاک کب ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئیں گے، اور تاریخ کو کیا انجام لکھوائیں گے۔''

''ہاں ۔۔ لکھنؤ میں بھی تاریخ کے کورے کاغذات پھڑ پھڑا رہے ہیں۔'' چنبیلی نے بھی آہستہ سے کہا، ''کل میں اور حیدر خان لکھنؤ جا رہے ہیں ۔''

''حیدر بھائی ۔۔!'' دینا ناتھ نے بھی ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا، ''اگر آپ اجازت دیں تو کل میں اور تارا بھی بنارس جائیں ۔؟''

''وہاں شادی کروگے ۔؟''

''ہاں! پتا جی تو اسی آس میں بھگوان کو پیارے ہو گئے، ماتا جی اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔''

حیدر خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، ''ضرور جائیں ۔۔ لیکن دینا ناتھ اس بات کا ہمیشہ خیال رہے، تارا میری بہن ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں، تارا کو اس جنم میں ہی نہیں سات جنموں میں بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

حیدر خان نے سلطان میاں کی طرف دیکھا۔

''بھئی ہم بھی بیٹی کے سنگ بنارس جائیں گے۔''

''سبحان بھائی ۔۔!'' چنبیلی نے اُنھیں چھیڑا، ''اب آپ کنویں جھانکنا چھوڑ ئیں بھی۔''

''تم چپ رہو بی بی ۔؟'' سبحان میاں نے اُس کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھا، ''ارے تم کیا جانو! تم نے بھی ابھی کہاں گیہوں کی بالی دیکھی ہے؟ معاملہ بیاہ کا ہے بزرگوں کا بیچ میں رہنا بہت ضروری ہوتا ہے۔''

''واہ ۔۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔'' چنبیلی نے دیدے مٹکائے۔

''اے بی بی تم کیوں دبلی ہو رہی ہو، تم اپنے مائیکے سدھارو۔ ہم تارا بٹیا کے ساتھ نہیں جائیں گے تو وہاں کنیا دان کون کرے گا۔؟''

''سبحان بھائی کوئی بھلا آپ سے کبھی جیتا بھی ہے۔؟''

''دمادم مست قلندر۔۔ دمادم مست قلندر۔''

☆☆☆

(۱۳)

رات سنسان تھی ۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ راستے کے دونوں جانب گھنی جھاڑیاں تھیں اور گھوڑا دھیمی چال سے دوڑ رہا تھا۔ آسمان پر آدھا چاند نکل آیا تھا، اور ہلکی ہلکی چاندنی درختوں سے چھن چھن کر زمین پر برس رہی تھی۔ دلبر داد خان نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، سامنے دور پہاڑی نظر آرہی تھی اور تا حدِ نظر گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ خوف کے مارے جینفر اُس کی پیٹھ سے بُری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ ایسی بھیانک اور سنسان رات میں کوئی جنگلی جانور حملہ بھی کر سکتا ہے۔ اُس نے اپنی تلوار میان سے نکال لی اور پوری طرح چوکنا ہو گیا اور پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی وہ برق رفتار دوڑنے لگا اور پورا جنگل اُس کے ٹاپوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

جب وہ گھنی جھاڑیوں سے باہر نکل آیا تو سامنے میدانی راستہ تھا اور چاندنی میں اب ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے جنیفر کو آواز دی، ''اوئے فرنگی بلبل ! کوئی بات کرو۔ رستہ کٹے گی۔''

وہ اُس سے اور بھی چمٹ گئی، ''خان ڈر کے مارے جان نکلتا ہے۔ بات کیا کرے گا۔؟''

خان نے قہقہہ لگایا، ''ہم کو اللہ تمہارا محافظ بنائی ،تم کیوں ڈرتی ہے۔؟ ہم اپنی جان دے دیگی مگر تم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گی۔''

جینفر نے پیار سے اُس کی پیٹھ میں اپنی اُنگلی چبھودی۔

خان نے پھر قہقہہ لگایا،''خانم تم ہم پر بھروسہ نہیں کرتی۔؟''

جینی کے لبوں پر بے بس مسکراہٹ پھیل گئی،''ابھی ہمارے پاس کوئی دوسرا چوائس بھی کدھر ہے۔؟''

خان خاموش ہو گیا۔

گھوڑا دوڑ رہا تھا۔

خان بڑبڑا رہا تھا،''اوئے گلبدن! ہم تم کو ابھی تک سمجھ نہیں سکی، تم کبھی ہمارا دوست بن جاتی، کبھی ہم کو دشمن کی نظر سے دیکھتی، کبھی ہم سے بات نہیں کرتی، کبھی نفرت کرتی، کبھی پانی میں کھیلتی، کبھی اللہ میاں کا گائے بن جاتی ہمارا سب حکم مانتی، رات کو ہمارا گلے میں ہاتھ ڈال کر سوتی۔۔اوئے خانم۔۔تم ہمارے ساتھ ایسا کیوں کرتی۔؟''

جینفر نے اُس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''اوئے تم کو نیند آتی؟''

''نہیں۔''اُس نے قدرے روکھے لہجے میں کہا،''خان راستہ خراب ہے سامنے دیکھنا مانگتا۔''

''اوئے لالہ کی جان گھبرانا نہیں۔۔یہ دیکھو۔؟''اُس نے تلوار والا ہاتھ بلند کیا،''اس کے بعد پہاڑی راستہ آئے گی، ہم اُس کو پار کریں گی، پھر کوئی اچھی جگہ دیکھ کر مقام کرے گی۔سمجھا تم فرنگی بلبل؟''

''ہوں۔''اُس نے صرف ہنکاری بھری۔

گھوڑا پہاڑی گھاٹ کے رستے پر دوڑنے لگا۔یہ راستہ پوری پہاڑی کے اطراف گھومتے ہوئے بلندی سے نیچے کی طرف لے جاتا ہے اور پھر نیچے دائرہ بناتے ہوئے ختم ہو جاتا ہے۔سرد ہواؤں کے جھکڑ شروع ہو گئے تھے اور خان ترنگ میں آ گیا۔اُس نے اپنا تلوار والا ہاتھ پھر ایک بار ہوا میں لہرایا اور گنگنانے لگا،

دل من طفلست ، گریہ می کند
از من گلہائی باغیچہ ھائی بیگانہ می خواھد
(میرا دل ایک بچہ ہے۔ گریہ کرتا ہے۔ مجھ سے مانگتا ہے پھول، کسی اجنبی کے باغ کے)

اچانک اُس کا گنگنانا بند ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کچھ لوگ پہاڑی سے اُتر رہے ہیں۔ اُس کی چھٹی حس نے اُسے آگاہ کر دیا کہ آگے خطرہ ہے اور اُس نے خراب راستے کے باوجود گھوڑے کی رفتار بڑھادی۔

وہ لوگ بھی تیزی سے نیچے اُتر رہے تھے۔

دلبر داد خان کا گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا تھا۔

جینفر کی نظریں بھی اُن لوگوں پر پڑ چکی تھیں۔ وہ ڈر کے مارے اور بھی اُس سے چمٹ گئی تھی۔

جھاڑیوں کی وجہ سے چاندنی بھی کم کم راستے پر پڑ رہی تھی۔

''اوہ گاڈ۔ ابھی کیا ہوگا۔؟'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

اور وہ جیسے ہی پہاڑی کے دائرہ بنانے والے مقام پر پہنچے، اُن کے اور گھوڑے کے درمیان چند قدموں ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا، اور اس سے پہلے کہ وہ سڑک پر کودتے، گھوڑا آگے نکل گیا۔ اُنھوں نے پتھر برسانا شروع کیا لیکن گھوڑے کی رفتار اُن کے پتھروں کی پہنچ سے دور ہوگئی۔ جینفر نے اُن کی طرف دیکھا وہ تیزی سے سڑک کے نیچے وادی میں اُتر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ہتیار تھے۔ اُنھیں پورا یقین تھا کہ اس بار جب گھوڑا دائرے میں گھومتے ہوئے نیچے پہنچے گا تو وہ اُس سے پہلے سڑک پر پہنچ جائیں گے۔

گھوڑا برق رفتار دوڑ رہا تھا۔ خان کے ہاتھ میں اُسی طرح تلوار تھی اور جینفر کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا تھا۔

''اوئے خانم ہماری بات سنو۔! اگلے موڑ پر وہ ہم کو گھیریں گی، تو ہم

گھوڑے سے اُتر جائینگی۔اُن کا مقابلہ کریں گی۔تم ڈریں گی نہیں گھوڑے کے ساتھ آگے نکل جائینگی۔سمجھی۔؟''

''تم کو چھوڑ کر۔۔ہم ایسا نہیں کر سکتا مین۔''

''اوئے تم ہمارا فکر مت کرو۔ہم شیر داد خان کی اولاد مارنا جانتی ہے تو مرنا بھی جانتی ہے۔تم ہماری پرواہ مت کرو۔وہاں سے بھاگ جانا۔سمجھی تم۔؟''

جینفر اور بھی گھبرا گئی اور اُس کی پیٹھ سے چمٹ گئی۔اُس کی زبان سے ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔گھوڑا پہاڑی چکر کاٹتا ہوا جیسے ہی نیچے اُترا اور کچھ آگے بڑھا تھا کہ خان نے دیکھا کہ وہ لوگ سڑک پر پہنچ گئے ہیں۔اُن کے ہاتھوں میں ہتیار ہیں۔خان نے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔

''خان ہم پیچھے نہیں لوٹ سکتا؟'' جینفر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''پیچھے بزدل بھاگتی ہے!ہم شیر داد خان کی اکلوتی اولاد بزدل نہیں ہے۔''

''خان کبھی کبھی۔۔!''

''ہم تم کو پہلے جو بات بتائی،تم اُس پر عمل کریں گی۔۔بس۔۔سمجھی؟''

اُس کی آواز قدرے سخت تھی۔

گھوڑا اُن کے قریب اور قریب پہنچ رہا تھا۔

جینفر کی گھبراہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

وہ چار تھے اور راستہ روکے کھڑے تھے۔

خان جیسے ہی اُن کے قریب پہنچا،اُنھوں نے ہتیار والے ہاتھ بلند کیے،اور خان نے تلوار کو بلند کیا،اور اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتے وہ گھوڑے سے نیچے کود گیا،اور لڑائی شروع ہوگئی۔جینفر خوف کے مارے چیخے جا رہی تھی۔اُنھوں نے خان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔خان اُن کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا،اور بار بار جینفر سے کہہ رہا تھا''اوئے گلبدن تم گھوڑا آگے بڑھا لو۔''

اور جینفر ڈری سہمی بس چلا رہی تھی اور رو رہی تھی۔

خان اُن چاروں کو رگیدتا ہوا پہاڑی کی اونچائی کی طرف لے گیا اور سڑک پر اتنا راستہ بن گیا تھا کہ گھوڑا نکل سکتا تھا۔ وہ لڑتے لڑتے چلایا، ''اوئے خانم تم بھاگو ادھر سے۔''

لیکن جینفر اُسی طرح کھڑی رو رہی تھی۔

خان غصّے سے دھاڑا،'' اوئے بزدل گدھے کی اولاد نکلو ادھر سے۔''

جینفر نے گھبرا کر گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا سرپٹ دوڑ گیا۔

گھوڑے کے نکلتے ہی خان نے اُن پر اس قدر شدت سے حملہ کیا کہ وہ اُس سے بچنے کے لیے کھائی کی جانب لپکے۔ خان نے پھر زوردار حملہ کیا اور اُن میں سے ایک پھسل کر کھائی میں گر پڑا۔ اب خان تلوار بھی چلا رہا تھا اور اُس کے منہ سے گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔

تینوں نے اُسے پھر ایک بار گھیر لیا اور پوری شدت سے حملہ کر دیا۔

جینفر کا گھوڑا پرند ہو چکا تھا۔ وہ خوف کے مارے اُس کی گردن میں جھول گئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اُسے گھوڑا کہاں لے کر جا رہا ہے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف کے مارے اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

خان لڑتے لڑتے اگرچہ تھک گیا تھا لیکن پھر بھی تینوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ بڑھ چڑھ کر حملے پر حملہ کیے جا رہے تھے۔ خان کبھی اُن کا وار روکتا اور کبھی خود اُن پر جارحانہ حملہ کرتا۔ وہ لوگ کچھ عجیب سی زبانیں بول رہے تھے۔ جس سے خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی مخصوص قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور چوری ڈکیتی قتل وخون ہی اُن کا پیشہ ہے۔ اُس پر حملہ کرنے کے لیے جیسے ہی اُن میں سے ایک نے کلہاڑا اُٹھایا، اُس کے ہاتھ کو نیچے آنے سے پہلے ہی خان کی تلوار نے اُس کا پیٹ چاک کر دیا اور وہ اُلٹ کر گرا، اور اُس کے منہ سے ایک دردناک چیخ اُبھری۔ اب وہ صرف دو رہ گئے تھے۔ اُنھوں نے خان پر پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دیا اور سنسان رات میں ہتیاروں کے ٹکرانے سے وحشت ناک آوازیں گونج رہی تھیں۔ خان پھر ایک بار اُن کو رگیدتا ہوا

کھائی کی طرف لے گیا اور جیسے ہی اُس نے اُن پر وار کیا، اُن میں سے ایک شخص اپنا توازن کھو بیٹھا اور کھائی کے حوالے ہو گیا۔ اُس کی چیخ کی آواز، آوازِ جرس بن کر بہت دیر تک گونجتی رہی۔ چوتھے شخص نے جب یہ دیکھا کہ وہ اکیلا ہی رہ گیا ہے تو وہ جھکائی دے کر بے تحاشہ بھاگ نکلا۔ خان نے اُس کا پیچھا شروع کیا حالانکہ لڑتے لڑتے اُس کی سانس پھولنے لگی تھی، لیکن اُس کے تعاقب میں وہ اُسی طرح دوڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے قریب پہنچ گیا اور اُس کی پیٹھ پر ایسی تلوار ماری کہ وہ نیچے گرنے لگا، لیکن گرتے گرتے اُس نے بھی پھرتی سے خان کے پیروں پر وار کیا۔ خان بہت تیزی سے پیچھے کی جانب اُچھلا لیکن پھر بھی اُس کی تلوار خان کی ایک پنڈلی کو چاٹ گئی اور خان نے پوری قوت کے ساتھ اُس کے پیٹ میں تلوار بھونک دی۔ اُس کے منہ سے بھی ایک دل دہلانے والی چیخ نکلی اور پھر وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ مسلسل لڑتے لڑتے خان بھی تھک گیا تھا۔ اُسے بھی چکر سے آنے لگے اور وہ بھی زمین پر گر گیا۔ خون اُس کی پنڈلی سے رس رہا تھا اگرچہ وار زیادہ گہرا نہ تھا۔

جینفر کو لیے گھوڑا بہت دیر تک دوڑتا رہا، اور جب اُس کے ہوش ٹھکانے پر آئے تو اُس نے دیکھا وہ پہاڑی کے آخری سرے تک پہنچ گئی تھی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سارا علاقہ سنسان تھا۔ اُس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اُسے روک لیا۔ اُس کی آنکھوں میں خان اُبھر آیا جو چاروں طرف سے گھر الڑ رہا تھا۔ اُس وقت بھی اُس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی اور وہ چلا رہا تھا، جینفر گھوڑا نکالو۔ جینفر یہاں سے بھاگ جاؤ، اُس نے دل ہی دل میں کہا، ''ہاؤ سویٹ یو آر خان۔ تم ہم سے کتنا پیار کرتا ہے۔'' اُس کی آنکھوں میں آنسوں اُمڈ آئے۔ اُس نے گھوڑے کو واپسی کے لیے موڑا، اور پھر گھوڑا بے تحاشہ دوڑنے لگا اور وہ بے اختیار چیخنے لگی، ''خان۔ خان۔ خان۔۔'' سنسان علاقے میں اُس کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ خان۔ خان۔۔ خان۔۔۔

گھوڑا برق رفتار دوڑ رہا تھا۔

''بیچارہ خان! جانے کس حال میں ہوگا۔''اُس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر چلانے لگی،''خان۔خان۔۔خان۔۔''

گھوڑے کی ٹاپوں سے زمین دہل رہی تھی۔

چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔

چاندنی کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔

وہ پھر چلائی،''خان۔خان۔۔خان۔۔!''

اُس کا سارا بدن اب بھی خوف سے کانپ رہا تھا۔

اُس نے دور سے دیکھا سڑک پر دو جسم پڑے ہوئے تھے۔

وہ پھر چلائی،''خان۔خان۔۔خان۔۔۔!''

گھوڑا اُسے وہاں تک واپس لے آیا۔ وہ گھوڑے سے نیچے اُتری۔ خان زمین پر بے حرکت پڑا ہوا تھا، اور اُس کے نزدیک ہی حملہ آور کی لاش پڑی تھی۔ وہ تیزی سے خان پر جھکی۔ اُس کی نبض ٹٹولنے لگی، اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا،'' تھینکس گاڈ۔۔!'' وہ اُسے جھنجھوڑنے لگی، آوازیں دینے لگی،'' خان۔۔خان۔۔ خان۔۔!''

خان نے آنکھیں کھولیں، اور وہ اُس سے بے تحاشہ لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خان اُس کی پیٹھ کو سہلا رہا تھا۔

اور وہ دیوانہ وار اُسے چومنے لگی۔

خان کا چہرا، داڑھی، سر کے بال گرد اور دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اچانک اُس کی نظریں خان کی پنڈلی پر پڑیں۔ زخم سے خون رس رہا تھا۔ وہ تڑپ اُٹھی۔ گھوڑے کی پیٹھ سے چھاگل اُتاری۔ خان کو پانی پلائی اور پھر اپنے اسکرٹ کے گھیرے میں سے ایک پٹی پھاڑی اور خان کے زخم پر باندھتے ہوئے بولی،'' خان ہمارے واسطے تم اپنی جان کو کب تک داؤ پر لگائے گا؟''

''جب تک ہماری جان میں جان ہے۔'' خان نے آہستہ سے کہا۔

وہ اُس پر برس پڑی، ''ایک دن تم ہم کو بچاتے بچاتے خود مر جائے گا؟ ہم تم کو کیا دے گا۔ بولو۔۔۔ ہم تم کو کیا دے گا، کچھ بھی تو نہیں۔''

خان کے چہرے پر معصوم مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''تم کیا سمجھتا ہے، اس طرح احسان کر کے تم ہمارے دل میں اپنے لیے جگہ بنا لے گا؟'' اُس کے چہرے پر طنز اُبھر آیا، ''تم عورت کو کیا جانتا ہے؟ وہ دنیا کا سب سے بڑا احسان فراموش ہوتا ہے۔ وہ کب تمہارا احسان کو بھول کر دوسرے سے دل لگا لے گا تم سوچ بھی نہیں سکتا۔ سمجھا تم۔؟''

''ہم وہ سب کچھ نہیں جانتی، ہم تو بس اتنا جانتی کہ ہم تم سے بہت پیار کرتی ہے۔''

''اوہ نونونو۔۔ پتھر پر پھول نہیں کھلتا خان۔؟'' وہ پھر اُس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

خان نے اُس کے کان میں آہستہ سے کہا، ''اوئے گل بدن، پتھر میں پھول کھل رہی ہے۔''

وہ تیزی سے اُس سے علیحدہ ہوئی اور اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ نیلی نیلی آنکھوں سے شبنم کے قطرے ٹپکنے لگے تھے۔

دونوں کے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

خان نے اُسے لپٹا لیا تو اُس نے بھی اُس کے کان میں سرگوشی کی، ''خان! احسان، دلچسپی تو پیدا کرتا ہے بٹ لو نہیں۔ پیار نہیں۔''

''اور دلچسپی۔؟'' خان نے اُسے زور سے بھینچ لیا۔

''مس انڈر اسٹینڈنگ۔۔ وہ کیا بولتا تم۔۔۔ غلط فہمی۔''

خان کے لبوں پر ہنسی آ گئی، ''ابھی ہمارے واسطے یہی بہت ہوتی خانم۔''

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اسے گود میں اُٹھا لیا۔ جینفر اُس سے بُری طرح لپٹ

گئی۔ وہ اُسے لے کر گھوڑے کی طرف بڑھا اور پھر اُسے بہت پیار سے گھوڑے پر بٹھا دیا اور خود بھی اُچک کر اُس کے پیچھے بیٹھ گیا اور گھوڑا رات کا سینہ چاک کرتے ہوئے دوڑنے لگا۔

نمازِ فجر سے فراغت پاتے ہی سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ توشے تیار ہوگئے۔ ضروری سامان باندھ لیا گیا۔ اسلحہ کی صاف صفائی ہوگئی تھی۔ چنبیلی حسب معمول مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ تارا کو بھی اُس نے مردانہ لباس پہنا دیا تھا۔ سبحان میاں کا وظائف پڑھنا ختم ہو چکا تھا اور وہ بھی تیار تھے۔ دینا ناتھ سفید دھوتی اور قمیض میں خوب جچ رہا تھا۔ پنڈت ہر ایک کے کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ سب کے چہروں پر آج عجیب سی بشاشت نظر آ رہی تھی۔

چنبیلی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ صندوق میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا، اور اُسے لے کر تارا کے پاس پہنچی اور اُس کے سامنے اُسے کھول دیا۔ ہمہ اقسام کے سونے کے زیورات تھے اور اُن میں ہیرے چمک رہے تھے۔ تارا نے زیورات کی طرف دیکھا اور اُس کے کانوں میں چنبیلی کی آواز پہنچی، ''میری بہنا یہ وہ زیورات ہیں جو حیدر خان کی والدہ نے اپنی بہو کے لیے جمع کیے تھے۔ لیکن میں وہ بدقسمت بہو ہوں جو اُن کی حیات میں نہ آئی۔ تم اس گھر کی بیٹی ہو اور میں نے بڑی بھاوج کے ناطے یہ زیورات تمہارے سامنے لا کر رکھ دیئے ہیں۔ ان میں سے جو بھی تمھیں پسند آئے اُٹھالو۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

تارا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے عجیب نظروں سے چنبیلی اور حیدر خان کی طرف دیکھا اور پھر آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔ حیدر خان اُس کے قریب پہنچا اور اُسے لپٹا لیا، ''میری لاڈلی بہنا اس طرح روتے نہیں۔''

تارا کی زبان سے کوئی لفظ نکلا نہیں لیکن اُس کی آنکھیں وہ سب کچھ کہہ رہی تھیں جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ اُس کے دماغ میں جذبات کی جمنا کے تیز دھارے بہہ

رہے تھے اور لفظ جامد ہو گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ حیدر خان سے اُسی طرح لپٹی رہی۔

''تارا تم جو کچھ بھی سوچ رہی ہو وہ سب غلط ہے۔'' چنبیلی اُسے سمجھانے لگی ،''اپنے احساسات کو آنسو نہ بناؤ، وہ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ ان کو کوئی بہن نہیں تھی لیکن تم نے ان کو اتنا پیار سمان دیا کہ سات جنموں میں بھی شاید کوئی بہن اپنے بھائی کو نہ دے سکے۔ تارا ہم تو اُلٹا تمہارے احسان مند ہیں۔''

تارا نے چنبیلی کی طرف دیکھا۔

''تم کیا سمجھتی ہو تمہارے بھیا اور میں تمہیں بھول جائیں گے؟ پگلی! یہ جنگ جیسے ہی ختم ہوگی ، ہم دونوں دوڑے دوڑے تمہارے پاس ،تمہارے گھر آئیں گے۔ سمجھی؟ اور کہاں ہے وہ دینا ناتھ۔۔۔؟'' اُس نے ادھر اُدھر دیکھا اور دینا ناتھ اُس کے پاس پہنچ گیا، اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی،'' دینا ناتھ ہم نے تم پر کوئی شرط نہیں لگائی لیکن بھیا ایک وچن دیں کہ جب بھی تارا کو ہماری یاد ستائے تم اُسے لے کر دلی آئیں گے۔''

''بھابھی!'' دینا ناتھ نے سب کی طرف دیکھا،'' وہاں ہے بھی کون؟ بس ایک ماں۔ اُس کے آشرواد سے سارے رشتہ داروں کے بیچ بیاہ رچالیں گے بس! اس کے بعد تو ماں کو بھی لے کر اسی دلّی میں آجائیں گے۔ اب تو خوش رہیں گی نا ہماری دُلہنیا اور اُس کی بھابھی جی۔؟''

چنبیلی کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور تارا نے بھی خود پر قابو پالیا۔ اُس نے زیورات کا ڈبہ اُٹھایا اور سیدھا چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ چنبیلی بھی اُس کے پیچھے دوڑی۔ تارا صندوق بند کر رہی تھی۔ اُس نے اُسے روک دیا۔ ڈبہ پھر ایک بار باہر نکلا اور چنبیلی نے چندن ہار اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ تارا کے آنسوں پھر چھلک اُٹھے تھے۔

پنڈت نے جو یہ منظر دیکھا تو وہ بھی وہاں پہنچ گیا اور چنبیلی سے مخاطب ہوا،'' یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں بھابھی، آپ سارے گہنے تارا کو دیئے جا رہی ہیں؟ اس دیور کی

ڈلہنیا کے لیے بھی تو کچھ رکھیں۔؟''

تارا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''دیور جی پہلے ڈلہنیا تو لائیں؟''

''آپ نہیں لائیں گی؟''

''اس خاندان کی کچھ ریت ہی ایسی ہے۔تمہارے بھیا کی ڈلہنیا کو کس نے لایا تھا؟''

پنڈت جز بز ہو کر رہ گیا۔

اور حیدر خان کی آواز ابھری، ''میرا یہ خاندان ہندوستان میں سب سے نیارا خاندان ہے پنڈت۔سلطان میاں ہمارے بزرگ، تارا میری بہن، دینا ناتھ میری بہن کا شوہر، تم میرے چھوٹے بھائی۔ ہمارے درخت کا ہر پنچھی اپنی مرضی کی عبادت کرتا ہے۔اپنی اپنی شاخ پر بیٹھتا ہے لیکن اُن کی محبتیں ایک ہیں۔میرے بھائی کل تم ہی اس کے وارث ہونگے۔وچن دو کہ تم اس میراث کو کبھی گہن نہ لگنے دو گے۔''

پنڈت کی آنکھوں میں اعتماد کی گنگا جمنی لہریں اُٹھ رہی تھی۔

ٹھیک اُسی وقت نقارے پر چوٹ پڑنے لگیں۔

گھوڑوں پر سامان سفر لادا جانے لگا۔

اور پھر یہ خاندان گھوڑوں پر سوار ہو گیا۔

'' پنڈت۔'' حیدر خان نے اُسے اپنے قریب بلایا، '' دلّی ہم تمہارے حوالے کیے جا رہے ہیں۔اس کی حفاظت کرنا، اسے بکھرنے نہ دینا کیونکہ یہ سارے ہندوستان کا دل ہے۔''

ایک کے پیچھے ایک گھوڑا قدم بڑھانے لگا، اور پنڈت کا ہاتھ بہت دیر تک ہوا میں لہراتا رہا۔

دلّی سے مجاہدین کا ایک گھوڑ سوار دستہ اودھ کی حمایت میں لکھنؤ کے لیے نکلا،

یہ فوجی جوش میں نعرے لگاتے ہوئے، رجز گاتے ہوئے شہر کی مختلف شاہراؤں سے اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے گھوڑے دُل کی چال چل رہے تھے۔ دروازوں کھڑکیوں اور چھت پر کھڑے ہو کر مرد، خواتین اور بچے ہاتھ ہلا ہلا کر اُن کے حوصلوں کی داد دے رہے تھے۔ کوئی اُنھیں پھولوں کے ہار پہناتا، کوئی اُنھیں اپنے گھروں میں رکھی ہوئی تلواریں اور بندوقیں عنایت کرتا اور وہ ان تحفوں کو قبول کرتے ہوئے آخر دلّی کے آخری سرحد پر پہنچ گئے اور جیسے ہی اُن کے گھوڑوں نے لکھنؤ جانے والی شاہراہ پر قدم بڑھائے اُن کی رفتار تیز ہوگئی، اور اُن کے ٹاپوں کی آوازوں سے سارا ماحول دہلنے لگا۔

کھیتوں کی منڈیروں سے کسان دیکھ رہے تھے اور گھوڑے نظروں سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ اُن کے پیچھے اُٹھنے والا گرد وغبار آسمان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گھوڑے آگے پیچھے چار چار جتھے جتھے کی قطاروں میں دوڑ رہے تھے۔ کوئی آگے نکل جاتا اور کوئی پیچھے رہ جاتا۔ وہ پھر ایڑ لگاتا اور بہت تیز آگے نکل جاتا۔ حیدر خان نے پلٹ کر دیکھا، چنبیلی کا گھوڑا پیچھے رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنی رفتار قدرے کم کر دی تھی اور اُس کا انتظار کرنے لگا۔ گرد اور دھول میں دوڑتا ہوا چنبیلی کا سفید براق گھوڑا اُسے نظر آ گیا۔ اُس نے اُسے تیز تیز آنے کا اشارہ کیا، لیکن اُس سے پہلے ہی ایک اٹھارہ اُنیس برس کا نوجوان کسی شہ سوار کی مانند دھول اُڑاتا ہوا برق رفتار اُس کے سامنے سے نکل گیا اور وہ اُسے دیکھتا رہ گیا۔

گھوڑے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ آسمان میں سورج چمک رہا تھا اور لمحہ لمحہ اُس کی حدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر چنبیلی کا گھوڑا بھی حیدر خان تک پہنچ گیا اور پھر دونوں نے گھوڑوں کی رفتار بڑھا دی۔

کان پور کے عالی شان سندر پرساد سدن کے حجرۂ خاص میں نانا صاحب

بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ تبھی ایک داسی داخل ہوئی۔ شاہی آداب بجالائی اور عرض کیا،" سرکار روِ جئے بھوَ ۔۔۔ آپ کے مترعظیم اللہ خان پدھارے ہیں۔"

نانا صاحب نے پلٹ کر ایک نظر داسی پر ڈالی اور پھر آہستہ سے کہا،" اُنھیں شیگر ہی یہاں بھیج دو۔"

داسی شاہی آداب ادا کرتے ہوئے لوٹ گئی اور نانا صاحب پھر اُسی طرح ٹہلنے لگے۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا، اس بے مروت دنیا میں کتنے لوگ ہونگے جو عظیم اللہ خان کی طرح وفادار اور سچے انسان ہونگے ۔؟ میری خاطر اُنھوں نے کیا نہیں کیا۔ ان کم بختوں سے اپنی بات منوانے کی خاطر انگلستان بھی گئے۔ ہر ممکن طرح سے میری سفارت کی۔ اب یہ میری بد قسمتی ہے کہ نتیجہ کچھ نہیں نکلا، اور پھر یہ بھی تو اُن ہی کا مشورہ ہے کہ ہندوستان سے فرنگیوں کو نہ تو صرف مسلمان نکال سکتے ہیں اور نا ہی اکیلے ہندو، جب تک یہ دونوں قومیں ایک ساتھ ایک محاذ پر جمع نہیں ہوجاتی ان فرنگیوں کے قدم نہیں اُکھڑ سکتے۔ آج میری فوج میں یہی بات ہے۔ اُن کی سوچ کا پہیا ابھی گردش ہی کر رہا تھا کہ عظیم اللہ خان داخل ہوئے اور نانا صاحب نے آگے بڑھ کر اُنھیں گلے لگا لیا،" میرے بھائی عظیم اللہ تم اودھ کے حالات دریافت کرنے گئے تھے، وہاں کا کیا حال ہے؟"

عظیم اللہ خان نے مسکرا کر نانا صاحب کی طرف دیکھا،" مبارک ہو نانا صاحب! پورا اودھ انگریزوں کے خلاف صف آراء ہو چکا ہے، اور کئی مقامات سے اُن کے قدم اُکھڑ چکے ہیں۔ یہی حال رہا تو اودھ اُن کی عمل داری سے نکل جائے گا۔ فیض آباد پر مولانا احمد اللہ شاہ کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے۔ سلطان پور پر مہدی حسن، ان مجاہدین نے سندیلہ اور خیر آباد میں فرنگیوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ سلطان پور کی سڑک پر انگریزی افواج کو روک دیا ہے۔ وہ اب لکھنؤ نہیں پہنچ سکتے۔ مجاہدین اُنھیں شکست پر شکست دے رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ہینری لارنس اپنی فوج کے ساتھ اب چنہٹ پہنچ رہا ہے۔"

''بہت اچھی خبریں لائے ہو تم عظیم اللہ خان۔ ہمارا دل خوش ہو گیا۔''

''نانا صاحب اگر مجاہدین نے جھٹ پر انگریزوں کو شکست دے دی تو یقین جانئے اودھ پر پھر سے ہندوستانی حکومت قائم ہو گئی۔''

''ایسا ہی ہو میرے بھائی، اور ایسا ہی ہو گا۔'' نانا صاحب خوشی سے سرشار ہو گئے۔ ''مجاہدین کے ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا مقابلہ کرنا اُن کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے۔ بس دعا کریں کہ ہمارا اتحاد اسی طرح باقی رہے۔''

داسی پھر ایک بار داخل ہوئی، نانا صاحب نے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اُس نے نہایت ادب سے کہا، ''سرکار تا تیا ٹوپے پدھارے ہیں۔''

''اُنھیں فوراً بھیج دو۔''

عظیم اللہ خان نے نانا صاحب کی طرف دیکھا۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں عظیم اللہ خان۔؟''

''یہی کہ ہیولاک ایک بڑے لشکر کے ساتھ کان پور کے قریب پہنچ رہا ہے اُس کو روکنا نہایت ضروری ہے۔''

''اُسے آنے دو۔۔ ہماری فوجیں بھی اُس کی راہ دیکھ رہی ہیں۔''

''آپ ٹھیک فرما رہے ہیں نانا صاحب!'' تا تیا ٹوپے نے سلامی دی۔ اور نانا صاحب نے اُسے بھی گلے سے لگا لیا۔

''تا تیا اطراف کی کیا خبریں ہیں؟''

''نانا صاحب!'' تا تیا ٹوپے نے کہنا شروع کیا، ''اس وقت تو سارے ہی شمالی ہندوستان میں ان فرنگیوں کے خلاف تلواریں اُٹھ رہی ہیں۔''

''یہی تو بھگوان کی بھی اچھا ہے تا تیا۔'' نانا صاحب کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نانا صاحب! آعظم گڑھ سے اطلاع آئی ہے کہ سترھویں رجمنٹ نے انگریزوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ سات لاکھ کا خزانہ جو گورکھپور اور آعظم گڑھ سے بنارس جا

رہا تھا اُسے بھی لوٹ لیا گیا ہے ۔ انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگا دی گئی ۔ کوارٹر سارجنٹ لیوس اور لفٹنٹ ہیچس کو قتل کر دیا گیا ہے اور وہ سارے ہی مجاہدین فیض آباد میں مولوی احمد اللہ شاہ کی فوج میں شامل ہونے کے لیے نکل پڑے ہیں ۔''

''تا تیا راؤ ۔'' نانا صاحب نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی ،'' یہ بہت اچھی خبر تم نے سنائی ۔''

''نانا صاحب کچھ بُری خبریں بھی ہیں ۔''

نانا صاحب نے حیرت سے تا تیا ٹوپے کی طرف دیکھا،'' مطلب ۔۔؟ ''

''مطلب یہ کہ کچھ دیسی رجمنٹ جن میں سکھ اور گورکھا بٹالین شامل ہیں وہ انگریزوں کی وفاداری کا دم بھر رہی ہیں ، اور اُن سے خدمت کا ایک موقع مانگ رہی ہیں ۔''

''تا تیا ۔'' نانا صاحب نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا،'' ہمارے دیش کی مٹی میں شاید کہیں یہ بھی تاثیر موجود ہے ، غلامانہ ذہنیت ، دھوکہ دہی ، اور بک جانا ۔۔لیکن اُن سے کیا ہوگا ۔۔؟ تاریخ بتاتی ہے کہ راجہ پورس ہار کے بھی جیت گیا اور امبھی سکندر اعظم کے پیروں پر گر کر بھی اُس کے دل تک نہ پہنچ سکا۔نواب سراج الدولہ ہو یا ٹیپو سلطان شہید ۔۔اُن کے غداروں کو کیا ملا ؟ آہ ہم تو آج بھی ایسے غداروں کے لیے یہی پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں ۔''

'' نانا صاحب ۔''عظیم اللہ خان نے پورے جوش کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی مٹھی ماری اور پھر گویا ہوا،'' تا تیا ٹوپے صاحب آ گئے ہیں ، اب ہمیں اگلی جنگ کا منصوبہ تیار کرنا چاہیے ۔کیا کہتے ہو تا تیا ٹوپے صاحب؟''

''بے شک ۔''

اور پھر نانا صاحب ، عظیم اللہ خان اور تا تیا ٹوپے محل کے ایک وسیع و آراستہ ہال میں داخل ہوئے اور اُسے اندر سے بند کر دیا۔

دلّی سے نکلا ہوا گھوڑ سوار دستہ منزل بہ منزل بڑھتے ہوئے آخر سیتاپور پہنچ گیا اور وہاں پر اُس نے پڑاؤ ڈال دیا۔ خیمے لگ گئے۔ عوام جوق در جوق اُن بہادروں سے ملنے، دلّی کی فتح کی داستان سننے اور اُنھیں دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑے۔ یہیں پر مجاہدین کو اطلاع ملی کہ ہینری لارنس کا لشکر چنہٹ کی طرف بڑھ رہا ہے، اور سلطان پور کے مجاہدین بھی چنہٹ پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ طئے ہوا کہ وہ لوگ بھی رات یہاں گزار کر صبح چنہٹ کی طرف کوچ کریں گے اور مولانا احمد اللہ شاہ کی قیادت میں اس معرکہ میں شامل ہو جائیں گے۔

اس عارضی کیمپ کا نظارہ بھی عجیب تھا۔ رات آتے ہی مشعلیں اور قندیلیں روشن ہو گئیں۔ کھانا تیار ہوا۔ تمام مجاہدین نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور پھر اپنے اپنے خیموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گرمی کی شدت تھی۔ حیدر خان اور چنبیلی بھی اور سارے مجاہدین کی طرح اپنے خیمے کے باہر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ وہی نوجوان ایک بار پھر حیدر خان کی نظروں میں آ گیا، جس کی گھوڑ سواری دیکھ کر وہ بھی دنگ رہ گیا تھا۔ وہ نوجوان جیسے ہی اُس کے سامنے سے آگے بڑھا، حیدر خان نے اُسے آواز دی، ”سنو میاں! ادھر تو آنا۔“

نوجوان نے پلٹ کر دونوں کی طرف حیرت سے دیکھا، ”جی آپ نے ہمیں پکارا ہے۔؟“

حیدر خان نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا، اور وہ کسی سعادت مند بچے کی طرح اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو۔“

وہ بیٹھ گیا، ”ہم سے کچھ کام ہے۔؟“

”ہاں۔“

”کیا کام ہے۔؟“

”آپ سے باتیں کریں گے۔“

اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، ''ہمیں بھی باتیں کرنے کا بہت شوق ہے لیکن یہاں تو کوئی بات ہی نہیں کرتا۔؟''

حیدر خان نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا، ''آپ ہمیں بہت پیارے لگے ہیں۔ دِلّی کے رہنے والے ہو۔''

''جی ہاں۔۔وہاں چاندنی چوک کے عقب والی بستی میں ہم رہتے ہیں۔''

''اچھا۔۔اپنے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائیں۔''

''ہمارا نام سلیم علی، خاندان فوجی، بابا اصلاح تبلیغ کے سرگرم رُکن تھے۔ امّی جان بتاتی ہیں کہ وہ پنجاب کے ایک معرکے میں شہید ہو گئے تھے۔ میرے چچا جان اختر علی۔۔!''

''اختر علی؟'' حیدر خان ایک دم چونکا، ''وہی نا جن کی پیشانی پر مار کا ایک بڑا سا نشان ہے؟''

''جی ہاں۔۔وہی۔'' سلیم کی چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، ''آپ جانتے ہیں اُنھیں؟ ہم بھی اپنے چچا جان کی طرح نام کمانے نکلے ہیں۔''

''میاں اُن سے تو میرے والد کی دوستی تھی بلکہ جب تک میرے والد جیتے رہے وہ ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔'' حیدر خان کے آنکھوں میں اختر علی کی شبیہ اُبھر آئی۔

''جبھی تو میں کہوں، اس لڑکا نے آپ کو کیوں متوجہ کیا ہے۔'' چنبیلی کی زبان سے نکلا۔

''میاں لڑکے فوجی تربیت کہاں حاصل کی۔؟''

''کچھ دن پہلے ہی تو ہم فوج میں آئے ہیں۔ کمانڈر صاحب ہمیں تلوار چلانا اور بندوق چلانا سکھائے ہیں۔''

''اور گھوڑ سواری۔؟''

''اُس کا تو ہمیں بچپن ہی سے شوق رہا ہے۔ بہت تیز گھوڑا بھگاتے ہیں ہم

جو بھی دیکھتا ہے ششدر رہ جاتا ہے۔''

''وہ تو ہم نے بھی دیکھا ہے۔'' حیدر خان نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''آپ نے کہاں دیکھا ہے۔؟ ہم تو دوڑتے ہوئے گھوڑے پر کرتب بھی کرتے ہیں۔''

''کرتب۔؟'' چنبیلی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں۔۔ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر ہم مزے سے کھڑے ہو جائیں، اُس کی پیٹھ پر سے پانچ چھے فٹ اوپر چھلانگ لگائیں اور پھر ایسے نیچے آئیں کہ گھوڑا ہماری رانوں میں آجائے۔ ہے نا کرتب۔؟''

''واہ۔۔ آپ کا تو جواب نہیں ہے۔'' چنبیلی نے شفقت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''یہی نہیں۔ دوڑتے گھوڑے کی پیٹھ پر ادھر اُدھر لٹکنا بھی ہم جانتے ہیں۔''

''کیا کہنے بہت خوب۔۔ بھئی اب تو تمھیں میٹھا کھلانا ہی پڑے گا۔'' چنبیلی اپنی جگہ سے اُٹھی، '' میٹھا تو کھاتے ہو نا۔؟''

''میٹھا!'' اُس نے خوشی سے کہا، ''ہمیں تو میٹھا بے حد پسند ہے۔''

چنبیلی فوراً اپنے خیمے میں گئی اور ایک طشتری میں میٹھا لے کر آئی۔

اُس نے جیسے ہی میٹھے کا پہلا لقمہ لیا، اُس کے چہرے پر مٹھاس دوڑ گئی اور نیلوفر اُس کے دماغ میں اُتر آئی، ''نیلوفر میٹھا تو امّی جان بھی بناتی ہیں لیکن اُن کے ہاتھوں کبھی اتنا مزےدار میٹھا نہیں بنتا۔''

''سلیم باتیں نہ بنائیں اور چاہیں تو مل جائے گا۔ دل رکھنے کی خاطر جھوٹی تعریفیں تو نہ کریں۔''

''لو ہم سچ کہہ رہے ہیں اور انھیں جھوٹ لگتا ہے۔۔'' اس نے شریر نظروں سے نیلوفر کی جانب دیکھا، ''اچھا ذرا اپنا ہاتھ تو دکھائیں۔''

''کیوں؟''

''ارے دکھائیں نا۔''

''یہ لو۔''

اور اُس نے فوراً اُس کا ہاتھ پکڑ کر چاٹ لیا۔''جس کے ہاتھ ہی اتنے میٹھے ہوں تو۔۔'' وہ ایک دم رُک گیا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''آپ بہت بدتمیز ہو رہے ہیں۔'' وہ جانے کے لیے پلٹی۔

''ارے سُنیں تو۔۔نیلوفر آپ جو سوچ رہی ہیں وہ تو ہم نے کہا ہی نہیں۔''

''ہم خوب سمجھ گئے ہیں۔'' نیلوفر نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

''ہم تو کہہ رہے تھے کہ جس کے ہاتھ اتنے میٹھے ہوں تو اُس کے ہاتھوں کے بنائے پکوان تو لاجواب ہونے ہی والے۔''

نیلوفر مسکرانے لگی۔

''آپ کیا سمجھ رہی تھیں؟''

''وہ۔۔ہم۔۔۔ہم۔'' نیلوفر ہکلا کر رہ گئی۔

''سچ بتائیں۔۔ہم وہی کہہ رہے تھے جو آپ سمجھ رہی تھیں۔''

نیلوفر دانت پیستے ہوئے اُس کی جانب اُچھلی تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

طشتری خالی ہو چکی تھی لیکن وہ اُسی طرح ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

''اور چاہیے۔۔؟'' چنبیلی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میاں فوجی۔۔کہاں چلے گئے۔۔؟''

''جی۔'' وہ چونک اُٹھا۔

''میں نے کہا اور چاہیے۔؟''

''جی نہیں۔'' اُس نے طشتری واپس کی اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

حیدر خان اور چنبیلی اُسے دیکھتے رہ گئے۔

چنہٹ بہت تیزی سے مجاہدین کی فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ فیض آباد سے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ مولانا احمد اللہ شاہ پہنچ چکے تھے، اور مولانا کے اشاروں پر جنگ کے نقشے کا عمل تیار کیا جا رہا تھا۔ خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ گھنی جھاڑیوں میں توپ خانے کو چھپایا جا رہا تھا کہ گولے تو سڑک پر برسیں گے لیکن توپ خانہ نظر نہ آئے۔ دوسری طرف ایک بڑی سی جھیل تھی اور پورا علاقہ گھنے جنگلات سے بھرا پڑا تھا۔

دلّی سے آنے والا گھوڑ سوار دستہ بھی چنہٹ کی طرف روانہ ہوا۔ اُن کے پیچھے گرد و دھول کا ایک غبار تھا۔ حیدر خان اور چنبیلی کے گھوڑے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ حیدر خان نے چنبیلی کی طرف دیکھا، ''چنہٹ کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

اُس نے انکار میں گردن ہلائی اور حیدر خان اُسے بتانے لگا، ''چنہٹ یہ ایک قدیم قصبہ ہے۔ والیانِ اودھ کی شکارگاہ۔ جن دنوں میں لکھنؤ میں تھا تو اکثر انگریزوں کے ساتھ شکار کے لیے چنہٹ آیا کرتا تھا۔ یہ علاقہ چھاپہ مار جنگ میں بہت لاجواب ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر مجاہدین فرنگیوں کو یہاں شکست دے دیں تو اودھ فرنگیوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے گا، لیکن خدانخواستہ مجاہدین یہ جنگ ہار جائیں تو پھر اودھ کی حکومت ایک خواب بن کر رہ جائے گی۔''

''مطلب یہاں ایک ایک انچ کے لیے جان کی بازی لگے گی۔''

''ہاں۔'' حیدر خان نے آسمان کی طرف دیکھا، ''دعا کریں کہ ہم یہ جنگ جیت جائیں۔''

چنبیلی نے بھی آسمان کی طرف دیکھا۔

دونوں بظاہر خاموش ہو گئے لیکن اُن کے دل اللہ کے حضور گڑگڑا رہے تھے اور آنکھوں میں فتح نظر آ رہی تھی۔

گھوڑے برق رفتار منزل کی طرف دوڑ رہے تھے۔

اطراف میں گھنی جھاڑیاں شروع ہو گئی تھیں، اور آسمان میں سورج دہک رہا

تھا۔

''وہ۔۔وہ دیکھو۔۔۔چنہٹ کی فوجی چھاؤنی نظر آرہی ہے۔''

چنبیلی نے اُس طرف دیکھا، دور فوجی پریڈ کررہے تھے۔کچھ گھوڑ سوار گھوڑوں کو دوڑا رہے تھے اور کچھ سوار اُن کی لگامیں تھامے پیدل چل رہے تھے۔کچھ افراد ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

گھوڑ سوار دستہ نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے چھاؤنی میں داخل ہوا۔ایک بڑے سے سرخ خیمے کے باہر ایک چھریرے بدن کا شخص زرہ بکتر پہنے کھڑا تھا۔اُس کا ایک ہاتھ بلند تھا۔گویا وہ مجاہدین کا استقبال کررہا تھا۔

''مولانا احمد اللہ شاہ۔'' چنبیلی نے آہستہ سے کہا اور حیدر خان اُن کی طرف متوجہ ہوا۔دیکھتے ہی دیکھتے سارے مجاہد اُن کے اطراف جمع ہو گئے، اور مولانا نے کہنا شروع کیا،'' مجاہدو! یہ جنگ اودھ کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لیے وقار کی جنگ ہے اور اس جنگ کو ہمیں ہر صورت میں فتح کرنا ہے۔فرنگی یہ ایک شاطر قوم ہے اور آج ہمیں بھی اُن کی شاطرانہ چالوں ہی سے شکست دینا ہے۔آپ دیکھ رہے ہیں یہ علاقہ گھنے درختوں سے بھرا پڑا ہے اور سڑک اُس کے درمیان سے گزر رہی ہے۔تمام مجاہدین مخصوص فاصلے کے ساتھ ان درختوں کے پیچھے چھپ جائیں۔اس طرح کے انگریز ہمیں نہ دیکھ پائیں۔وہ جیسے ہی اس سڑک پر پہنچیں ہم دونوں طرف سے اُنھیں گھیر کر حملہ کردیں گے، لیکن کوئی عجلت نہ کرے۔بس میری بندوق کے فائر کا انتظار کریں اور اُس کے بعد پوری شدت سے اُن پر ٹوٹ پڑیں۔سڑک کے دونوں جانب ایک کے پیچھے ایک پیادوں کی دو صفیں ہونگی اور اُن کے پیچھے گھوڑ سوار ہونگے ۔پہلی صف کی فائرنگ ختم ہوتے ہی دوسری صف بنا وقت ضائع کیے فائرنگ کرے گی۔اُن کے پیچھے گھوڑ سوار اپنی بندوقوں کے ساتھ تیار رہیں گے اور دوسری صف کی فائرنگ ختم ہوتے ہی بنا توقف کے وہ فائرنگ کریں گے۔اس طرح یہ چکر چلتا رہے گا۔اُس طرف توپ خانہ لگا دیا گیا ہے۔میرے فائر کے ساتھ ہی توپیں بھی اپنا

کام شروع کر دیں گی۔ یاد رہے حملہ اس قدر زبردست ہو کہ فرنگیوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملے۔

اب میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب اپنی اپنی صفیں بنا لیں۔

مجاہدین تیزی سے اپنی اپنی ٹکڑیوں کے ساتھ جنگل میں پھیلتے چلے گئے اور مولانا ایک اونچے سے درخت پر چڑھنے لگے تاکہ وہ آنے والی فرنگی فوج کا جائزہ لے سکیں۔

کچھ مجاہدین جنگ کے اس طریقے سے پریشان بھی تھے گو وہ اپنے سالار کے حکم پر جنگل میں چھپ رہے تھے لیکن ایک وسوسہ اُنھیں پریشان بھی کر رہا تھا کہ کیا اس چھپا چھپی سے جنگ جیتی جا سکتی ہے۔؟ ہم لاکھ چھپ جائیں لیکن فرنگیوں کے مخبروں نے اُنھیں ہماری موجودگی کی اطلاع تو دے ہی دی ہوگی۔

مولانا نے آنکھوں پر دوربین لگائی اور دور تک دیکھنے لگے۔ چونٹیوں کی قطار کے مانند انگریزی لشکر تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ آگے آگے بندوقیں اُٹھائے پیادہ سپاہی تھے۔ اُن کے پیچھے توپوں کو کھینچنے والے ہاتھی تھے۔ اُن کے پیچھے بیل بنڈیاں تھیں۔ جن میں اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ اونٹ اور بیل چھوٹی توپوں کو کھینچ رہے تھے، اور آخر میں بہت بڑا گھوڑ سوار دستہ تھا۔ ایک ہاتھی کے ہودے میں ہینری لارنس بیٹھا ہوا تھا۔

فوج جھٹ میں داخل ہوگئی اور تیزی سے مجاہدین کی طرف بڑھنے لگی۔

مولانا نے ہاتھ کے اشارے سے مجاہدین کو آگاہ کیا کہ فوج قریب آ گئی ہے، اور بندوقیں سامنے کر لیں۔ مجاہدین نے فوراً پوزیشن لے لی۔ چنبیلی نے حیدر خان کی طرف دیکھا۔ اُس کی اُنگلی ٹریگر پر جم چکی تھی اور اُس سے کچھ فاصلے پر سلیم بھی گھوڑے کی پشت پر بندوق تانے کھڑا تھا۔

دور سے فرنگی فوج آتی ہوئی دکھائی دی۔ گرد و غبار چاروں طرف پھیل رہا تھا، اور قیامت خیز آوازیں جنگل کے سناٹے کو چیر رہی تھیں۔ ماحول وحشت ناک ہو رہا

تھا۔

بریگیڈیر انگلس نے ہینری لارنس کو مخاطب کیا، ''سر ادھر مقابلے کے لیے کوئی نہیں ہے۔ آپ کے انفارمر کا رپورٹ غلط بھی ہوسکتا ہے۔''

''اوہ نو۔۔نو نو۔ انفارمیشن بالکل درست تھا۔ ہوسکتا ہے وہ جنگل کے اُس پار ہمارا انتظار کر رہا ہو۔'' پھر اُس نے زور سے چیخا، ''آگے بڑھو۔۔!''

اور فوجیں تیزی سے آگے بڑھنے لگیں۔

مولانا احمد اللہ شاہ نے توپچیوں کو اشارہ کیا کے وہ تیار رہیں۔

انگریز فوجیوں کو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے خوف تیزی سے آگے قدم بڑھا رہی تھیں، اور جنگل میں داخل ہو رہی تھیں۔

مولانا نے اپنی بندوق کی نال کا رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔

انگریز افواج پوری طرح زد میں آ گئی۔

بس ایک فائر کی آواز گونجی تھی کہ انگریز لشکر پر گولیوں کی برسات شروع ہوگئی۔ توپوں کے دہانے کھل گئے، اور لاشیں زمین پر گرنے لگیں۔ حملہ اس قدر اچانک اور زبردست تھا کہ انگریزوں کے ہوش اُڑ گئے۔ چیخ و پکار سے آسمان لرز اُٹھا۔ ہاتھی جو توپیں کھینچ رہے تھے گھبرا کر پیچھے پلٹ گئے اور اپنی ہی فوج کو روندنے لگے۔ انگریزوں کی حمایت میں سکھ رجمنٹ آئی تھی۔ وہ اپنی بندوقیں بھی بغل سے اُتار نہ سکی اور موت کے منہ میں پہنچ گئیں۔ انگریز افواج دونوں طرف سے گھری ہوئی تھیں، اور دونوں طرف سے سخت فائرنگ ہو رہی تھی۔ آخر اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور ہینری لارنس نے میدان چھوڑنے کا حکم دیا، انگریز افواج اور اُن کے طرف دار اپنی جان بچا کر ایسے بھاگے کہ اپنا اسلحہ، توپیں، گولہ بارود، گھوڑے، بیل بنڈیاں، ہاتھی سب کچھ چھوڑ دیا۔ ان بھگوڑوں میں چنبیلی کو وہ دو فوجی بھی نظر آ گئے جنھوں نے کبھی اُسے عزیزن بائی کے کوٹھے سے پستول کی نوک پر زبردستی اغوا کیا تھا۔ چنبیلی غصّے سے بے قابو ہوگئی اور اُس کا گھوڑا جنگل سے باہر نکل آیا اور وہ اُن پر فائر کرتی ہوئی اُن کے

بالکل قریب پہنچ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے اُن دونوں کو مار گرایا۔ جوش میں وہ گھوڑے سے نیچے اُتر گئی اور ایک کے پیٹ میں سنگین گھونپ دی لیکن دوسرے زخمی فوجی نے زمین پر لیٹے لیٹے ہی اُس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی اور وہ بھی گر گئی اور وہ فوجی اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

حیدر خان کی چیخ آسمان میں گونج اُٹھی اور وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا، لیکن اتنی دیر میں سلیم علی نے چھلانگ لگائی اور چنبیلی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور حیدر خان کی سنگین اُس فوجی کے سینے کے آر پار ہو گئی۔

انگریز بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ اُن کا سارا اسباب سڑک پر پڑا تھا، اور جدھر بھی نظریں اُٹھتیں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ دھواں تھا، بارود کی بو تھی، بیل گاڑیاں اُسی طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئیں تھیں اور گاڑی بانوں کی لاشیں جھول رہی تھیں۔

مولانا احمد اللہ شاہ نے فتح کا نعرہ لگایا۔

اور چاروں طرف سے نعرۂ تکبیر گونج اُٹھا۔

مالِ غنیمت سمیٹا جا رہا تھا۔

اور کئی سوالات مجاہدین کے ذہنوں میں کلبلا رہے تھے۔

اس جنگ نے اودھ کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد تو کر دیا تھا لیکن تخت کا وارث کون ہو گا۔؟

کیا واجد علی شاہ کو دوبارہ بلایا جائے گا۔؟

اگر ایسا نہ ہوا تو پھر کون بادشاہ ہو گا۔؟

واجد علی شاہ کے خاندان سے ہو گا یا پھر۔۔؟

اُن کے ذہن اُلجھتے جا رہے تھے۔

دوسری طرف مولانا احمد اللہ شاہ مجاہدین کو تلقین کر رہے تھے کہ اس سے پہلے کہ شکست خوردہ انگریز ریذیڈنسی میں پہنچ کر قلعہ بند ہو جائیں ہمیں آگے بڑھ کر

ریسیڈنسی پر قبضہ کر لینا چاہیے۔

لیکن مال واسباب اتنی بڑی تعداد میں تھا کے اُسے چھوڑ کر اُن کا تعاقب نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''خدا جانے اودھ کی اگلی صبح کیا پیغام لے کر آئے گی۔''

مجاہدین سامان بھی سمیٹ رہے تھے اور اپنے آپ سے سوال بھی کر رہے تھے۔

☆☆☆

(۱۴)

عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ قلعہ معلیٰ میں حسب معمول چہل پہل تھی۔ کہار سرخ بانات کی وردیاں اور سرخ پگڑھیاں باندھے کھڑے تھے۔ پہرے دار نیزے سنبھالے ٹہل رہے تھے۔ اردابیگنیاں سرخ و سبز لباس پہنے مستعد کھڑی تھیں۔ کنیزیں ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ ہر موڑ پر معلن باادب کھڑے تھے کہ دور سے سپہ سالار اعظم مرزا مغل کی سواری آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُن کے پیچھے سرداروں کا ایک طائفہ چلا آرہا تھا۔ اُنھیں دیکھتے ہی سب چوکنا ہو گئے۔ اُن کے گھوڑے دھیمے دھیمے قدم اُٹھا رہے تھے اور معلن اعلان کر رہا تھا، ''ہوشیار۔۔ روبرو نگاہ رہے۔۔ سپہ سالار اعظم شہزادہ عالی وقار محمد ظہیر الدین مرزا مغل دودمانِ تیموری و چنگیزی تشریف لا رہے ہیں۔''

تو دوسری طرف سے آوازیں بلند ہوئیں، '' اقبال۔۔ مزید اقبال۔۔''

سنگِ سرخ کی عمارتیں جلال شہزادگی سے لرز رہی تھیں۔

شہزادے نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور گھوڑا اپنے دو قدموں پر اُچھلا اور زور سے ہنہنایا۔

اُن کے چہرے پر شدید تھکاوٹ کے آثار تھے۔ ایک لمحے کے بعد اُنھوں نے پلٹ کر دیکھا سرداران باوفا نے سلامی دی اور شہزادے کا گھوڑا آگے بڑھا اور وہ تمام، اقبال۔۔ مزید اقبال کہتے ہوئے لوٹ گئے۔

اور معلن کی آوازیں وقفے وقفے سے گونج رہی تھیں، ''ہوشیار ۔۔ ہوشیار ۔۔ نگاہ روبرو رہے شہزادۂ عالم تشریف لا رہے ہیں ۔۔!''

اور جیسے ہی گھوڑا شہزادے کے محل کے قریب پہنچا، ایک پہریدار دوڑتا ہوا حاضر ہوا، سلامی دی اور جھک گیا۔ شہزادہ گھوڑے سے نیچے اُترا، فوراً کنیز دوڑتی ہوئی محل کے حجرۂ خاص میں پہنچی۔ مسہری پر بیگم مرزا مغل دوزانوں بیٹھی ہوئی تھیں، اور کنیزیں پنکھا جھل رہی تھیں۔ کنیز نے مجرا کیا، ''اقبال ۔۔ مزید اقبال ۔ سالارِ فوج شہزادہ عالی وقار تشریف لاتے ہیں ۔۔''

بانو، مرزا مغل کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔ اُنھوں نے ہاتھوں سے اشارہ کیا اور کنیزیں دیکھتے ہی دیکھتے حجرۂ خاص سے رخصت ہوگئیں۔

وہ مسہری سے نیچے اُتریں اور کمان در کمان قدم اُٹھاتی ہوئیں زرین کمان میں ٹھہر گئیں۔ مرزا مغل داخل ہوے۔ نواب بانو نے اپنی دلفریب مسکراہٹ سے اُن کا استقبال کیا۔ شہزادے نے ایک نگاہ حورِ بے مثال پر ڈالیں اور تھکاوٹ نے انگڑائی لے کر الوداع کہا۔ شہزادے نے قدم آگے بڑھائے اور اُن کے پیچھے پیچھے وہ بھی قدم اُٹھانے لگیں۔ پورا محل خس اور ٹھنڈی خوشبودار جڑی بوٹیوں سے مہک رہا تھا۔ وہ حجرۂ خاص میں پہنچے اور شہزادہ ایک مرصّع کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیگم مرزا مغل نے نگاہ بھر کر شوہر کی طرف دیکھا اور پھر وہ پلٹی اور 'ٹھن' کی گونج دار آواز اُبھری، اور ایک جسولنی جو پہرے پر معمور تھی۔ دوڑی دوڑی حاضر ہوئی۔ مجرا کیا، ''بعد سلامتی و اقبال مندی ۔۔۔ حکم۔''

بیگم نے بنا اُس کی طرف دیکھے آہستہ سے کہا، ''آبِ حیات پیش کیا جائے ۔!''

جسولنی شاہی آداب ادا کرتے ہوئے سیدھا آب دار خانہ پہنچی اور داروغہ آب دار سے عرض کیا، ''آبِ حیات۔''

داروغہ نے ایک صراحی جو جمنا کے پانی سے بھری تھی اور جسے چار پہر سے نتھار کر سربہ مُہر برف میں دبا کر رکھا گیا تھا۔ جسولنی کے آگے کر دیا اور اُس نے اُسے

خواص خاص کے حوالے کیا اور وہ اُسے لے کر دوڑی اور بانو کے حضور پہنچی۔ اُنھوں نے صراحی کی مُہر توڑی اور ایک طلائی کٹورے کو لبالب بھرا اور اُسے شہزادے عالی وقار کے لب مبارک تک پہنچا دیا۔ ٹھنڈا خوشبودار پانی حلق سے نیچے اُترا تو اُن کی زبان سے نکلا، ''الحمد اللہ۔''

حضور بانو نے پیالہ چوکی پر رکھا اور اُن کے برابر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئیں،'' بارگاہِ خداوندی میں عرض ہے کہ یہ گمان حرفِ غلط ثابت ہو کہ صاحبِ عالم کا چہرۂ مبارک فکر وتردد میں ڈوبا ہوا ہے۔۔؟ حالات تو قابو میں ہیں؟''

شہزادے نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر کرسی سے اُٹھ گیا اور ٹہلنے لگا،'' جان مغل! ہم عجب سے وسوسوں کا شکار ہو رہے ہیں اور ہماری عقل، دانش کی حدیں چھوڑ رہی ہیں۔''

بیگم مرزا مغل بھی اپنی جگہ سے اُٹھیں اور شہزادے کے قریب پہنچ گئیں اور استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ شہزادے نے بھی ایک بار اُن کی طرف دیکھا اور پھر ٹہلتے ہوئے کہنے لگا،''عقل دنگ ہے کہ کس پر اعتماد کیا جائے۔ چوڑی والان کے محلے ثمرو بیگم کی حویلی میں میگزین تھا۔ وہاں ہر روز سات من بارود تیار ہوتی تھی اور جنگی محاذوں پر استعمال ہوتی تھی۔ وہ کارخانہ اُڑ گیا۔ سات سَو افراد وہاں کام کرتے تھے۔ وہ سب ختم ہو گئے۔ اطراف واکناف بھی کافی نقصان ہوا۔ بخت خان کے جاسوسوں کا کہنا ہے کہ یہ کام حکیم احسن اللہ خان کا ہے اور حضور اسے ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف حضور نے بخت خان کو بھی سپہ سالارِ آعظم کا عہدہ بخش دیا ہے۔ گورنر بہادر کا خطاب بھی عطا کر دیا ہے۔ مغل خاندان کے دیگر شہزادے اور بزرگ اس بات سے خوش نہیں ہیں اور خود ہم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہماری ساری صلاحیتیں، سارے ہی کارنامے بخت خان کے نام جمع ہو رہے ہیں اور ہم برائے نام سپہ سالارِ آعظم بن کر رہ گئے ہیں۔'' وہ پلٹا اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھنے لگا،''اب آپ ہی فرمائیں، ایسے حالات میں ہم فکر وتردد میں مبتلا نہ

ہو نگے تو کیا کریں گے۔''

''حضور شہزادے بس اتنی سی بات نے آپ کو پریشان کر دیا؟'' وہ اُن کے پاس چلی آئی اور کہنے لگی، ''ہماری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کے قلعہ معلیٰ میں سازشی ذہن ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد کی خاطر پھوٹ بھی ڈلوا سکتے ہیں، اور کچھ عجب بھی نہیں کہ فرنگیوں نے اُنھیں نہ خریدا ہو۔؟ ان مکار، دغاباز، بکے ہوئے گھر کے بھیدیوں سے آپ کو چوکنا رہنا چاہیے، لیکن یہ بتایئے بخت خان نے کبھی آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی؟ کیا وہ غداری کر سکتے ہیں؟''

''نہیں نہیں۔۔ ہم بخت خان کی وفاداری پر کبھی شک نہیں کر سکتے وہ پوری فراست کے ساتھ میدانِ جنگ میں اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ اب پچھلی رات ہی کا واقعہ لے لو، اگر وہ وقت پر نہ پہنچتے اور پوری جرأت کے ساتھ نہ ڈٹ جاتے تو انگریز دوبارہ دلّی میں داخل ہو ہی گئے تھے۔''

''کیا۔'' بانو نے حیرت سے مرزا مغل کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' مرزا مغل نے کہنا شروع کیا، ''کشمیری دروازے کے باہر نصف میل کے فاصلے پر ایک قدیم پہاڑی کوٹھی ہے۔ وہاں ہم نے مورچہ قائم کیا تھا۔ بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں اور یہ توپیں مسلسل انگریزوں کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ اُن توپوں کی حفاظت کے لیے ہمیشہ دو بٹالین متعین رہتیں۔ یہ اتفاق تھا کہ بخت خان وہاں پر موجود نہیں تھے۔!''

شہزادہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور مزیّن چھت پر آویزاں جھومروں کو غور سے دیکھنے لگا اور واقعات کی ایک ایک کڑی اُس کی آنکھوں میں اُبھرنے لگی، رات کا وقت تھا۔ ہماری افواج دن تمام انگریزوں پر آگ برساتے برساتے تھک گئی اور تھکاوٹ اُنھیں لوریاں دینے لگیں اور وہ سب گہری نیند سو گئے۔ خدا جانے یہ خبر انگریزوں تک کیسے پہنچ گئی کہ یہی وقت ہے ایک کامیاب شب خون کا۔ اگر کشمیری دروازہ کھل گیا تو دلی کی فتح ممکن ہوسکتی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اُن کی افواج

دبے پاؤں پہاڑی سے نیچے اُترنے لگی اور وہ نہایت آسانی سے ہمارے مورچے میں داخل ہو گئے اور ایک دم حملہ کر دیا اور اس سے پہلے کہ ہماری فوج بیدار ہوتی اُن کی تلواریں اور بندوقیں چل نکلیں۔ مقابلہ تو دور رہا جان کے لالے پڑ گئے اور ہماری افواج کسی طرح جان بچا کر کشمیری دروازے کی طرف بھاگی اور نصیر آباد سے آنے والی فوج کو جگایا اور تمام احوال بیان کیا کہ اُٹھو وہ تعاقب میں ادھر آتے ہی ہوں گے۔ اُنھوں نے جواب دیا تم سب ہماری پیٹھ کے پیچھے چھپ جاؤ اور اپنی بندوقوں پر گرفت مضبوط کر لو۔ جیسے ہی انگریز اُن کے تعاقب میں کشمیری دروازے پر پہنچے مجاہدین نے گولیوں کی برسات کر دی اور انگریزوں کی لاشیں زمین پر گرنے لگیں لیکن اُسی وقت کسی غدار نے کشمیری دروازہ کھول دیا، اور کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور اُنھوں نے جوابی حملہ کر دیا۔ ایک ایک انچ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کیسے بخت خان کو خبر ہوئی اور وہ اچانک اُن کے پیچھے پہنچ گیا اور اُس نے اُن پر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ انگریزوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ پورا میدان اُن کی لاشوں سے پٹ گیا۔ اُن کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ آگے بڑھتے تو موت پیچھے ہٹتے تو موت۔ وہ دونوں طرف سے گھر گئے تھے، اور اُنھیں بہت بڑا جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اُن کے کئی اہم فوجی افسران اس معرکہ میں جہنم رسید ہو گئے اور فتح نے لشکرِ شاہی کے قدم چوم لیے۔''

شہزادہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر اب بھی ایک اُلجھن تھی، ''جانِ بہار! سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ فرنگیوں کو رات گئے یہ اطلاع پہنچانے والا کون تھا کہ شاہی لشکر بے خبر سو رہا ہے۔؟ اور پھر جب وہ کشمیری دروازے تک پہنچ گئے تھے تو آخر دروازہ کس نے کھول دیا تھا؟''

''شہزادۂ عالم ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کو بخت خان کی طرف سے اپنا دل صاف رکھنا چاہیے۔''

''ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔''

''اور پھر کارگزاری آپ کی ہو یا بخت خان کی فائدہ تو ہر صورت میں خاندانِ مغلیہ ہی کو ہوگا۔''

''بے شک۔''

''البتہ شہزادے حضور! گھر کے بھیدیوں پر کڑی نظریں رکھیں اور جو بھی خاطی پکڑا جائے تو اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔''

''جانِ مغل! مسئلہ تو یہی ہے، کیونکہ ان غداروں میں کوئی حضور کا منہ چڑھا ہے اور کسی کا تعلق خاندانِ مغلیہ سے ہے۔''

''تو میرے سرتاج اس صادق مشورے کے لیے اس بندی کو معاف فرمائیں۔ مغل تاجداروں کی تاریخ ملاحظہ فرمائیں، آپ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی راہ اختیار کریں نا کہ حضرت نصیرالدین ہمایوں کی تقلید کریں۔''

''مرحبا! جانِ عزیز مغل خاندان کی ایک اور بھی تاریخ ہے۔'' شہزادے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

بیگم مرزا مغل نے پھر ایک بار استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''اُن کی بیگمات نے کبھی اپنے شہنشاہ کو اپنی حکمت عملی سے دشمنوں کے نرغے سے بچایا اور اُن کے پشت پر دستِ حنا رکھ کر اُنھیں عادل کا لقب دلوایا اور کبھی کسی شہزادے خرم کو شاہ جہاں بنا دیا۔ ہم بھی آپ سے یہی توقعات رکھتے ہیں۔''

وہ شہزادے کے سینے سے لگ گئیں، ''ہمارے لب تو ہمیشہ ہی بارگاہ یزدی میں آپ کی اقبال مندی کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ آپ کی سلامتی کی منتیں مانگتے ہیں اور آپ کے قدموں ہی میں اپنی جانِ عزیز کی رخصتی کی دعائیں کرتے ہیں۔''

شہزادے نے پہلے اُن کے لبوں پر اُنگلی رکھی اور پھر اُن کے لبوں کو چوم لیا۔

چنبیلی اور حیدر خان گھوڑوں پر سوار مختلف کشادہ و تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک خوبصورت سی ڈیوڑھی کے سامنے رُک گئے اور گھوڑوں سے نیچے اُترے

۔چنبیلی نے بتایا یہی عزیزن آپا کا کوٹھا ہے۔لیکن دونوں کو سخت حیرت ہو رہی تھی کیونکہ اس کوٹھے سے نہ تو پائلوں کی چھنا چھن کی آوازیں آ رہی تھیں نا طبلہ کھڑک رہا تھا نا کوئی غزل کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ پوری گلی میں ایک سناٹا تھا۔

حیدر خان نے چنبیلی کی طرف دیکھا،''کہیں تم پتہ تو نہیں بھول رہیں۔؟''

''اے ہے کیا کہتے ہو۔؟جن گلیوں میں بچپن بیتا ہو بھلا وہ بھی کوئی بھول سکے ہے؟ وہ دیکھو۔۔وہی تو نیم کا درخت ہے،جس کی ڈالیوں پر ہم جھولے ہیں،اور وہ رہا حیدر بائی کا کوٹھا جن کی سوز خوانی کا چرچا پورے لکھنؤ میں ہے۔اُس کے نیچے وہ حلوائی کی دکان جس کی جلیبیاں سارے شہر کو پسند ہیں۔البتہ مجرے والے خدا جانے کہاں چلے گئے۔ لے دے کے بس ایک ہی دکان رہ گئی۔۔''چنبیلی کہتی جا رہی تھی اور حیدر خان ادھر اُدھر اور کبھی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔آتے جاتے لوگ اُنھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔آخر ایک بانکا اُن کے قریب آیا اور حیدر خان کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے چہکا:''اخاہ! ہماری سرزمین پر نئے نئے معلوم ہوتے ہیں۔؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں حضور۔؟ کس کا شرفِ نیاز چاہتے ہیں۔؟ کچھ تو بتایئے جنابِ عالی۔''

حیدر خان نے اُس کی طرف دیکھا،سر پر چوگوشیہ ٹوپی،اُجلا صاف اور براق انگرکھا مین سکھ کا پاجامہ،کاندھے پر مثلث رومال،ہاتھ میں دستی،پاؤں میں مُرنو کا جوتا ،آنکھوں میں سرما،چہرے پر تلواری مونچھیں اور منہ میں دبا ہوا پان کا بیڑہ۔

''اماں یونہی ٹک ٹک دیدے پھوڑو گے یا کچھ منہ سے بھی پھوٹو گے؟''

''یہاں عزیزن صاحبہ رہتی۔۔!''

''اخاہ! تو آپ بھی پہلو میں حور رکھنے کے باوجود عزیزن کے زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔''

حیدر خان کو عجیب سی اُلجھن ہو رہی تھی۔

''تو حضور سنیے گا،وہ جو بیچتے تھے دردِ دل کی دوا،وہ تلوار اُٹھا کر میدان جنگ میں چل دیئے۔''

''تو کیا وہ اب یہاں پر نہیں رہتیں۔''

''اماں یہ تو بندے نے عرض کیا ہی نہیں، جو ہے، وہ تھی، اور اب نہیں ہو سکتی، البتہ جو تھا وہ ماحول اب نہ رہا۔ وہ زبان جس سے کبھی پھول جھڑتے تھے، وہ نین جن کی کٹاری سے کبھی دل عاشق بسمل ہوتا تھا، وہی لب اب، شمشیری کشیدن فرماتے ہیں، رقیبِ روسیا کا سر کاٹتے ہیں، جی۔''

''جی شکریہ۔'' حیدر خان نے آہستہ سے کہا۔

بانکے نے حیرت سے حیدر خان کی طرف دیکھا، دیدے مٹکائے اور بڑبڑانے لگا، ''کمال ہے۔ نہ ذوق زبان، نہ شوق فصاحت، تنگئی داماں تو دیکھیے، صبر کا یارا تک نہیں۔ وصل کی تڑپ میں جو لذتِ ہجر نہ جانے، وہ درِ عزیزاں پر کیا دم مارے۔''

اتنی دیر میں چنبیلی نے دروازے پر دستک دے ہی دی، اور اندر سے آواز آنے لگی، ''ہم لاکھ سب کچھ چھوڑ دیں پر لوگ مانیں تب نا، بس دستکیں دیے جاتے ہیں۔۔کون ہے۔؟'' کہتے کہتے دروازہ کھل گیا۔ بوا فیضی سفید بالوں پر کالی اوڑھنی ڈالے کھڑی تھیں۔

چنبیلی اُن سے ایک دم لپٹ گئی، ''بوا کیسی ہیں آپ۔''

''اے ہے کون ہے۔''

''بوا۔''

''اے نوج کہیں موی چنبیلی تو نہیں؟''

''بوا۔'' چنبیلی کی زبان سے پھر نکلا۔

بوا نے اُسے زور سے لپٹا لیا، ''اللہ تیری حمد و ثنا۔۔موی تو زندہ ہے؟ ہم تو رو پیٹ کے کب کے فاتحہ پڑھ چکے تھے۔''

چنبیلی نے اپنے آنسوں پوچھے اور پھر حیدر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی، ''بوا ان سے ملیں یہ میرے محسن ہیں۔''

''اے خصم بھی کر لی، کیا یہ وہی ہیں جو تجھے بندوق کی نال پر لے گئے تھے؟

''بوا کی حیرت سے آنکھیں اُبلنے لگیں۔

''بوا۔'' چنبیلی نے پھر ایک بار حیدر خان کی طرف دیکھا، ''سب کچھ کیا دروازے ہی پر پوچھ لیں گی؟ اندر تو چلیے۔''

''اے ہے میں کون ہوتی دروازے پر روکنے والی اور پوچھنے والی۔'' وہ واپسی کے لیے پلٹی اور تینوں بھی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

''بوا یہ وہ محسن ہیں جنھوں نے اپنی جان پر کھیل مجھے اُن فرنگیوں سے بچایا تھا اور پھر مجھ سے بیاہ کرلیا۔ میرا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔''

بوا نے پلٹ کر حیدر خان کی بلائیں لیں۔

وہ ہال میں پہنچے۔ ہال کا پورا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ نہ کہیں ساز رکھے ہوئے تھے نا نگھار میز، بس ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دیواروں سے سجاوٹ کی ساری چیزیں غائب تھیں۔ چنبیلی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''بوا آپا کہاں ہیں؟''

''اُن ہی کے کمرے میں تو لیے جا رہی ہوں۔''

حیدر خان ہال ہی میں ٹھہر گیا۔

وہ دونوں آگے بڑھیں۔ کمرے پر پردہ پڑا ہوا تھا اور کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ چنبیلی نے بوا کی طرف دیکھا، ''زخمی ہو کر آئیں ہیں۔ نسترن دوائی لگا رہی ہے۔''

لیکن تب تک چنبیلی نے دروازے کا پردہ سرکا دیا تھا۔ اُس کے سامنے عزیزن کرسی پر بیٹھی تھی اور نسترن زخموں پر پٹیاں باندھ رہی تھی۔ چنبیلی کو دیکھتے ہی عزیزن نے پہچان لیا، ''میری جان! چنبیلی تم زندہ ہو۔'' وہ اُٹھنے لگی لیکن تب تک چنبیلی اُن کے سینے سے لگ چکی تھی، ''ہاں آپا آپ کی دعا سے میں اچھی ہوں۔ آپ کیسے زخمی ہو گئیں۔'' وہ رونے لگیں تو نسترن نے کہنا شروع کیا، ''آپا تو فوجی ہو گئیں ہیں۔ بے خوف لڑتی ہوئی فرنگیوں کی صف میں گھس جاتی ہیں۔ چنہٹ کی جنگ میں ہی یہ زخم

آ ئے ہیں۔''

''چھبٹ کی جنگ میں تو آپا ہم بھی شریک تھے اور آپ کو پتہ نہیں ہوگا اُس جنگ میں فرنگیوں کے لشکر میں وہ دو فرنگی افسر بھی شامل تھے جنھوں نے کبھی میرا اغوا کیا تھا۔ آپا۔۔۔ اُنھیں دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ دہکنے لگی اور میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اُن کے مقابل پہنچ گئی اور آپا میرے ہی ہاتھوں وہ دونوں جہنم رسید ہوئے ہیں۔''

عزیزن خوشی سے اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگی تو اُسے بوا نے بتایا،''بی بی اس نے خصم کرلیا ہے اور اُسے ساتھ بھی لائی ہے۔''

عزیزن نے محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ان کے خصم ہال میں بیٹھے ہیں۔ میں اُن کی خیریت پوچھتی ہوں اور آپ چنبیلی کی کہانی سنیئے۔'' بوا وہاں سے باہر آ گئی۔

حیدر خان ہال میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ بوا اُس کے قریب پہنچی،''ہاں تو میاں کونسا شربت پیو گے؟ انناس، انار یا سبزے کا۔''

''جی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' حیدر خان نے جواب دیا

''ہیں۔۔تم ہمارے اکلوتے داماد ہو۔۔ بلکہ ہماری نگری کے پہلے داماد۔ ہمارا دل تو نہ توڑو۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ مجھے شربت انار پسند ہے۔''

''شربت تو ہم تم کو تمہاری مرضی کا پلا دیں گے لیکن کھانا تو تمھیں ہماری مرضی ہی کا کھانا پڑے گا۔''

حیدر خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

دور سے چنبیلی کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اور بوا شربت بنا رہی تھیں۔

اودھ پر مجاہدین کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ شاہی خاندان اور عمائدین شہر اودھ کے نئے نواب کے مسلہ کو سلجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ شہزادہ سلیمان قدر کے حق میں تھے، تو کچھ شہزادہ برجس قدر کے، ممو خان اور جے لال سنگھ شاہی خاندان میں اتفاق و اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے اگلے نواب کے انتخاب میں کوشاں تھے۔ تو دوسری طرف مجاہدین کا لشکر اپنی فتح کی خوشی میں شہر میں گشت کر رہا تھا۔ ہوائی فائر کیے جا رہے تھے۔ نوبت، نقاروں، ڈھول تاشوں کا شور تھا۔ سارا لکھنؤ شہر سڑکوں پر اُمڈ آیا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت آسمان میں بادلوں نے بھی مبارک بادی کے شادیانے بجانا شروع کر دیئے، اور گھن گھرج کی آوازوں کے ساتھ رحمتِ باراں لٹانا شروع کر دیا۔ لوگ بھیگ رہے تھے۔ خواتین کھڑکیوں، دروازوں کے پردوں کے پیچھے سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف عوام کا اژدھام تھا اور مجاہدین جوش و خروش میں ناچ رہے تھے گا رہے تھے۔

دشمن بھاگا رے\
نیا سویرا آیا رے\
تیغ اُٹھی\
بندوق چلی\
دشمن بھاگا رے\
نیا سویرا آیا رے\
تلوار اُٹھی\
توپ چلی\
دشمن بھاگا رے\
نیا سویرا آیا رے\
آنکھ اُٹھی\
بجلی گری

دشمن بھاگا رے

نیا سویرا آیا رے

اوپر بادل گرج رہے تھے اور نیچے ڈھول تاشے اور شہنائیاں گونج رہی تھیں ۔ ہوائیں چل رہی تھیں ۔ برسات کی پھواریں برس رہی تھیں ۔ قدموں کی دھمک ، گیت کے بول اور بندوقوں سے نکلنے والی گولیاں ایک عجب منظر بنا رہی تھیں ۔ لوگ مٹھائیاں تقسیم کر رہے تھے ۔ مجاہدین پر پھولوں کی برسات کر رہے تھے ، اور اسی دوران تخت کے وارث کا انتخاب ہوگیا اور نقاروں کی گونج میں منادی کر رہے تھے کہ آج بعد نماز عصر لال بارہ دری میں شہزادہ مرزا رمضان علی خان برجیس قدر کی رسم تاج پوشی کا جشن مبارک مقرر ہے ۔ تمام شہریان لکھنؤ کو اس جشن میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے ۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ کے تمام راستے لال بارہ دری پر ختم ہونے لگے ۔ عوام جوق در جوق اپنے نئے نواب کے استقبال اور مبارک باد دینے کے لیے جمع ہونے لگے ۔

لال بارہ دری کو کسی دُلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا ۔ شہنائیاں گونج رہی تھیں ۔ نوبت جھڑ رہی تھی ۔ مہمان زرق برق لباسوں میں چلے آ رہے تھے ۔ عمائدین شہر ، علماء فضلہ ، وزراء ، رئیس ، حفاظ ، تعلقدار ، زمیندار ، سردار ، پنڈت ، شاعر و ادیب ، موسیقار ، مغنّی ، بھانڈ ، رقاص ، سوزخواں ، مرثیہ خواں ، ذاکر ، حدیث خواں ، ہر طبقہ کے ہنرمند ، طوائفیں ، تاجر اور مجاہدین کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے سالار غرض تمام باکمال افراد موجود تھے اور حسب مراتب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ شاہی بگل گونج اُٹھے اور نقاروں پر زور زور سے چوٹیں پڑنے لگیں اور اعلان ہوا ، باادب باملاحظہ ہوشیار ، وارثِ تخت و سلطنت ، فرزندِ دلبند حضرت واجد علی شاہ شہزادہ رمضان علی خان برجیس قدر جلوہ افروز ہوتے ہیں ۔ شاہی بگل پھر ایک بار گونج اُٹھا اور شہزادہ باوقار شخصیتوں کی معیت میں داخل ہوا ۔ تمام لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پھولوں کی

برسات ہونے لگی۔شہزادہ نہایت وقار کے ساتھ تختِ شاہی کے قریب پہنچا ایک نظر طائرانہ تمام پر ڈالی اور پھر پوری تمکنت کے ساتھ بیٹھ گیا۔

عوام پورے جوش وخروش کے ساتھ نعرے لگانے لگے،

شہزادہ برجیس قدر زندہ باد

شہزادہ برجیس قدر زندہ باد

شہزادہ برجیس قدر زندہ باد

تاج پوشی کی رسومات شروع ہوئیں۔بعد تلاوتِ کلام پاک امام ضامن باندھا گیا اور دربار کے معتمد برکات احمد اور شہاب الدین نے شہزادے کے سر پر تاج سجادیا اور اشرفیاں لٹائی جانے لگیں۔مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔نذریں پیش ہونے لگیں اور عوام جوش محبت میں نعرے لگانے لگے،

نواب برجیس قدر زندہ باد

نواب برجیس قدر زندہ باد

نواب برجیس قدر زندہ باد

جب شور کم ہوا تو پردہ کی آڑ سے والدہ برجیس قدر حضرت محل کی آواز بلند ہوئی،''میرے عزیز ہم وطنو! آپ سب کو نیا نواب مبارک ہو۔آج سے ہم نوعمر نواب کے اتالیق کا عہدہ قبول کرتے ہیں اور آپ سب کو یقین دلاتے ہیں کہ ایک طرف جہاں ہم اودھ کی آزادی کو ہر قیمت پر قائم رکھیں گے وہیں رعایا کی خوش حالی کو اولیت دیں گے۔سب کے ساتھ انصاف ہوگا اور ہر حقدار کو اُس کا حق بحال کیا جائے گا۔

میرے عزیز ہم وطنو! آپ سب خوب جانتے ہیں کہ اس وقت ہم تاریخ کے سب سے تاریک دور سے گزر رہے ہیں۔ایک طرف انگریز سامراجیت ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتی ہے تو دوسری طرف ہمارا آپسی نفاق ہمیں برباد کرسکتا ہے۔آیئے عہد کریں کہ ہم ہمیشہ متحد رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری رعایا انگریزوں کے خلاف ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوگی۔ہم جانتے ہیں کہ اودھ کہ چپے چپے پر سورج بنسی راجپوتوں کی

اولادیں اور سلاطین اودھ کے موروثی جاں نثار و جاں باز شجاعت و دلیری اور حب الوطنی کا ایسا مظاہرہ کریں گے کہ رہتی دنیا تک اُن کا نام ونشان باقی رہے گا۔

میرے عزیز ہم وطنو! آپ جانتے ہیں اودھ دراصل اجودھ ہے۔اور اجودھ کے معنی ہوتے ہیں کبھی نہ فتح ہونے والا۔آیئے ہم تاریخ کے صفحات پر اودھ کو اجودھ بنادیں۔

عوام جوش وعقیدت میں نعرے لگانے لگے،

بیگم حضرت محل زندہ باد

بیگم حضرت محل زندہ باد

بیگم حضرت محل زندہ باد۔

ایسا لگتا تھا جیسے لال بارہ دری کا چھت اُڑ جائے گا۔جب شور کم ہوا تو حضرت محل نے پھر کہنا شروع کیا،''نواب برجیس قدر کی تخت نشینی کی اطلاعیں مغل تاجدار شہنشاہِ ہند حضرت سراج الدین ابوالظفر بہادر شاہ ثانی کے ساتھ ہی ساتھ نانا صاحب، فیروز شاہ کو چک، بخت خان، شفیع اللہ خان، رئیس نجیب آباد، ولی داد خان رئیس مالاگڑھ، راجا کنور سنگھ، مظہر علی خان، عنایت اللہ خان، غلام قادر، پونا کے پیشوا، رانی لکشمی بائی ملکہ جھانسی، اور سردار تاتیا ٹوپے تک پہنچادیں۔کل تک تمام خطوط تیار کر لیے جائیں گے اور ساتھ ہی عہدہ داروں کا انتخاب اور ذمہ داریاں تقسیم کردی جائیں گی۔آج ہم صرف چند اہم عہدوں کا اعلان کرتے ہیں۔شرف الدین کو نائب وزیر آعظم کا عہدہ عطا کیا جاتا ہے۔مہاراجہ بال کشن دیوان مقرر کیے جاتے ہیں۔علی رضا بیگ کوتوال ہونگے۔میر واجد علی داروغہ ڈیوڑھی جات کے منصب سے سرفراز کیے جاتے ہیں۔راجہ جوالا پرشاد کے ذمہ منشی کا قلم دان ہوگا۔جئے لال سنگھ کو وزیر جنگ کا منصب بخشا جاتا ہے۔ممو خان ہمارے مشیر ہونگے۔بقیہ عہدوں کا انتخاب اور اعلان بہت جلد کردیا جائے گا۔

اس کے بعد نئے نواب کو اکیس توپوں کی سلامی دی گئی اور بعد طعام رقص و

سرور کی محفل آراستہ کی گئی اور تمام رات جشن کا ماحول رہا۔ آتش بازی کی رنگ برنگی چنگاریوں سے آسمان گلزار ہوتا رہا۔ صاحب سلامت اور مزاج پُرسی ہوتی رہی۔

رات گئے جشن سے عزیزن، چنبیلی، نسترن اور اُن کی بہت ساری سہلیاں لوٹ آئیں تھی۔ حیدر خان وہیں ٹھہرا رہا اور اپنے دوستوں کے ساتھ جشن کا لطف اُٹھاتا رہا۔

نسترن اور چنبیلی نے عزیزن کو اُس کے کمرے میں پہنچادیا۔ نسترن وہیں رُک گئیں اور چنبیلی بوا کے پاس چلی آئی جو غالباً رات کا آخری پان کا بیڑہ بنا رہی تھیں

''بوا۔۔آپ اکیلی ہی پان کھائیں گی۔؟'' چنبیلی نے اُنھیں چھیڑا

''اے ہے تم کو بھی تو بنا کر دوں گی۔'' اور بوا نے ناگردان میں سے ایک صاف ستھرا پان نکالا اور اُس پر چونا کتھا لگانے لگیں۔

''بوا۔'' چنبیلی نے آہستہ سے کہا، ''ایک بات بتائیں۔ آپا نے اپنی زندگی کا رُخ کیوں بدل دیا؟ ۔۔ یہ انقلاب کیسے آ گیا۔؟''

بوا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، ''اب کیا بتائیں بٹیا۔۔! وہ بھی دن تھے کہ نواب زادے، رئیس زادے، جاگیردار گھنٹوں رقص گاہ میں بیٹھے بی بی کا انتظار کرتے تھے۔ جو بھی ایک جھلک دیکھ لیتا اپنا دل ہار بیٹھتا تھا۔ کوٹھے کی وہ سجاوٹ تھی کہ سارا لکھنؤ عش عش کرتا تھا۔ لباس کی تراش خراش، زیور گہنے وہ ہوتے کہ اُن کی صنائی کو دیکھ آنکھیں پلک مارنا بھول جاتیں اور جب گھنگھروں کی چھنا چھن میں اداؤں کی ڈولی پر غزل کا پہلا مصرعہ لبوں سے جھڑتا تو اشرفیوں کے توڑے برسنے لگتے۔۔آہ۔۔ اب تو سب کچھ گویا خواب کی باتیں کردی ہیں بی بی نے۔'' بوا نے آنکھیں بند کرلیں اور ماضی میں کہیں کھوگئیں۔

''بوا۔'' چنبیلی نے اُنھیں آہستہ سے ٹھوکا دیا۔ بوا نے آنکھیں کھولیں، چنبیلی کی طرف دیکھا وہ بہت اُداس نظر آ رہی تھیں۔

''پھر۔''

''ایک دن بازار سے کیا آئیں، دماغ میں عجب سودا لے کر آئیں، دن تمام بڑبڑاتی رہیں۔۔۔

میں ان فرنگیوں کے خلاف کام کروں گی۔ شاید نانا صاحب سے مل کر آئیں تھیں۔ اس کے بعد کا حال کیا سناؤں بی بی، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

بوا خاموش ہو گئیں۔

اور چنبیلی اُنھیں غور سے دیکھنے لگی، ''یاد کریں بوا! آپ تو سب کچھ جانتی ہیں یاد کریں۔''

بوا نے چنبیلی کی طرف گھور کر دیکھا۔

تمام طوائفیں آ گئیں تھی۔ اور عزیزن اُن سے کہہ رہی تھی، میری عزیز سہلیو! تم میرے بلاوے پر سج دھج کر پالکی میں سوار ہو کر چھم چھم اتراتی ہوئی آئیں ہیں۔۔ لیکن میری طرف دیکھو! میں نے اپنے سر سے آنچل اُتار پھینکا ہے۔ اپنے سارے گہنے فروخت کر دیئے ہیں اور یہ دیکھو میری پیٹھ پر کفن بندھا ہوا ہے۔ جانتے ہو کیوں ۔۔؟ کیوں میں نے یہ سب کچھ کیا ہے؟''

ساری سہلیاں دم بخود اُسے گھورے جا رہی تھیں۔ پھر ایک کی زبان سے نکلا ،''آپا ہم کیا جانے پردہ نشین۔؟''

عزیزن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، اور وہ اُنھیں بتانے لگی، ''یہ فرنگی بچے ہمارے ملک میں تاجر بن کر آئے تھے، اور آج ملک پر قبضہ کر کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ میرٹھ کے مجاہدین نے اُن کی سرداری کا جوا اُتار پھینکا ہے۔ اُنھیں فتح نصیب ہو چکی ہے۔ ہم لکھنؤ والوں کو بھی چاہیے کہ اپنے ملک کو آزاد کروائیں۔ سنا ہے کہ ہماری ملکہ حضرت محل رات دن یہی منصوبے بنا رہی ہیں۔ وہ ملک کے لیے تلوار اُٹھائیں گی اور ہم کیا صرف پائلیں چھنچھناتی رہیں گی۔؟''

''آپا۔! آپ نے بات تو بڑے پتے کی کہی ہے۔'' ایک سہیلی نے تعریفی

نظروں سے عزیزن کی طرف دیکھا، ''لیکن یہ تو بتائیں ہم گانے بجانے والیاں میدان جنگ میں کیا کریں گی؟''

عزیزن نے سب کی جانب غور سے دیکھا، ''میں نانا صاحب سے مل کر آرہی ہوں، اُنھوں نے مجھے خواتین کی فوج تیار کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ہم میں جو تلوار بندوق چلانا سیکھ جائیں گی وہ میدان جنگ میں لڑیں گی اور جو ہتیاروں سے خوف کھاتی ہیں وہ زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کریں گی۔'' اُس نے سب کی طرف باری باری سے دیکھا، ''بتائیں آپ کے کیا ارادے ہیں۔''

سب کی نظریں عزیزن پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہم سب تیار ہیں۔'' ایک آواز اُبھری۔

''ہم اپنا تن من دھن نچھاور کرنے تیار ہیں۔'' دوسری آواز نے اعلان کیا۔

''لیکن ہمیں ہتیار چلانا کون سکھائے گا۔؟'' ایک سوال سامنے آیا۔

''ہمیں فوجی تربیت دینے کا بندوبست سالار تاتیا ٹوپے صاحب نے کر دیا ہے۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔''

تمام خواتین کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''ہم گھر گھر قریہ قریہ دیہات دیہات جائیں گے اور اپنی فوج تیار کریں گے۔''

''جب تک انگریز اس ملک سے چلے نہیں جاتے ہم جنگ کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔''

''شاباش میری بہنو!'' عزیزن اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، ''اب جاؤ اور وہی کام کرو جو میں نے کیا ہے۔ ہماری فوج کو روپیوں پیسوں کی سخت ضرورت ہے اور ہمیں ہر طرح کا تعاون کرنا ہے۔''

بوا ابھی تک اُسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''بوا۔'' چنبیلی نے اُنھیں آواز دی۔

''ہاں۔'' اُنھوں نے ایک لمبی سانس لی، اور کہنے لگیں، ''بس۔۔تب سے معمولات بدل گئے ہیں۔اب تم ہی دیکھو، اس گھر میں کیا بچا ہے؟ بوا نے کھڑکی سے باہر دیکھا دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

اور چنبیلی اُنھیں ٹکٹکی باندھے گھورے جارہی تھی۔

پنڈت کو نیند نہیں آرہی تھی اور اتنی بڑی دیوڑھی میں اُسے وحشت سی ہو رہی تھی۔وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ گیا۔سارا شہر خاموش تھا اور اس سناٹے میں کبھی کبھار بندوقوں کے چلنے کی آوازیں گونج اُٹھتیں تو ماحول وحشت ناک ہو جاتا۔وہ چھت پر یونہی بے مقصد ٹہلتا رہا۔پھر اُسے ذرسا محسوس ہونے لگا کہ کہیں آس پاس کے پڑوسی جاگ رہے ہوں تو وہ اُسے چور نہ سمجھ لیں۔حیدر بھائی بھی یہاں پر نہیں ہیں۔اُس کی صفائی کون کرے گا۔؟ وہ فوراً نیچے آگیا اور دالان میں بیٹھ گیا۔جب سے یہ لوگ اُسے یہاں اکیلا چھوڑ کر گئے ہیں اُس کا یہی حال ہے۔وہ دن تمام تو اِدھر اُدھر گزار لیتا ہے لیکن جیسے ہی رات آتی ہے اُسے تنہائی ڈسنے لگتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔اچانک اُس کے ذہن میں ایک بات آئی کہ اکیلے میں آدمی کو گنگنانا چاہیے۔اس سے وحشت کم ہو جاتی ہے۔اُس نے کبھی اُستاد تانرس خان کو گاتے ہوئے سنا تھا۔وہ فوراً سنبھل کر اُستاد کی طرح بیٹھ گیا اور پھر اُس کے تصور میں اُس کے کندھے پر ستار لگ گیا اور وہ گانے لگا، ''سا۔۔رے۔۔گا۔۔ما۔۔پا۔۔دھا۔۔سا۔۔نی۔۔۔!''

اُسے خود پر ہنسی آگئی۔اس طرح کے بے معنیٰ گانے سے کیا ہوگا؟ اُسے سنت کبیر کی شاعری بے حد پسند تھی۔اچانک اُس کے ذہن میں اُن کے مصرعے مترنم ہو گئے اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور گانے لگا۔۔۔

جھینی جھینی بنی چدریا

کاہے کہ تانا کاہے کہ بھرنی
کون تار سے بنی چدریا
جھینی جھینی بنی چدریا
کاہے کہ تانا کا ہے کہ بھرنی
انگلا پنگلا تانا بھرنی
سکھ من تار سے بنی چدریا
جھینی جھینی

دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی اور اُس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اپنی گائیکی کو چھوڑا اور یقین وگمان میں اُلجھنے لگا کہ اُس نے دستک کی جو آواز سُنی وہ دیوڑھی کے دروازے ہی پر تھی یا کسی پڑوسی کے دروازے پر؟

دستک کی آواز پھر آئی اور اُس نے وہیں سے آواز لگائی، ''کون۔۔!''

''دروازہ کھولو بچہ۔''

وہ دروازے کے پاس پہنچا اور جیسے ہی دروازہ کھولا، اُس کے سامنے ایک ننگ دھڑنگ سادھو گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔

''مہاراج آپ۔۔!'' وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔

''بچہ یہ جیون ایک دھوکا ہووے۔ گیان دھیان لاگ لپٹ کی اس کرم بھومی پر کون گیانی اور کون اگیانی؟ جو ہووے وہ نہ ہووے؟ جو نہ ہووے وہ ہووے۔ سنسار کا رچن کرئیا، کرے چمتکار۔ کہاں کا ساون کہاں کا بھادوں، من تو ٹھہرا مایا موہ کا ڈیرا، سب دھوکا ہے دھوکا۔!''

''مہاراج آپ غلط استھان پر پہنچے ہیں۔'' پنڈت اُسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اَمبھو۔ اَمبھو۔۔ بالک ہمارا یہ اشو آج تک ہمیں کبھی غلط استھان پر لے کر ہی نہیں گیا۔''

''لیکن مہاراج میں نے بھی آج تک کسی سادھو کو گھوڑے پر سوار نہیں دیکھا یہ اَچمبھو ہے۔''

سادھو کو غصہ آ گیا،''مورکھ! تب کیا تو نے کسی گھوڑے کو سادھو پر سوار دیکھا ہے؟''

''نہیں مہاراج۔ میں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا۔''

'' تو پھر بھیتر ہو جا۔۔!'' سادھو گرجا۔

''کیا؟'' پنڈت ڈر کے مارے دروازے کو بند کرنے لگا۔

'' دروازہ بند نہ کر مورکھ۔۔! اور بھیتر ہو جا۔'' سادھو کا گھوڑا زبردستی دروازے کے اندر آدھا داخل ہو گیا،'' اپنے پرم متر مہاراج بھانو پرتاپ پر دروازہ بند کرتا ہے؟ گرو حیدر سائیں تجھے شراپ دیں گے۔''

''بھانو تم؟'' پنڈت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے دروازہ کھول دیا۔ بھانو نے فوراً نقلی جٹاؤں کی ٹوپی اُتار دی اور اندر داخل ہوتے ہی داڑھی کے بالوں کو نوچنے لگا۔

''اِس طرح مہاراج کا روپ دھارن کرنے کی وجہ؟'' دونوں اصطبل کی طرف بڑھنے لگے۔

''اس کے بغیر رات گئے دلّی میں داخل ہونا مشکل تھا۔ بہت سخت پہرا ہے مورکھ۔''

بھانو گھوڑے کو اصطبل میں باندھنے لگا،'' بھائی پنڈت بھوک کے مارے جان نکل رہی ہے۔ کچھ بندوبست کرو۔''

''تم منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگاتا ہوں۔''

بھانو کنویں کی طرف بڑھا۔ ڈول سے پانی نکالا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ اُس کے کانوں میں پنڈت کی آوازیں آ رہی تھیں،

جھینی جھینی بنی چدریا

کاہے کہ تانا کاہے کہ بھرنی
جھینی جھینی بنی چدریا

''پنڈت۔'' بھانو نے اُسے آواز دی
''آجائیں بھیا! آلو کا ساگ اور نان بائی کی دکان سے لائی ہوئی روٹیاں تیار ہیں۔''

دونوں دسترخوان کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

بھانو نے کھانا کھاتے کھاتے سوال کیا، ''اپنے سارے، ساتھی دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔''

''تارا بجو کا بیاہ بنارس میں ہے، سلطان میاں کنیادان کے لیے بنارس گئے ہیں۔''

''اچھا ہے۔'' اُس کے چہرے پر خوشی عود آئی، ''دولہا کون ہے؟''

''اپنا دینا ناتھ۔''

''یہ کام بہت اچھا ہوا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔'' اُس نے پانی کے کٹورے کی طرف ہاتھ بڑھایا، ''اور حیدر بھائی۔؟''

پنڈت نے لمبی سانس لی، ''بھیا وہ تو پہنچ گئے اپنی سسرال، اپنی دُلہنیا کے ساتھ۔''

''مطلب گرفتار ہو گئے؟'' بھانو پرتاب ایک دم پریشان ہو گیا۔

''یہ تو ہم نے کہا ہی نہیں۔''

''پھر سسرال کا مطلب۔؟''

''سسرال کا مطلب سسرال ہی ہوتا ہے۔''

بھانو حیرت سے پنڈت کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ چنبیلی بھابھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔''

''ہاں تو ؟''

''لکھنؤ گئے ہیں جنگ میں شریک ہونے کی خاطر۔''

''اوہ۔'' بھانو نے اطمینان کی سانس لی ''پنڈت ویسے یہاں کے کیا حالات ہیں؟''

''مجاہدین کا پلڑا ابھی تک تو بھاری ہے۔ دو چار جگہ فرنگیوں کو بُری طرح شکست بھی دی ہے۔ بلکہ جب سے بخت خان نے کمان اپنے ہاتھوں میں لیا ہے فرنگی بڑے پریشان ہیں۔ چُٹ پُٹ جھڑپیں تو روز ہی ہوتی ہیں، مگر وہ دلّی میں داخل ہونے کا ساہس نہیں کرر ہے ہیں۔''

''پنڈت! یہ قوم بڑی شاطر ہے۔ یہ کبھی خاموش نہیں بیٹھ سکتی اگر وہ خاموش بیٹھی ہے تو یہ نہ سوچیں کہ وہ کسی بخت خان سے ڈر رہی ہے۔۔ نا۔۔ وہ برابر توڑ جوڑ اور غداروں پر جال ڈالنے کی کوشش میں ہونگی اور کیا عجب ابھی تک وہ مجاہدین کے لشکر میں سیند بھی لگا چکے ہوں؟''

''ہوں۔'' پنڈت نے فکرمند نظروں سے بھانو پرتاب کی طرف دیکھا ''وہ یہ سب یقینی طور پر کرر ہے ہونگے، پر یہ تو بتاؤ تم اتنے دنوں سے کہاں تھے؟''

''میں۔'' بھانو پرتاب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ''جھانسی کو آباد کرلیا تھا اور کیا۔''

''وہاں کا کیا حال ہے۔۔؟''

''بہت بُرے حالات ہیں ان فرنگیوں کے۔'' بھانو پرتاب کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی ''میرٹھ، دلّی، بلند شہر، آعظم گڑھ، فیض آباد، لکھنو، کانپور، فتح گڑھ، سیتاپور، مرادآباد، رڑکی، بنارس اور نہ جانے کہاں کہاں سے فرنگیوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک چکی ہے۔ وہ لٹے پٹے اپنی جان کو لیے گورنر جنرل کی چٹھی لے کر جھانسی پہنچے۔ گورنر جنرل نے رانی کو لکھا تھا کہ ان کو شرن دیں۔ ان کی مدد کریں۔''

''پھر۔۔؟''

''رانی صاحبہ نے انکار کر دیا بلکہ خوب کرارا جواب بھی دیا۔''

''اچھا؟''

''اُس نے لکھا کہ تم نے ہماری کونسی بات تسلیم کی ہے جو ہم تم پر مہربانی کریں؟ تم دامودر کو جھانسی کا وارث ماننے سے انکار کر رہے ہو، تم نے میرے پتی پر ہمیشہ دباؤ ڈالا ہے۔ ہم تم کو چیتاونی دیتے ہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سارے فرنگی یہاں سے چلے جائیں، ورنہ اُن کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو مجاہدین اب تک کرتے رہے ہیں۔''

بھانو پرتاب نے پنڈت کی طرف دیکھا گویا رانی کے اس اقدام کی تائید چاہتا ہو۔

''بھیا یہ سب کیا بھرے دربار میں ہوا؟''

''اور کیا۔''

''اور کسی نے کچھ نہیں کہا۔؟'' پنڈت کا تجسس سوال بن گیا۔

''ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا پنڈت۔'' وہ بتانے لگا، ''کچھ درباری ڈر کے مارے خواہ مخواہ خدشات اُجاگر کرنے لگے کہ انگریز ناراض ہو جائیں گے تو جھانسی پر چڑھائی کر دیں گے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا۔۔اُس شیرنی نے جو جواب دیا ہے اُس کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں اب بھی گونج رہا ہے کہ اگر وہ حملہ کریں تو ہم اُن کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ یہ جھانسی ہے کوئی دودھ ملائی نہیں کہ کوئی بھی آئے گا اور چٹ کر جائے۔ وہ ادھر آئیں گے تو دنیا کو منہ نہ دکھا پائیں گے۔ جھانسی کے سپاہی کاغذ کے شیر نہیں فولاد ہیں اور اُن کی رانی اپنی فوج کی کمان خود سنبھال سکتی ہے۔''

''رانی کا جواب سن کر تو فرنگی بہت طیش میں آ گئے ہونگے؟

''طیش میں؟ ارے بھیا گورنر جنرل نے ایک بڑی فوج جنرل ڈنلپ اور

سارجنٹ گارڈن کی کمان میں جھانسی روانہ کردی۔''

''اور جنگ بھی ہوگئی؟'' پنڈت نے بھانو پرتاب کی آنکھوں میں حیرت سے دیکھا۔

''سب سنائیں گے، ایک ایک بات بتائیں گے پنڈت، بس زرا جنگ کو اپنے تصور میں تو بھر لینے دو۔''

پنڈت ہمہ تن گوش ہوگیا۔

اور بھانو پرتاب کی آنکھیں دور بہت دور اُن پہاڑی علاقوں میں کھُل گئیں جہاں جنرل ڈنلاپ اور گارڈن کی قیادت میں انگریزی افواج جھانسی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ انگریزوں کے مخبروں کے مطابق یہی وہ جگہ تھی جہاں جھانسی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی انہیں مجاہدین کا سامنا کرنا تھا لیکن مقابل میں کوئی نہیں تھا اور پہاڑی علاقہ سنسان تھا، جنرل کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی ''دیکھا سارجنٹ سب ڈر کر بھاگ گیا! وہ جانتا تھا کہ ہم اُن کو کتے کا موت مارے گا۔''

''یس سر! یو آر گریٹ۔''

''ابھی یہاں سے سیدھا جھانسی چلو۔'' اس نے فوج کو حکم دیا، ''آگے بڑھو۔!''

اور فوج پہاڑی راستے پر قدم بڑھانے لگی۔ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہمت خان اور گوبند راؤ کی فوجیں آگے پیچھے فاصلہ بنا کر اس طرح کھڑی ہیں کہ دونوں طرف سے دھاوا بول دیں گی اور کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کے رکھ دیں گی۔

انگریز جنرل اور ان کی افواج اپنی کثرتِ تعداد اور اعلیٰ درجے کے اسلحہ کے گھمنڈ میں بے خوف جنگلوں میں داخل ہوگئی اور مجاہدین گھات لگائے بیٹھے تھے کہ جیسے ہی وہ اُن کی زد میں آئیں گے وہ پوری شدت کے ساتھ اُن پر حملہ کردیں گے۔

اور پھر وہی ہوا جس کا انتظار مجاہدین کر رہے تھے۔ اچانک سامنے سے

ہمت خان کی فوج نے اُن پر حملہ کر دیا۔ تلوار باز اپنا کام کر رہے تھے اور بندوق برداروں کی بندوقوں سے نکلنے والی گولیاں تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور انگریز سپاہی لاشوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ وہ گھبرا گئے اور جیسے ہی واپسی کے لیے پلٹے تو سامنے گوبند راؤ کی فوج کھڑی تھی۔ انھوں نے بھی اُسی شدت سے حملہ کیا۔ چیخ و پکار آہ و فغاں کا بازار گرم ہو گیا اور انگریز سپاہی اس طرح زخمی ہو کر گر رہے تھے جیسے بھڑ بھونجے کے کڑاؤ میں چنے پھوٹتے ہیں۔ دونوں طرف سے انگریزوں پر اس قدر دباؤ تھا کہ مقابلہ کرنا تو درکنار بھاگنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ یہ کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ آخر جنرل ڈنلپ اور سارجنٹ گارڈن کس کے ہاتھوں مارے گئے۔ جو بھاگ سکتے تھے وہ کسی طرح بھاگ نکلے لیکن سارا ساز و سامان، اسلحہ وہیں پر رہ گیا۔ اور مجاہدین نہایت اطمینان سے وہ سب سامان سمیٹنے لگے۔

بھانو پرتاب اب بھی اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

''بھانو۔'' پنڈت نے اُسے آواز دی۔

بھانو پر آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ سوار ہونے لگا تھا۔ اُس نے جمائی لیتے ہوئے پنڈت کی طرف دیکھا۔

''یہ جنگ تو مجاہدین نے بنا رانی کے ہی جیت لی۔''

''ہاں میرے دوست۔'' وہ دالان ہی میں لیٹ گیا، ''رانی کو جیسے ہی اس فتح کی خبر معلوم ہوئی وہ فوراً مجاہدین سے ملنے پہنچ گئی اور انھیں مبارک باد دی۔ سارے ہی مجاہدین اُس کی جئے جئے کار کر رہے تھے۔'' اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ ہی دیر میں اُس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ پنڈت نے مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا اور پھر خود بھی اُس کے بازو لیٹ گیا۔

☆☆☆

(۱۵)

شہزادہ برجیس قدر کی تخت نشینی کے دوسرے دن ہی سے مولانا احمد اللہ شاہ کی کمان میں مجاہدین نے ریسیڈنسی کا محاصرہ کرلیا تھا۔ اگر چہ اُس وقت تک اُن کے پاس کمزور توپیں ہی تھیں۔ جبکہ ریسیڈنسی ایک مضبوط قلعے میں تبدیل ہوگئی تھی اور اُنھوں نے جگہ جگہ بڑی بڑی توپیں نصب کردی تھیں، جس سے مجاہدین کو سخت نقصان پہنچ سکتا تھا، لیکن مجاہدین کے جوش اور انگریزوں سے شدید نفرت نے اُن کے حوصلوں کو بہت بڑھا دیا تھا۔ وہ شدت سے حملے کرتے ہوئے ریسیڈنسی کے قریب تک پہنچ جاتے۔ اُس وقت سکھ رجمنٹ انگریزوں کا حق نمک اس طرح ادا کرتی کہ وہ اُن کے حملوں کے زور کو توڑ دیتی، کبھی اُنھیں پیچھے دھکیل دیتی، اور کبھی یہ جیالے قریب پہنچ کر سیڑھیاں لگا کر دیوار پھاندنے کی کوشش کرتے تو سکھ رجمنٹ آڑے آجاتی، کیونکہ اُن کے پاس سارے ہی جدید ہتیار تھے۔ دن تمام توپیں چلتیں، بندوقوں سے گولیاں برستیں، تلواریں اپنی کاٹ دکھاتیں۔ ادھر بھی اور اُدھر بھی زخمی گرتے مرتے اور جنگ جاری رہتی اور بڑا نقصان انگریزوں ہی کا ہوتا۔ یہاں تک کہ مجاہدین کی گولہ باری کا شکار ہوکر ہینری لارنس بھی جہنم رسید ہوگیا۔

رات ہوتے ہی جنگی اُصولوں کے تحت جنگ رُک جاتی اور فوجیں اپنے اپنے کیمپوں میں پہنچ جاتیں۔ ایسی ہی ایک رات تھی۔ مجاہدین کی چھاؤنی میں زخمیوں کی مرہم پٹی ہورہی تھی۔ وہیں کچھ سپاہی اپنے ہتیاروں کو درست کررہے تھے۔ کچھ

اپنے گھوڑوں کی پیٹھ تھپتھپا رہے تھے اور کچھ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ جگہ جگہ پہرے دار متعین تھے۔ مشعلیں روشن تھیں۔ حیدر خان اور چنبیلی بھی یونہی گھوم رہے تھے کہ اچانک حیدر خان نے دیکھا ایک مشعل کے نیچے ایک نوجوان اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھ اُس کے سینے پر ہیں۔ اُس نے غور سے دیکھا تو دوسرے ہی لمحے میں اُسے پہچان لیا۔ اُس نے چنبیلی کی توجہ اُس طرف کی۔ چنبیلی نے بھی اُسے غور سے دیکھا اور فوراً کہا، ''ارے وہ تو سلیم ہی ہے۔ میرا محسن ا پھٹ کی جنگ میں اُس نے جس پھرتی سے چھلانگ لگا کر میری جان بچائی تھی میں اُسے کیسے بھول سکتی ہوں۔''

''ہاں۔'' حیدر خان نے بھی اُس کی تائید کی اور وہ دونوں اُس کی طرف بڑھے اور وہ اُن سے بے نیاز اپنی دھن میں مست تھا۔

وہ دونوں اُس کے قریب پہنچے اور خاموشی سے دیکھنے لگے، وہ اپنے سینے کے زخموں کو کرید رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر حیدر خان نے اُس سے پوچھا، ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

وہ ایک دم ٹپٹا گیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، ''کچھ بھی تو نہیں۔'' اُس نے گردن جھکا دی۔

''عزیزم آپ زخموں کو کرید رہے ہیں جبکہ زخموں کو کریدا نہیں جاتا۔''

''بھائی جان یہ اگر اچھے ہو گئے تو ہم کنگال ہو جائیں گے۔'' اُس کا سر ابھی بھی جھکا ہوا ہی تھا۔

''یعنی یہ زخم نہیں ہیرے موتی ہیں۔'' چنبیلی نے اُس کے سر کو اوپر اُٹھایا۔

''بجو۔۔ یہ زخم میرے لیے ہیرے موتی سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا، ''کسی نے ہم سے فرمائش کی ہے کہ جب ہم جنگ سے واپس آئیں تو اُن کے لیے اپنے سینے پر زخم سجا کر لاویں۔''

چنبیلی نے حیدر خان کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر سلیم سے مخاطب ہوئی، ''بھیا تم تو بڑے چھپے رستم نکلے ہو، گھوڑے پر کمالات دکھاتے ہو،

بندوق سے نشانہ بھی لگاتے ہو اور نظروں سے کسی کو گھائل بھی کر کے رکھا ہے، کس سے محبت کرتے ہو۔؟ ہمیں نہیں بتاؤ گے؟''

سلیم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی، '' بجو وہ بہت اچھی ہے، بچپن ہی سے ہم دونوں ایک ساتھ کھیلتے کودتے بڑے ہوئے ہیں۔ ہم جنگ جیت کر جب جائیں گے نا تو اُن سے بیاہ کر لیں گے۔ وہ بھی ہم سے بہت خوش رہتی ہیں۔''

''سلیم میاں آپ فرشتوں کی طرح معصوم ہیں'' حیدر خان نے اُس کے سر پر سے ہاتھ پھیرا،'' میرے بھیا اپنی محبوبہ کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ لے کر جائیں، وہ تو اُس نے آپ کو یونہی کہا ہوگا۔''

''ہاں سلیم! تحفے میں کوئی زخم نہیں دیتا۔'' چنبیلی کے چہرے پر بہنوں کی سی شفیق مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نہیں بجو!'' سلیم نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا'' ہمارے لیے یہ صرف زخم ہی نہیں ہیں، یہ تو ہماری بہادری کا انعام ہیں۔ وہ ہمیں ہمیشہ ایک بہادر سپاہی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں۔''

'' واہ جواب نہیں۔'' حیدر خان نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی، '' عزیزم! واقعی تم بڑے خوش قسمت ہو، اگر تمہاری جیسی محبوبہ ہر سپاہی کی قسمت میں آجائے تو یقین کرو، شجاعت و بہادری کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہوگی جس پر صدیاں فخر کرے گی، لیکن میرے پیارے بھیا زخموں کا علاج بھی ضروری ہے۔ ہر گہرا زخم ایک نشان بھی چھوڑتا ہے۔ تم وہ نشان اپنی محبوبہ کو دکھا دینا، کیونکہ تمھیں تو ابھی بہت ساری جنگیں لڑنا باقی ہے۔ سوچو۔۔ اگر تم زخمی ہی رہیں گے تو پھر کیسے لڑیں گے؟''

سلیم اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

'' تم میرے ساتھ چلو۔۔ میں تمہارے زخموں پر دوا لگا دیتا ہوں، وہ اچھے ہو کر تمہارے سینے پر ایسے ہی جگمگائیں گے جیسے آسمان میں تارے چمکتے ہیں۔''

سلیم نے کسی سعادت مند بچے کی طرح اپنی گردن جھکا دی۔

''چلو ہمارے ساتھ۔''

اور وہ تینوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگے۔

رات بھیگ چکی تھی۔ قلعہ معلی کے سارے ہی فانوس اور قندیلیں نیند کے خمار میں آنکھیں جھپک رہے تھے اور اوپر آسمان میں تارے زمین پر ہونے والے کھیل حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''حضور اب بندی کو چھوڑ یئے بھی۔'' وہ مرزا الٰہی بخش کی بانہوں میں اس طرح مچل رہی تھی جیسے صیاد کی ہاتھوں تیتری مچلتی ہے، اور شہزادہ اُس کے جسم پر اس طرح ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے کوئی بھڑکے ہوئے جانور کو راہِ راست پر لانے کی خاطر اُس کی گردن اور پیٹھ کو سہلاتا ہے۔

وہ پھر ایک بار مچلی، ''توبہ ہے حضور۔۔! اب بس بھی کیجیے۔'' اُس نے چھت پر لٹکے ہوئے بے بس جھومروں کی جانب دیکھا۔

'' جانِ الٰہی ! خدا جانے تم میں ایسی کیا خوبی ہے کہ دل سیراب ہی نہیں ہوتا۔'' اُس نے پھر ایک بار اُسے زور سے بھینچا۔

''اوئی اللہ۔ آج کیا جان لینے کا ارادہ ہے۔'' وہ اپنا چہرا شہزادے کے سینے پر رگڑنے لگی۔

'' حضور، بادشاہت کا تاج پہننے کے بعد بھی، کیا آپ ہم سے اسی طرح محبت کریں گے؟''

'' جانِ عزیز! ہم مغل ہیں، اور ہمارے اجداد نے اپنی ملکاؤں کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی نے صرف ایک پیالہ شراب کے عوض اپنی ساری سلطنت اپنی ملکہ کو بخش دی، اور کسی نے اپنی محبت کے یقین کی خاطر تاج محل بنادیا، تو ہم کیوں پیچھے رہیں گے۔ گُل افشاں، ہم تمھیں کیسے فراموش کرسکتے ہیں جبکہ تم اس حصولِ تخت و تاج میں ہماری معاون و مددگار بھی ہو۔''

''آہستہ کہیے حضور کہیں کوئی سن نہ لے۔''

مرزا الٰہی بخش گھبرا گیا اور خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کنیز نے قہقہہ لگایا، ''گستاخی معاف فرمائیں حضور! تخت و تاج کبھی بھی بزدلوں کی میراث نہیں بن سکتا۔''

مرزا الٰہی بخش کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اُس نے پوری قوت کے ساتھ اُسے پرے دھکیل دیا۔ وہ مسہری سے نیچے جا گری۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوں اور حیرت تھی۔ پھر وہ خود بھی مسہری سے نیچے اُتر گیا اور غصّے سے ٹہلتے ہوئے کہنے لگا، ''خدا کی قسم! مرزا الٰہی بخش بزدل ہونے کا طعنہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس نے اپنے اوپر ہونے والی ہر ناانصافی کو خندہ پیشانی سے جھیلا ہے۔ کبھی حالات کو پیٹھ نہیں دکھائی اور آج بھی وہ جس جرأت مندی سے قدم اُٹھا رہا ہے وہ کسی بزدل کی مجال نہیں ہو سکتی۔''

کنیز اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر شدید مایوسی تھی، اُس نے شاہی آداب ادا کیے اور پھر آہستہ سے کہا، ''میں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ صرف زبان کی شوخی تھی۔ میری کیا مجال جو میں کسی مغل شہزادے کو بزدل کہہ سکوں! لیکن حضور میری ایک بات آپ بھی یاد رکھیں، وفادار کبھی بھی جبر، انا، اور خاندانی رعب سے حاصل نہیں ہوتے۔ وفاداری کا سودا صبر و تحمل، فراغ دلی، عنایات و مہربانی کی ترازو میں تُلتا ہے۔ ۔ یہ کنیز اب اپنی اوقات سے واقف ہو چکی ہے۔۔ خدا حافظ۔''

وہ جانے کے لیے جیسے ہی پلٹی، مرزا الٰہی بخش کے زانوں کے نیچے سے تختِ شاہی لرز کر رہ گیا۔ اُس کی ساری خودداری اور آن بان کسی جلاد کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلوار میں دکھائی دینے لگی۔ اُس پر خوف غالب آنے لگا اور اُس کے ذہن نے اشارہ دیا، سینے کے راز کو باہر نکلنے کے لیے زیادہ دیر نہیں لگتی اور مصلحت بھیڑیے کی کھال اوڑھ کر خوشامد پر اُتر آئی اور اُس نے جھپٹ کر اُسے تھام لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا، ''میری جان گُل افشاں! تم ناراض ہو گئیں؟'' وہ اُس کی گردن کے بوسے لینے

لگا، ''تخت و تاج کا حصول اپنوں کو بھی اعتماد کی بھٹی سے گزارتا ہے اور ہم آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ آپ اپنے اس امتحان میں کامیاب ہو گئیں۔''

گل افشاں نے اُس کی طرف اُداس نظروں سے دیکھا، ''آپ نے تو لمحے بھر کے اندر ہی ہمیں اپنے خوابوں سے باہر نکال دیا تھا اور ہم اپنے مقدر کے اُن تاریک حجروں کی طرف لوٹ رہے تھے، جہاں غلامی باہیں پھیلائے گمنامی میں دفن کرنے کے لیے بے تاب تھی۔''

مرزا الٰہی بخش نے اُسے اپنی گود میں اُٹھالیا اور پھر ایک بار اُسے نہایت محبت سے مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا، ''گل افشاں! آئندہ لکھی جانے والی تاریخ میں تمہارا ذکر بھی مغلیہ خاندان کی عظیم الشان خواتین ملکہ نور جہاں اور ملکہ ممتاز محل کے ساتھ ہوگا۔''

کنیز اپنی بے عزتی کو بھول گئی اور مکار شہزادے سے لپٹ گئی، ''کنیز نے آج کی پیغام رسانی کے لیے بھی حضور بادشاہ سلامت کے ایک وفادار شخص میاں رجب علی کو خریدا ہے۔ وہ آدھی رات کو جب وقت کے تین ٹول گونجیں گے حاضر ہو جائے گا۔ آپ دروازہ کھلا رکھیں اور تمام شمعوں کو گل کر دیں۔''

مرزا الٰہی بخش نے اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

کنیز مسہری سے نیچے اُتر آئی، ادب سے جھکی اور کہنے لگی، ''اب کنیز کو اجازت دیں کہ رازداری میں تیسرا شخص غیر ضروری ہوتا ہے۔''

اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

''گل افشاں!'' مرزا الٰہی بخش نے آہستہ سے کہا، ''ہم کل بھی تمہارے منتظر رہیں گے۔''

گل افشاں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ نپے تلے قدموں سے اندھیرے میں چپ چاپ اُتر گئی۔ اُس کے قدم کنیزوں کے تنگ و تاریک حُجروں کی جانب بڑھ رہے تھے۔

مرزا الٰہی بخش بے چینی سے ٹہلنے لگا، پھر اُس نے نظریں اوپر گیس فانوسوں سے رنگ برنگی روشنی پھیل رہی تھی اور کانوں میں پردوں کی سرسراہٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُس کے ذہن میں بار بار وقت کے تین گھنٹے گونج رہے تھے۔ وقت کاٹے نہ کٹتا تھا۔ اُس نے شمعوں کو بجھانے کی ڈوری کھینچی اور ایک کے بعد ایک شمع بجھتی چلی گئی یہاں تک کہ مکمل اندھیرا ہو گیا اور پھر وقت نے اپنی آمد کا اعلان کیا اور ایک سایہ دبے پاؤں محل میں داخل ہوا اور آہستہ سے بولا، ''اقبال۔۔مزید اقبال۔''

''رجب علی وقت کیا کہتا ہے۔؟''

''حضور وقت آپ کے قدموں میں اپنا سر جھکا چکا ہے مصلحتیں آپ کے منصوبوں کی داد دے رہی ہیں اور بادشاہ سلامت کے کتنے ہی وفادار کچے دھاگے میں بندھے آپ کے ساتھ شامل ہو کر نمک حرامی کر رہے ہیں۔''

''رجب علی۔'' مرزا الٰہی بخش کی آواز میں قدرے غصہ تھا۔

''میرا مطلب آپ کی نمک حلالی کر رہے ہیں۔''

مرزا الٰہی بخش کا اطمینان بحال ہو گیا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، باہر کا اندھیرا اُس کے ہر منصوبے پر اپنی دبیز چادر اُڑھا رہا تھا۔

''حضور میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''انگریزوں کا ایک بڑا لشکر دلّی کی طرف آرہا ہے۔ ہڈسن صاحب تک تم کو یہ پیغام پہنچانا ہے کہ وہ دلّی میں یا تو کلکتہ دروازے سے یا پھر بادلی سرائے سے داخل ہوں۔''

''اور اگر وہ وجہ دریافت کریں تو۔؟''

''تو انھیں بتادیں کہ وہاں میرے آدمی متعین ہوں گے اور وہ کمزور مقامات کی نشان دہی کردیں گے۔''

رجب علی کے چہرے پر خوشیوں کے انار چھوٹنے لگے،'' یعنی کے۔۔یعنی کہ حضور کی بادشاہی کا قلمدان اب صرف چند گام ہی پر رہ گیا ہے۔''

مرزا الٰہی بخش نے رجب علی کی پیٹھ کو نہایت خلوص سے تھپتھپایا، ''آہستہ کہو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''ارے حضور! آپ اُس وقت کی بات کر رہے ہیں جب قلعہ معلّٰی میں آپ کے دادا حضرت بہادر شاہ اوّل حکومت کرتے تھے۔ اب تو یہ حال ہے کہ کان والے بھی بہرے ہیں اور آنکھ والے بھی اندھے ہیں۔''

مرزا الٰہی بخش کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اُٹھی، ''ہمیں تمہاری کارکردگی پر پورا اعتماد ہے۔''

''لیکن حضور یہ کام بہت مشکل ہے۔''

مرزا نے رجب علی کی طرف گھور کر دیکھا، ''فکر نہ کرو انعامات کی بھی برسات ہوگی۔''

رجب علی نے ادب سے سر جھکایا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اور مرزا الٰہی بخش اپنی آنکھوں میں سہانے خواب سجائے خواب گاہ کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔

جس طرح دلّی میں سازشیں ہو رہی تھیں اُسی طرح لکھنؤ کے مجاہدین میں بھی نااتفاقی بڑھ رہی تھی۔ اگرچہ بہادر شاہ ظفر کی طرح لکھنؤ کے عوام میں بھی بیگم حضرت محل کی بے حد عزّت تھی۔ ہر شخص اُن کی دلیری اور فراست کے گُن گاتا تھا لیکن بادشاہی میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ وہ آنکھ سے زیادہ کان پر بھروسہ کرتے تھے۔ بیگم حضرت محل کا مشیر ممّو خان برابر اپنی چال چل رہا تھا بلکہ اُس نے اپنی حرکتوں سے کئی کام بگاڑ دیئے تھے۔ اُسے مولانا احمد اللہ شاہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے بھی کد تھی۔ حالانکہ مولانا وہ شخصیت تھی جس نے فیض آباد سے لکھنؤ تک عوام میں ایک انقلابی جوش جگا دیا تھا۔ سارے ہی لوگ نہ صرف اُن کا بے حد احترام کرتے تھے، بلکہ اُن کے ایک اشارے پر اپنی جان تک داؤ پر لگانے تیار ہو جاتے تھے۔ ممو خان نے اُن کی شخصیت کو

مجروح کرنے کی خاطر اُنھیں بدنام کرنا شروع کیا کہ مولانا ہندو مسلمانوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتے جبکہ مولانا کی فوج میں ہندوؤں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی اور وہ سب اُن کے اُتنے ہی جاں نثار تھے۔ جب یہ حربہ کام نہ کر سکا تو اُس نے شیعہ سنّی تفرقہ پیدا کرنے کوشش کی۔ مولانا اُس کے ان حرکتوں کی وجہ سے بدظن ہو گئے اور شہر چھوڑ کر شہر سے باہر تارا کوٹھی میں قیام کرنے لگے۔ ان سارے اختلافات کے باوجود مولانا نے اپنے مقصد کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

مولانا احمد اللہ شاہ ریسیڈنسی پر مسلسل حملے کر رہے تھے۔ چنانچہ جمعہ کے دن عصر کے بعد اُنھوں نے پھر ایک بار زبردست حملے کیا اور اُس کی پھاٹک تک پہنچ گئے۔ محصورین گھبرا گئے کہ مولانا اب کسی بھی وقت اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ اُن کی توپیں مسلسل گولے برسا رہی تھیں۔ یہاں تک کے مولانا خود بھی ایک گولی کے شکار ہو گئے اور مجاہدین کو واپس لوٹنا پڑا، لیکن مولانا نے ہمت نہیں ہاری اور بہت جلد پھر ایک بار ریسڈنسی پر حملے کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ اور اُن کے فوجی روئی کے گٹھوں کی آڑ لیتے ہوئے پھر ایک بار ریسیڈنسی کی دیوار کے قریب پہنچ گئے اور سرنگ کھودنے لگے۔ محصورین کے ہوش اُڑ گئے لیکن اُن کی معاونت کرنے والی سکھ بٹالین پھر ایک بار حق نمک ادا کرنے جی جان سے سامنے آ گئی اور اوپر سے توپوں کے گولے اور بندوقوں سے گولیاں برسانے لگی اور مجبوراً مولانا کو پسپا ہونا پڑا۔ دوسرے دن مولانا نے اس انداز سے قندقیں کھدوائیں کے اوپر سے ہونے والی گولیوں کی بوچھار سے بچا جا سکتا تھا اور توپوں کو ایسے مقامات پر نصب کیا تھا کہ جب توپچی گولے برسائیں تو وہ اُنھیں نظر نہ آئیں۔ جنگ شروع ہوئی مجاہدین گولیوں کی برسات کرتے اور جوابی گولیاں اور توپ کے گولے برسنے سے پہلے ہی قندقوں میں چھپ جاتے اور اُن کو کوئی نقصان نہ ہوتا۔ اس لڑائی میں آخر مولانا ریسیڈنسی کی ایک دیوار میں سرنگ لگانے میں کامیاب ہو گئے اور اُن کے فوجی اندر داخل ہونے لگے۔ سخت مقابلہ ہونے لگا۔ سرنگ تنگ تھی اس لیے زیادہ فوج اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کے نتیجے میں جو اندر گیا وہ باہر نہ

آ سکا لیکن پھر بھی مجاہدین نے لفٹنٹ میچم اور لفٹنٹ سویٹ کو ختم کر دیا۔

جیسے ہی رات ہوتی مجاہدین اپنی چھاؤنی میں واپس آ جاتے اور پھر تازہ دم ہو کر دوسری صبح حملے کی تیاری میں مصروف ہو جاتے۔

لکھنؤ میں خبریں پہنچی کہ جنرل ہیولاک ایک بڑے لشکر کے ساتھ لکھنؤ کی طرف آ رہا ہے۔ اُسے روکنا بیحد ضروری تھا۔ چنانچے مجاہدین کے فوجی دستے اناؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ اُس میں حیدر خان کے ساتھ ہی ساتھ چنبیلی اور سلیم علی بھی شامل ہو گئے۔

جنرل ہیولاک کو قدم قدم پر مقابلوں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ جس مقام کے قریب بھی پہنچتا وہاں کے جاگیردار، تعلقدار، اور عام آدمی مقابلے پر آ جاتے اور اُسے آگے بڑھنے سے روک دیتے۔ کبھی گھنٹوں جنگ جاری رہتی اور کبھی ہفتوں وہ وہیں رُکا رہتا۔ فوجی مارے جاتے اسلحہ خرچ ہوتا۔ گھوڑے، بیل، گاڑیاں ناکارہ ہو جاتیں اور مجبوراً اُنھیں وہیں چھوڑ دینا پڑتا۔

جیسے تیسے انگریز لشکر اُناؤ کے قریب پہنچا۔ یہاں مجاہدین نے اُسے شہر کے باہر ہی روک دیا۔ زبردست رن پڑا۔ یہاں مجاہدین نے چھاپہ مار طریقۂ جنگ بھی جاری رکھا۔ اُن کی فوجی ٹکڑی اچانک اُن کے کسی بھی حصے پر حملہ کرتی اور اُن کے سنبھلتے سنبھلتے اُنھیں فوجی، جانی، مالی نقصان پہنچا کر لوٹ آتی، پھر دوسری ٹکڑی روانہ ہوتی اور وہ بھی اچانک فرنگیوں کے فوجی حصے پر دھاوہ بول دیتی اور اُنھیں نقصان پہنچا کر لوٹ آتی۔

جنرل ہیولاک بھی ارادے کا پکّا تھا۔ ان چھاپہ مار طریقوں سے وہ گھبرایا نہیں بلکہ فوج کو کسی طرح آگے بڑھاتا رہا، لیکن جیسے ہی وہ بستی کے قریب پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ یہاں مجاہدین نے جنگ کا ایک بالکل نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ شہر کے کچے مکانوں میں مجاہدین نے سوراخ کر دیئے تھے اور اُن سوراخوں میں بندوقوں کی نالیں لگا دی تھیں اور انگریز لشکر پر گولیاں برسانا شروع کر دیا۔ انگریز فوجی مر رہے تھے لیکن

حملہ آور نظر نہ آتے۔ یہاں انگریزوں کو کافی بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ جنرل ہیولاک غصے سے بے قابو ہو گیا اور اُس نے پوری بستی کو نذرِ آتش کر دیا لیکن اس کے باوجود مجاہدین پسپا نہیں ہوئے اور وہ مسلسل گولیاں داغتے رہے۔

دوسری طرف داناپور میں بھی بغاوت ہو گئی اور ہیولاک کو ملنے والی کمک بند ہو گئی۔

مجاہدین پیچھے ہٹے اور پھر فتح پور چوراسی میں متحد ہو کر ہیولاک پر حملہ بول دیا لیکن اس معرکہ میں مجاہدین کا کمانڈر جسا سنگھ شہید ہو گیا۔ انگریزوں کو دن اور رات جنگ جھیلنا پڑ رہی تھی۔ اُن کے بارود میگزین کا تہائی حصہ ختم ہو چکا تھا اور وہ اب بھی لکھنؤ سے بہت دور تھے۔

مجاہدین نے پھر ایک بار بشیرت گنج پر قبضہ کر لیا۔ ہیولاک جب کان پور سے نکلا تھا تو اُس وقت نانا صاحب کی فوج وہاں پر نہیں تھی لیکن جیسے ہی وہ آگے بڑھا تو نانا صاحب اپنی فوج کے ساتھ پھر ایک بار کانپور پہنچ گئے اور اس بار اُن کے ساتھ گوالیار اور ساگر کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ اُدھر داناپور کے باغی بھی نانا صاحب کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ آخر ہیولاک نے لکھنؤ فتح کرنے کا خیال دل سے نکال دیا، لیکن پیچھے ہٹنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر ایک بار بشیرت گنج میں مقابلے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

مجاہدین نے ایک مقام بورھیا کا انتخاب کیا اور جگہ جگہ کھائیاں کھود ڈالیں۔ مورچے بنائے، داہنی طرف توپیں نصب کر دیں۔ دوسری جانب ایک گہری دلدلی کھائی تھی۔ جس پر اُنھوں نے انگریزوں کو دھوکا دینے کی خاطر گھانس پھوس پھیلا دیا تھا۔

انگریزوں کی فوج اندھا دھند آگے بڑھ رہی تھی اور مجاہدین کے منصوبے کے مطابق سیدھا دلدل میں پھنس گئی۔ مجاہدین نے توپوں کے دہانے کھول دیئے اور بڑی تعداد میں انگریز سپاہی لقمہ اجل ہو گئے۔ توپیں خاموش ہوتیں تو اُن کے پیچھے

کھڑے ہوئے بندوق بردار گولیوں کی برسات کر دیتے۔

اس جنگ میں انگریزوں کو زبردست جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔

اسی جنگ میں حیدر خان لڑتے ہوئی بُری طرح پھنس گیا تھا اور اُسے چنبیلی اور سلیم کسی طرح میدان جنگ سے نکال لائے۔

حیدر خان کو کاری زخم لگے تھے۔ مجبوراً چنبیلی اور سلیم علی نے لکھنؤ واپس جانے کا فیصلہ کیا اور اس کے انتظام میں جٹ گئے۔

حیدر علی کو بڑی مشکل سے گھوڑے پر سوار کیا گیا تھا اور اُس کے پیچھے چنبیلی بیٹھ گئی تھی۔ سلیم اپنے گھوڑے پر تھا اور حیدر خان کے گھوڑے پر سامان لاد دیا گیا۔ گھوڑے دھیمے دھیمے قدم اُٹھا رہے تھے۔ چنبیلی حیدر خان کو سنبھالے ہوئی تھی۔ اگرچہ اُس کے زخموں پر دوائی لگا کر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں لیکن اُس پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے، ایسی حالت میں اُسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ چنبیلی کی آنکھوں سے آنسوں تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ وہ مسلسل اللہ کے حضور حیدر خان کی صحت یابی اور اوراپنے گھر خیر و خوبی سے پہنچنے کے لیے دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی، لیکن دلّی بہت دور تھی۔

وہ ہر پانچ دس کوس چلنے کے بعد رُک جاتے۔ حیدر خان کو گھوڑے سے اُتارتے، اُسے پانی پلاتے، اُس کے زخموں سے رستے خون کو صاف کرتے۔ حسب ضرورت زخموں کو خشک کرنے والی بکنی چھڑکتے اور پھر سفر شروع ہو جاتا۔ سلیم دونوں کی خدمت دل و جان سے کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

منزل در منزل گزرتے ہوئے کسی طرح وہ لکھنو میں داخل ہو گئے اور وہاں کی مختلف شاہراؤں سے ہوتے ہوئے عزیزن بائی کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔

عزیزن بائی اتفاق سے وہیں پر موجود تھیں اور کانپور جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ حیدر خان اور چنبیلی کو دیکھتے ہی اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا۔ حیدر خان کے علاج کے لیے اُس نے لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم

محمد یعقوب کو اپنے گھر بلا لیا تھا۔

حکیم صاحب نے حیدر خان کے تمام زخموں کو دھویا پھر اُن پر دوائیں لگائیں۔ زخموں کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے کچھ کھانے کے لیے دوائیں دیں اور پابند کیا کہ زخمی کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے۔ پرہیز کی ہدائتیں کیں اور زیادہ سے زیادہ آرام کا مشورہ دیا اور پھر جانے کے لیے اُٹھے تو عزیزن نے اُن کے جیب میں خدا جانے کتنی اشرفیوں کا توڑا رکھ دیا اور سلیم کو تاکید کی کہ حکیم صاحب کو اُن کے مطب تک پہنچا آئے۔ سلیم حکیم صاحب کے ساتھ اُن کے مطب کی طرف روانہ ہوا۔

حیدر خان کو ایک ہوادار کمرے میں لٹا دیا گیا تھا۔ چنبیلی اُس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا۔ چنبیلی اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھیں۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے حیدر خان کے چہرے پر ٹپک پڑے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، چنبیلی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے اب بھی آنسوں بہہ رہے تھے۔ اُس نے اپنے زخمی ہاتھ کو بلند کیا اور اُس کے آنسوں پوچھنے لگا۔ چنبیلی نے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اُس کے آنسوؤں کی رفتار اور بڑھ گئی۔ حیدر خان کا سینہ بھی بھر آیا لیکن پھر بھی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور وہ آنکھوں سے اُسے رونے سے منع کر رہا تھا لیکن چنبیلی کے آنسوں رُکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اچانک نسترن داخل ہوئی۔ اُس نے دونوں کی کیفیت کو بھانپ لیا اور پھر چنبیلی کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اُس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگی، ''بجو! حیدر بھائی بالکل اچھے ہو جائیں گے۔ آپ دیکھنا وہ پھر سے میدان جنگ کا رُخ کریں گے۔''

چنبیلی نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا تو نسترن نے اُسے لپٹا لیا۔ حیدر خان دونوں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ نسترن اُس سے مخاطب ہوئی، ''میں نے ٹھیک کہا نا حیدر بھائی۔''

حیدر خان نے اقرار میں آنکھوں کو جنبش دی اور آنکھوں ہی سے نسترن کو اشارہ کیا کہ وہ اُسے یہاں سے لے جائے۔ وہ سمجھ گئی اور اُس نے فوراً کہا،''بجو میں تو یہ بھول ہی گئی تھی، آپا آپ کو بلاتی ہیں۔''

چنبیلی نے مجبور نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں بجو، حیدر بھائی پہلے کے مقابلے میں اب بہت بہتر ہیں۔ حکیم صاحب کی دوائی میں بڑی شفاء ہے۔''

''اللہ انھیں بھی شِفاء دے۔'' چنبیلی کی زبان سے نکلا۔

''بجو آپ کو یاد ہوگا۔ جب آپ آئیں تھی تو آپا کس قدر زخمی تھیں اور اب انھیں دیکھو، کانپور کی جنگ میں شرکت کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔''

چنبیلی نے اُس کی طرف دیکھا۔

''دو تین دن ہی میں بہت فرق ہو جائے گا اور زخم سوکھ جائیں گے۔''

چنبیلی نے مسکرا کر حیدر خان کی طرف دیکھا، وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

''چلیے نا بجو آپا انتظار کر رہی ہیں۔''

چنبیلی نے حیدر خان کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''حیدر بھائی کی فکر نہ کریں ہم یہاں بوا کو بھیج دیں گے، یا میں چلی آؤں گی، اُٹھیے نا۔''

چنبیلی اُٹھی اور اُس نے حیدر خان پر نظریں ڈالیں۔ اُس نے بھی آنکھوں کے اشارہ سے اُسے جانے کے لیے کہا اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

حیدر خان نے آنکھیں موند لیں۔ اُس کی تکلیف بڑی حد تک کم ہو گئی تھی اور اُسے یہاں بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی آنکھوں میں نیند کے جالے بننا شروع ہو گئے اور کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

چنبیلی نسترن کے ساتھ عزیزن بائی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ صاف ستھرے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی نسترن نے کہنا شروع کیا،'' آپا آپ

انھیں سنبھالیں ، یہ روتی ہوئی بیٹھی تھیں ۔ خود بھی گھبراتی ہیں اور حیدر بھائی کو بھی پریشان کرتی ہیں ۔''

عزیزن نے اُسے اپنے سینے سے لگالیا اور چنبیلی کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا ۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگیں ۔ عزیزن خاموش اُس کی پیٹھ سہلاتی رہی ۔ اُس نے اُسے رونے سے روکا نہیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ایک بار اگر دل کا غبار ڈھل جائے تو اُسے بھی قرار آ جائے گا ۔

رفتہ رفتہ خود ہی چنبیلی کا رونا کم ہوتا گیا اور وہ اُس کے سینے سے علحدہ ہوئی تو عزیزن نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی، '' آپا وہ انسان نہیں ہیں فرشتہ ہیں ۔''

''یقیناً ۔'' عزیزن نے اُس کی تائید کی ۔

''ہم ناچنے گانے والیوں سے کبھی کوئی گھر بساتا ہے ۔؟ اور اگر بسایا بھی تو وہ عزت کبھی نہیں ملتی ۔ آپا جب اُنھوں نے مجھ سے بیاہ کیا اور مجھے اپنے گھر لے کر گئے تو وہ سارے زیورات جو اُن کی اماں مرحومہ نے اپنی بہو کے لیے اُٹھا رکھے تھے وہ سب میری جھولی میں ڈال دیا ۔ مجھ سے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی ، اُلٹا میں جو بھی کہوں وہی کرتے رہے ۔ میرا ہر طرح خیال رکھا ۔'' اُس کی آنکھیں پھر ایک بار بھیگنے لگیں اور اُس کی توجہ ہٹانے کے لیے عزیزن نے اُس سے پوچھا، '' مگر چنبیلی یہ بتاؤ آخر وہ اتنا زخمی کیسے ہو گیا ''

'' آپا ۔'' چنبیلی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا، '' وہ خاندانی رئیس زادے ہیں ۔ والد دلّی میں داروغہ تھے اور وہ خود بھی کبھی انگریزوں کی فوج میں بڑے افسر تھے ۔ تربیت یافتہ فوجی ہیں ۔ تلوار ، بندوق ، نیزہ غرض سارے ہی ہتیار چلانا خوب جانتے ہیں ۔ مجھے بھی اُنھوں نے ہی سب کچھ سکھایا ہے ۔'' وہ ایک لمحہ چپ ہوگئی ، عزیزن اور نسترن کی جانب دیکھا تو عزیزن نے کہا، '' کہتی جاؤ ہم ہمہ تن گوش ہیں ۔''

'' آپا ۔ ۔ جنرل ہیولاک کانپور سے لکھنؤ کی طرف ایک بڑی فوج کے ساتھ نکلا تھا ۔ مجاہدین نے طئے کیا کہ اُسے لکھنؤ نہیں پہنچنے دیں گے ۔ اُسے راستے میں جگہ جگہ

اُلجھائیں گے۔ مورچے بنائیں گے اور اُسے تنگ کریں گے۔ اُس کے ساتھ مجاہدین نے ایسی قوت اور دانائی سے جگہ جگہ مقابلہ کیا کہ ہیولاک کا لشکر مسلسل جانی اور اسلحہ کا نقصان اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آ گیا۔ اُناؤ کے مقام پر ہم نے اُس سے ایسی جنگ لڑی کہ اُس کی فوج کے چھکے چھڑا دیے۔ اُس نے جب ساری بستی کو آگ لگا دیا تو مجاہدین نے وہاں سے نکل کر بُورھیا (burihiya) کے مقام پر اُسے گھیرنے کا منصوبہ تیار کیا، چنانچہ ہم بھی بُورھیا پہنچ گئے۔ یہاں آمنے سامنے دوبدو جنگ ہونے والی تھی۔ مجاہدین نے کمال ہوشیاری کے ساتھ انگریزوں کے لشکر کا ایک حصہ دلدل میں پھنسا دیا اور اُن پر توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ہمارا گھوڑ سوار دستہ نہایت بے جگری سے لڑتا ہوا انگریزی سپاہ کو پیچھے دھکیل رہا تھا، آپا بس یہیں پر مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

وہ خاموش ہوگئی۔

عزیزن اور نسترن اُس کے طرف دیکھ رہے تھے۔

چنبیلی کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسی حالت میں کہنا شروع کیا: ''ان کی عادت ہے کہ وہ بے تحاشہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے دشمن کے لشکر میں گھس جاتے ہیں اور ان کی تلوار چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ ایسے وقت میں میں اُن کے عقب میں بندوق تھامے رہتی ہوں اور جہاں بھی دشمن ان کو گھیرتے ہیں میں اُن پر گولیاں داغتی ہوں اور اُن کے لیے آگے کا راستہ صاف کرتی ہوں، لیکن اس بار میں کچھ پیچھے رہ گئی تھی اور وہ دشمن کی صفوں میں داخل ہو گئے تھے۔۔!''

چنبیلی نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور آسمان میں اُس کی نظریں جم گئیں۔ جنگ کا پورا میدان اُس کی آنکھوں میں کھل گیا۔

انگریز سپاہ دلدل سے جس قدر نکلنے کی کوشش کرتے اور بھی اندر دھنستے جاتے تھے۔ اُن پر توپیں گولے برسا رہی تھیں اور اُن کے بدن کے ٹکڑے دلدل میں ادھر اُدھر گر رہے تھے۔ دلدل سے باہر جو فوج تھی وہ اُنھیں بچانے اور ہمارے توپ

خانے کو ناکارہ کرنے کے لیے آگے بڑھی اور اُن کے حلقے کو توڑنے کی خاطر ہمارا گھوڑ سوار دستہ آگے بڑھا۔ اُن میں حیدر خان بھی اگلی صف میں شامل تھے۔ وہ اور اُن کے ساتھی بہت تیزی سے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے ہی تھی لیکن بدقسمتی سے میرے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور میں اُچھل کر نیچے گر پڑی۔ گھوڑے کو قابو میں کر کے اُس پر سوار ہونے میں کچھ وقت تو لگا۔ میں نے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور دیکھا، دور وہ دیوانہ وار تلوار چلا رہے تھے۔ دشمن اُچھل اُچھل کر اُن پر حملے کر رہے تھے اور میں اُن کا نشانہ نہیں لے پا رہی تھی۔ وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔ میں چیخ رہی تھی اور پھر میری بندوق سے اندھا دھند گولیاں برسنے لگیں۔ اچانک حیدر خان کی تلوار کا اوپری حصّہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔ سلیم اُن کے قریب ہی تھا اُس نے نیزہ سنبھالا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر وہ حیدر خان کی جانب بڑھا، لیکن اتنی دیر میں اُن پر مسلسل وار شروع ہو چکے تھے اور وہ اُسی ٹوٹی ہوئی تلوار سے اپنا دفاع کر رہے تھے۔ میں بجلی کی طرح پہنچی اور اُن فوجیوں پر گولیاں برسانے لگی، سلیم کا نیزہ بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ حیدر خان زخموں سے چور ہو چکے تھے اور بس گرنے ہی والے تھے کہ میرا گھوڑا اُن کے قریب پہنچ گیا اور سلیم نے چھلانگ لگا کر اُنھیں میرے گھوڑے پر اُچھال دیا اور ہم دونوں اُنھیں لے کر اپنے مورچے کی طرف واپس ہوئے۔

چنبیلی کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

عزیزن نے اُسے آہستہ سے تھپتھپایا اور چنبیلی آسمان سے نیچے اُتری اور عزیزن سے لپٹ گئی۔

''ارے اب کیوں روتی ہو۔؟ اب تو تم اپنی آپا کے پاس پہنچ گئی ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

نسترن پانی لے کر آئی اور کٹورے کو چنبیلی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

کمرے میں پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔

سلیم حکیم صاحب کو اُن کے مطب پہنچا کر لوٹ آیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں کچھ دوائیں تھی۔ چنبیلی فوراً اُس کی طرف بڑھی، اور بڑا اہال میں بیٹھی پن کٹی میں پان کوٹ رہی تھیں۔

جینفر بہت دیر سے اکیلی بیٹھی تھی۔ سنسان جنگل، دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد، جس وقت وہ دونوں اس گھنے جنگل میں داخل ہوئے تھے تو راستے میں ایک گنّے کا کھیت تھا۔ دلبر داد خان نے دو تین گنّے کی موٹی موٹی چھڑیاں توڑ لی تھیں اور اُن کے ٹکڑے کر کے جینفر کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا: ''اوئے فرنگی بلبل! تم ان کو چکھو، واللہ اتنا میٹھا گنّا تم اس سے پہلے کبھی نہ کھائی ہوگی۔؟''

لیکن اُس نے اُس وقت ناک بھوؤں چڑھائی تھی اور اُنھیں ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، لیکن اب خود بخود اُس کے ہاتھوں میں ایک پنگوری آ گئی تھی اور وہ اُسے بڑی محنت سے کھا رہی تھی۔ کھاتے کھاتے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، ''یہ دلبر کبھی واپس آئے گا۔؟ کہتا تھا تم ادھر آرام سے بیٹھو، ہم ابھی آتی۔! اور اب تک نہیں آیا، ابھی کتنا دیر لگائے گا۔؟''

وہ کھڑی ہوگئی اور بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ وہ جھاڑی کی اوٹ سے باہر نکلی اور جیسے ہی نظریں سامنے گیں دور بہت دور گرد و غبار کی ایک لہر آسمان کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا اور اُسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ برٹش لشکر چلا آ رہا تھا۔ اُنھیں دیکھتے ہوئے اُسے عجیب سی مسرت ہو رہی تھی، اور اُس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً بھاگتے ہوئے اُن کے سامنے چلی جائے اور اُن سے کہیں کہ مجھے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں اور پھر وہاں سے لندن جانے کا انتظام کر دیں۔ میرے ماں باپ نہ سہی، میں اپنے دادا دادی کے پاس چلی جاؤں گی۔

لشکر آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا اور اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ اُس کے

جسم پر کپڑے بھی بہت خراب ہو گئے تھے۔ اُس نے پہاڑی کے اوپر سے نیچے دیکھا۔ بس سوا سوا فٹ کی دوری سے فوج گزرے گی۔ وہ اس فاصلے کو دوڑتے ہوئے بھی پار کر سکتی ہے۔ اُسے عجیب سا اطمینان ہونے لگا کہ اُسے اب دُنیا کی کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ بس کچھ ہی دیر میں وہ اپنے لوگوں کے ساتھ ہوگی۔ اُسے عجب سا سرور ہونے لگا تھا، تبھی اچانک اُس کے ذہن میں دلبر داد خان آ گیا اور اُس کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے،

اوئے فرنگی بلبل !

اوئے لالہ کی جان !

اوئے خانم !

اُسے ہنسی آ گئی، ''وہ واپس آئے گا اور ہم کو نہیں پائے گا تو کیا کرے گا۔؟ دیوانوں کی طرح چلائے گا، گھوڑا لے کر اِدھر اُدھر ڈھونڈھے گا لیکن ہم تو فوج کے ساتھ آرام سے جا رہا ہو گا۔ فوجی ہم کو دیکھ کر کتنا خوش ہو گا۔ ہم اُن کو بتائے گا، ہم میرٹھ میں تھا۔ پھر بھی بچ گیا۔ ہم اتنے دنوں تک محفوظ رہا۔ جنگل جنگل بھٹکتا رہا۔ وہ سب ہم سے بہت پیار کرے گا۔ جنرل کے پاس لے کر جائے گا۔ جنرل ہماری اسٹوری سنے گا۔ ہم کو شاباشی دے گا۔ اور پھر ہم کو لندن جانے والا جہاز میں بٹھا دے گا، اور ہم سمندر میں جھولتا ہوا ایک دن اپنی کنٹری میں پہنچ جائے گا۔ کتنا مزہ آئے گا۔

خان کا چہرا پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا اور وہ بڑبڑانے لگی، ''خان ہم تم کو ہمیشہ بولا کہ ہم تم سے کبھی بھی لو (Love) نہیں کر سکتا۔ پھر بھی تم ہمارا بہت خیال رکھا۔ ہم تم کو دوست بنایا بس۔۔ اس سے آگے ہم تم کو سوچ بھی نہیں سکتا۔ آل رائٹ تم ہم کو کوئی تکلیف نہیں دیا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ہم کو ہر طرح سے بے عزت کر چکا ہوتا بٹ یو آر گریٹ، تم ہم کو معاف کر دینا خان ہم تم سے ملے بنا ہی اپنا لوگ کے ساتھ جا رہا ہے۔''

اُس نے پھر ایک بار سامنے دیکھا۔ گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی فوج گھوڑوں پر

سوار قریب اور قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی، ''کم آن مائی فرینڈز ۔۔ ہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ , I LOVE ALL OF YOU

AFTER ALL WE ARE ONE NATION

گھوڑے بہت تیز دوڑ رہے تھے۔

''اوہ مسیح تم ہم پر کتنا مہربان ہے۔آخر تم اپنے فادر کو ہماری دُکھ بھری کہانی سنا دیا، اور اُس نے ہماری مدد کے واسطے برٹش آرمی کو ادھر بھیج دیا۔''

وہ خوشی سے ناچنے لگی اور اُس کے دماغ میں کوئی شوخ انگریزی دُھن بجنے لگی۔وہ ناچتے ناچتے گانے بھی لگی،

گہرے گہرے نیلے پانی میں

سمندر کی گود میں

کشتیاں ڈول رہی ہیں

اور ساحل پر کھڑی کوئی محبوبہ

اپنے محبوب کی راہ تک رہی ہے

اُس کی آنکھوں کا انتظار کہہ رہا ہے

اے میرے محبوب جلدی سے آجا

وہ سرور میں لہرائی، آجا میرے محبوب آجا۔۔۔!

اور اُس کے تصور میں پھر دلبر داد خان چلا آیا۔

''اوہ مین تم ہمارے دل میں کیسے آگیا۔۔؟ ہم بولا نا تم ہمارا ڈارلنگ نہیں بن سکتا۔مائی فرینڈ دلبر۔۔گڈ بائے۔۔ابھی ہم جا رہا ہے۔تم ہمارے پیچھے اپنا ٹائم مت برباد کرنا، کسی انڈین گرل سے میرج بنا لینا۔۔''

وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔اُس کے کانوں میں گھوڑوں کے دوڑنے کا شور تھا۔اُس نے پھر سامنے دیکھا، ''آئی لو یو آل۔۔۔اوہ تم کتنا قریب آگیا۔۔؟''

وہ پھر ایک بار جھاڑیوں کے پیچھے گئی اور اپنا اسکارف لے کر آگئی تا کہ اُنھیں

اشارہ کر سکے۔

اُس کے قریب بالکل قریب برٹش آرمی پہنچ رہی تھی۔

وہ بے اختیار نیچے اُترنا چاہتی تھی، لیکن اچانک اُس کے قدم کسی نے پکڑ لیے۔

''اوئے بلبل تم ہم کو چھوڑ کے جاتی ہے۔؟''

''خان ابھی ہم کو روکو مت۔ ہم کو جانے دو۔''

اُس نے پوری قوت کے ساتھ بھاگنا چاہا۔

''اوئے لالہ کی جان، جب تک ہمارا جان باقی ہے، ہم تم پر اپنی جان قربان کرتی رہینگی۔''

''اوہ نو!۔ نو خان۔! دیکھو ہمارا لشکر کتنا قریب آ گیا ہے۔ ہم کو جانے دو۔''

''تم جا سکتا ہے۔ واللہ تم جاؤ۔۔ ہمارا کیا ہم صبر کر لے گی، تم اپنے لوگ میں پہنچ جائے گی ہم خوش ہو جائے گی۔۔ جاؤ لالہ کا جان جاؤ۔۔!''

''ہاں ہم جاتا ہے۔'' اُس کے پاؤں آزاد ہو گئے اور نیچے چند قدم کے فاصلے پر لشکر پہنچنے ہی والا تھا، لیکن اُس کے قدم فوج کی طرف بڑھنے کے بجائے جھاڑیوں کے پیچھے دوڑ گئے۔

اُس کے کانوں میں گھوڑوں کے دوڑنے کا شور تھا۔

وہ اپنا چہرا دونوں ہاتھوں میں چھپائے رو رہی تھی۔

گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں اُس سے آہستہ آہستہ دور بہت دور ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ اُسی طرح بہت دیر تک روتی رہی۔

رفتہ رفتہ سناٹا چھاتا گیا۔

یہاں تک کے پھر وہی ماحول تھا۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ کوئی آدم زاد۔۔

وہ اوندھی لیٹ گئی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب اُس کی آنکھوں کوئی منظر نہ تھا۔

جھاڑیوں پر بیٹھے آزاد گگن کے پرندے اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''اوئے جان دلبر۔۔ دیکھو ہم تمہارے لیے کیا لائی ہے۔۔؟''

اُس نے پلٹ کر دیکھا، اُس کے سامنے دلبر داد خان کھڑا تھا اور اُس کی پیٹھ پر ایک بڑی سی تھیلی جھول رہی تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور اُس سے لپٹ گئی، ''خان تم ہم کو اکیلا چھوڑ کر کبھی مت جانا ابھی ہم۔۔!'' اُس کی زبان سے کچھ نہیں نکلا اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

''اوئے حور شمائل روتی کیوں۔۔ بیٹھو بیٹھو۔ ہم کو آنے میں دیر ہو گئی تو تم پریشان ہو گئی؟'' اُس نے پیٹھ پر سے تھیلی اُتاری، ''اوئے ہماری طرف دیکھو ہم پھر سے ریچھ سے انسان بن گئی۔ چہرا بنا کر آئی، کھانے پینے کا سامان بھی لائی، تمہارے واسطے نیا کپڑا بھی لائی۔''

دونوں بیٹھ گئے اور خان نے اُس کے سامنے مرغ مسلم، کباب، اور بہت ساری تندوری روٹیاں رکھ دیں۔

جینفر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور دونوں کھانا کھانے لگے۔

کھانا کھاتے کھاتے جینفر نے اُس کی طرف دیکھا، ''خان ہم ایک بات سوچا ہے۔''

خان نے مرغ کی ٹانگ پر دانت مارتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

''اگر ہم خان ہوتا تو۔۔؟''

''تو ہم جینفر ہوتی! اور ہمارے دل میں بھی تمہارے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔''

اُس کا لہجہ ایک دم سپاٹ تھا۔

جینفر نے اُس کی طرف غور سے دیکھا تو خان کو احساس ہوا کہ اُس نے جو کچھ بھی کہا وہ ٹھیک نہیں تھا۔

لہذا اُسے خوش کرنے کی خاطر اُس نے کہنا شروع کیا، ''تم خان ہوتی تو ہم

تمہارے پیچھے برقعہ پہن کر بیٹھی رہتی اور تم گھوڑا بھگاتی رہتی۔''

جینفر کو ہنسی آ گئی،''خان تم ہم کو چھوڑ کر گیا تھا، اگر ادھر سے برٹش فوج آ جاتی اور ہم اُن کے ساتھ بھاگ جاتا تو۔؟''

''اگر تم ایسا کرتی تو ہم اکیلی ہی پوری برٹش آرمی سے ٹکر لیتی، یا تو اُن کو ختم کر کے تم کو واپس لاتی یا پھر خود ہی اُدھر ختم ہو جاتی۔''

''خان تم ہم سے اتنا لو کرتا۔؟''اُس نے محبت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

خان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری،'' پر تم کو ابھی تک کہاں سمجھی۔''

جینفر کو پھر ہنسی آ گئی،''تم ہمارے لیے نیا کپڑا لایا؟''

''ہاں۔'' وہ دونوں ہاتھ دھونے لگے۔

پھر خان نے تھیلی میں سے گلابی رنگ کا فراک، شلوار اور دوپٹہ نکالا اور اُس کے سامنے رکھ دیا۔

جینفر کپڑوں کو غور سے دیکھنے لگی۔

''اوہ۔۔ہم سمجھ گئی، یہ ڈریس تم کو پسند نہیں آئی مگر ہم کیا کرتی اُدھر اسکرٹ نہیں تھی مجبوراً یہ لائی، ابھی اس کو پہن لو۔''

جینفر نے کپڑوں کو اُٹھایا اور اُس کے ہاتھوں میں تھما دیا،''یہ کپڑا تم لایا تو تم ہی پہنا دو۔''

''ہم۔۔ہم۔۔۔!'' وہ شرما گیا،''ہم کیسے پہنائے گی۔ خانم تم اُدھر جھاڑی کے پیچھے جا کر خود پہن کر آ جاؤ۔۔جاؤ۔''

جینفر نے اُس کی طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے کپڑوں کو اُتارنے لگی۔ خان نے نظریں نیچی کر لیں۔

''خان۔''اُس نے آواز دی،''کپڑے نہیں پہنائے گا؟''

اُس نے نظریں اوپر کیں تو دیکھتا ہی رہ گیا اور پھر آہستہ سے بولا ذ'' جینی

۔۔عورت کو کپڑا اُس کا شوہر پہناتی ہے۔تم ہمارا عورت تو دور کی بات، ہم تو ابھی تک تمہارا دل میں تھوڑا سا جگہ بھی نہیں بنا سکی۔ہم کیا اپنے ہاتھوں سے تم کو کپڑا پہنائے گی۔''

جینفر نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا،''اوہ ان نو سینٹ مین ۔۔تم کو بھی ابھی تک پتہ نہیں چلا،تم ہمارے دل میں جگہ نہیں بنائی، پورا دل پر قبضہ کر لیا ہے۔''

خان نے اُس کی آنکھوں میں حیرت سے دیکھا اور پھر خوشی سے جھوم اُٹھا۔

اُس کے ذہن میں زور زور سے ڈھول تاشے اور دف بجنے لگی۔

پھر اُس نے اپنے اطراف حلقہ بنا کر تھرکتے ہوئے بہت سارے قدموں کی دھمک سنا،اور جینفر کو پوری قوت سے لپٹا لیا،''اوئے گلبدن! ہم جنگ جیت گئی۔ابھی اس جیت کا جھنڈا ہم لہرائیں گی۔''اور وہ اُسے لے کر زمین پر آ رہا۔کپڑوں کی گلابی رنگت جینفر کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔وہ اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا،'' جینی۔جینی۔۔جینی۔۔!''

جینفر نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا،''اوہ نو۔۔ناٹ جینی۔۔۔محمدی خانم۔''

اور پھر وہ بھی اُس سے لپٹ گئی۔

اور فتح کا جھنڈا زور زور سے لہرانے لگا۔

ہزار ہا دقتوں، مختلف جنگی معرکوں سے گزرتا ہوا، نقصان اُٹھاتا ہوا آخر جنرل ہیولاک اپنے لشکر کے ساتھ رات گئے برھم وارتا میں داخل ہو گیا۔ اُسے پہلے ہی سے اُس کے جاسوسوں نے مطلع کر دیا تھا کہ یہاں نانا صاحب اپنے لشکر کے ساتھ موجود ہے اور اس وقت تا تیا ٹوپے بھی اُن کے ساتھ ہے۔ اُس نے رات ہی کو جنگ کا نقشہ تیار کرنے کے لیے اپنے عہدہ داروں کو طلب کیا۔ ساری ضروری باتیں طئے کیں اور توپوں کے لیے اونچے اونچے چبوترے بنانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اُس نے بالکل انوکھے انداز کی خندقیں تیار کروانا بھی شروع کیا۔ پھر اُس نے گھوڑ سوار دستوں کے حکام کو بُلوایا اور اُنھیں ہدایت کی کہ اس بار گھوڑ سوار دستے فرنٹ لائین میں نہ ہونگے بلکہ توپ خانے کی دونوں جانب کچھ فاصلوں سے تیار رہیں گے اور جیسے ہی توپیں آگ برسانا شروع کریں گی، دونوں طرف سے گھوڑ سوار دستے بھی آگے بڑھیں گے اور نانا صاحب کی فوجوں کو دونوں طرف سے گھیرا ڈالیں گے۔ پیادہ افواج کے کپتانوں سے اُس نے کہا تمہارے بندوق بردار اس بار توپوں کے پیچھے رہیں گے اور جیسے ہی توپیں اپنا کام ختم کر کے خاموش ہونگی اور مقابل کی فوج آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی اُس وقت بندوق بردار توپوں کے سامنے کسی آہنی دیوار کی طرح کھڑی ہو جائیں گے اور گولیوں کی اس قدر برسات کریں گی کہ مقابل کی فوج ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

ابھی پوری طرح صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ہیولاک کا لشکر میدان جنگ میں اُس کے منصوبے کے مطابق تیار کھڑا تھا۔

دوسری طرف نانا صاحب کی فوجیں بھی تیار ہو چکی تھیں۔ نانا صاحب اور تاتیا ٹوپے سفید گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں جھنڈے لیے اپنے لشکر کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے دائیں سے بائیں جانب جا رہے تھے۔ وہ جس ٹکڑی کے سامنے پہنچتے، اُنھیں ہر ہر مہادیو اور نعرۂ تکبیر کی آوازیں سنائی دیتیں۔ فوجوں میں ایک جوش تھا۔ میانوں سے کھینچی ہوئی تلواریں سورج کی اُجلی کرنوں سے اور بھی چمک دار ہو گئیں تھیں۔ بندوق بردار اپنی بندوقوں کی نالیاں سامنے کیے حکم کے منتظر تھے۔ توپوں کے پیچھے کھڑے ہوئے توپچی صرف اشارے کی راہ دیکھ رہے تھے۔

نانا صاحب اور تاتیا ٹوپے گھوڑے دوڑاتے ہوئے میدان کے آخری سرے تک پہنچ گئے۔ پھر وہاں گھوڑ سوار دستے کی قیادت کے لیے تاتیا ٹوپے ٹھہر گئے اور نانا صاحب گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے فوج کے دوسرے گھوڑ سوار دستے کی طرف روانہ ہوئے۔

ہوائیں تیز چلنے لگیں تھیں۔ جھنڈے لہرا رہے تھے اور گھوڑے بے چینی کے عالم میں سموں کو زمین پر مار رہے تھے۔

دور کھڑے ہوئے جنرل ہیولاک نے جھنڈا لہرا کر حملے کا اشارہ کیا اور اُس کی توپوں نے گولے برسانا شروع کیا۔ مجاہدین نے بھی نعرے لگائے اور جوابی حملے کا اشارہ پاتے ہی آگے بڑھنا شروع کیا۔ نانا صاحب کا توپ خانہ بھی حرکت میں آ گیا اور ایک کے بعد ایک گولے اُن کی صفوں پر گرنے لگے۔ برٹش آرمی نے پیچھے ہٹنا شروع کیا یہ دیکھتے ہی پیادہ فوج بنا اشارے ہی کہ آگے نکل آئی اور گولیاں برسانے لگی۔ زبردست رن پڑا۔ دونوں طرف کے گھوڑ سوار دستے اپنے اپنے دشمن کو گھیرنے کے لیے آندھی اور طوفان کی طرح بڑھنے لگے۔ کوئی گھوڑ سوار توپ کی زد میں آ جاتا تو اُس کے پرخچے اُڑ جاتے۔ خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ نانا صاحب اور تاتیا ٹوپے

نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے فوجی دستوں کو جنگ میں اُتار رہے تھے۔ ابھی تک نانا صاحب کی فوج کا دباؤ انگریزوں پر بنا ہوا تھا لیکن اچانک ہیولاک کے گھوڑ سوار دستے نے ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک دم مجاہدین کی پشت پر سخت حملہ کر دیا۔ موت کا رقص شروع ہو گیا تو دوسری طرف تانتیا ٹوپے نے برٹش آرمی کے قلب پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ پھر ایک بار اور پیچھے ہٹنے لگی۔ نانا صاحب نے جب یہ دیکھا کہ ہیولاک کا گھوڑ سوار دستہ عقب سے داخل ہو کر مجاہدین کے لیے موت کا اعلان کر رہا ہے تو وہ اپنی ٹکڑی کو لے کر اُن مجاہدین کی مدد کے لیے نکلے، اور یہی وہ غلطی تھی جس نے مجاہدین کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ نانا صاحب نے جیسے ہی جگہ خالی کی برٹش آرمی کا دوسرا گھوڑ سوار دستہ تیزی سے اُس طرف بڑھا اور پیادہ فوجیوں کو روندتے ہوئے، قتل کرتے ہوئے مجاہدین کے توپ خانے تک پہنچ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے توپوں پر قبضہ کر لیا اور اُن کے رُخ مجاہدین کی طرف پھیر دیا۔ اب مجاہدین پر دوہری مار پڑنے لگی۔ بھگدڑ مچ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ سب کالپی کی طرف روانہ ہو گئے کیونکہ کالپی میں نانا صاحب کی فوج کا ایک بڑا حصہ موجود تھا۔

انگریزوں نے بھاگتے ہوئے مجاہدین کا پیچھا نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے فوراً شہر پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ سرکاری عمارتوں پر پھر سے ایک باراُن کے جھنڈے لہرانے لگے۔ اس فتح نے پٹے ہوئے جنرل ہیولاک کی عزّت کو بحال کر دیا اور اُس کے حوصلے پھر ایک بار بلند ہو گئے۔ اُس کے مزاج میں پھر ایک بار تکبُر پیدا ہو گیا۔

میدانِ جنگ میں لاشیں ہی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ مُردہ گھوڑے، زخمی گھوڑے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ تاحدِ نظر دھواں ہی دھواں تھا۔ دھول تھی گرد تھی بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجاہدین کا توپ خانہ اپنی شکست پر ماتم کر رہا تھا۔ قندقیں منہ چڑھا رہی تھیں بھشتی، بہادر عورتیں اور بچے کاندھوں پر مشکیں اُٹھائے زخمیوں کو پانی پلا رہے تھے اور کچھ انگریز سپاہ ہاتھوں میں سنگینیں اُٹھائے زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔

اس فتح کے بعد جنرل ہیولاک نے اپنی بچی ہوئی فوج کا جائزہ لیا۔ جو جنگ لڑتے لڑتے گھٹ گئی تھی۔ اُس نے فوراً تازہ کمک کے لیے کلکتہ ریسیڈنسی کو مطلع کر دیا کیونکہ وہ اب کالپی کو بھی فتح کر لینے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس فتح کے ساتھ ہی انگریزوں کو ستی چورا گھاٹ کا وہ سانحہ بھی یاد آ گیا جب مجاہدین نے دریائی راستے سے جانے والی کشتیوں پر توپوں سے حملہ کر کے بے شمار انگریز مرد وخواتین اور بچوں کو لقمہء اجل بنا دیا تھا۔ اُن کے دماغوں میں بدلے کا بگل بجا اور اس کے بعد کانپور کو اُجاڑ دیا گیا ہزار ہا افراد قتل کر دیے گئے۔ عورتوں اور بچوں پر وہ ظلم ڈھائے گئے جس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ انگریز افواج سے جو بھی ممکن ہوسکتا تھا اُنھوں نے وہ سب کچھ کیا۔ ایک طرف تو وہ اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے تو دوسری طرف اپنی فتح کو داغدار کر رہے تھے۔

چنبیلی کی دن رات کی خدمت رنگ دکھانے لگی تھی اور حیدر خان کے زخم بھرنے لگے تھے۔ حکیم محمد یعقوب پابندی سے آتے، زخموں کو صاف کرتے، اُن پر دوائیاں لگاتے، پٹیاں بدلتے، حیدر خان کے حوصلوں کو بڑھاتے، اور چنبیلی کی تیمارداری کی تعریفیں کرتے یہی روز کا معمول بن گیا تھا۔

حیدر خان اپنے بستر پر ٹیک لگائے پیر لمبے کیے بیٹھا تھا اور چنبیلی اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا رہی تھی۔ حیدر خان نے اُس کی طرف دیکھا، چنبیلی کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ رات رات بھر جاگنے سے آنکھیں سوج گئیں تھیں۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس کے بدن پر کپڑے بھی میلے میلے سے تھے۔ اُس کی شوخی شرارت سب کچھ ختم ہوگئی تھی۔ اُسے جب یہ احساس ہوا کہ حیدر خان اُسے مسلسل دیکھے جا رہا ہے تو وہ جھینپ سی گئی اور آہستہ سے کہا، ''اس طرح کیا دیکھ رہے ہو خان۔؟''

حیدر خان نے آنکھوں سے جواب دیا۔۔کچھ نہیں، اور پھر پانی کی طرف

ہاتھ بڑھانے لگا تو چنبیلی نے فوراً پانی کا کٹورہ اُس کے لبوں سے لگا دیا۔

پانی پی کر خان نے پھر ایک بار اُس کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ اُس کے دل و دماغ میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی اور اُس کی چغلی اُس کا چہرا کھا رہا تھا۔ چنبیلی پریشان ہوگئی اور اُس نے نہایت محبت سے اُسے آواز دی، ''خان۔''

خان نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں کے کناروں میں آنسوں جم سے گئے تھے لیکن لب خاموش تھے اور چہرہ اندرونی طوفان کی عکاسی کر رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو خان۔؟''

حیدر خان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، اُس کی طرف غور سے دیکھا، اور پھر کہنے لگا، ''چنبیلی تمہاری زندگی کو اپنے سکھ کی خاطر میں نے تباہ کر دیا ہے تم۔۔ تم کیا ہوگئیں، کبھی آئینہ بھی دیکھ لیں۔ تمہارے چہرے پر میری خود غرضی کے نشان دکھائی دیں گے۔ تم۔۔!''

چنبیلی نے اُس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، ''آپ ایسا نہ کہیں خان۔۔ آپ نے چنبیلی کو کیا کچھ دیا ہے، اس کا تو آپ کو بھی اندازہ نہیں ہے آپ نے چنبیلی کو سر اُٹھا کر جینے کا وقار بخشا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ چنبیلی کیا تھی؟ ناچنے گانے والی ایک طوائف! جس سے دل تو سبھی بہلا سکتے تھے لیکن اُس سے اپنا گھر آباد کرنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ بھی چاہتے تو مجھے اُن بدمعاش فرنگیوں سے بچانے کے بعد کوٹھے پر پہنچا دیتے، لیکن آپ نے وہ نہیں کیا۔ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا، میری پچھلی زندگی کے کسی ورق کو کبھی اُلٹنے کی کوشش نہیں کی اور ایک طوائف کو اپنا نام دے کر آپ نے دنیا کی نظروں میں اُسے عزّت دار بنا دیا۔ خان آپ جیسے نیک، بہادر خاندانی انسان کو پا کر چنبیلی تو تاریخ کی ملکاؤں سے بھی زیادہ خوش قسمت ہوئی گئی۔ اور آپ۔ آپ۔۔!''

حیدر خان نے اپنا زخمی ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

دونوں خاموش ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

دونوں کی آنکھوں سے بس آنسوں ٹپک رہے تھے اور دونوں کی گرفت ایک دوسرے کے ہاتھ پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

''بجو۔۔!'' دور سے آتی ہوئی نسترن کی آواز دونوں کے کانوں تک پہنچی، '' آپا ناشتے پر انتظار کر رہی ہیں۔'' نسترن کمرے میں داخل ہوئی۔

''نسترن میں ابھی ناشتہ نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟''

''مجھے کھانے کی کوئی خواہش نہیں ہو رہی ہے۔''

''بجو۔۔کھانا کوئی بھی خواہش سے نہیں کھاتا۔۔ضرورت۔۔!'' اُس نے بات ادھوری چھوڑی اور دونوں کا جائزہ لینے لگی۔ دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''بجو آپ نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔'' وہ پھر حیدر خان سے مخاطب ہوئی، ''حیدر بھائی۔۔ نہ نہ نہ۔۔آج سے تو ہم آپ کو دولہا بھائی بُلائیں گے۔ دیکھئے نہ دولہا بھائی بجو نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔'' وہ اٹھلانے لگی۔

دونوں کے چہرے پر ہنسی دوڑ گئی، ''میری اچھی بہن آپ ناشتہ کرلیں، تمہارے دولہا بھائی کو ابھی میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی ہوں۔''

''ہائے اللہ۔۔ یہ دونوں تو لیلیٰ مجنوں کو بھی شرمندہ کر رہے ہیں۔'' وہ دیدے نچانے لگی۔

حیدر خان نے چنبیلی کو اشارہ کیا کے وہ ناشتہ کر لے۔

چنبیلی نے انکار میں گردن ہلائی۔

''اللہ نظر بد سے بچائے آپ دونوں کی محبت کو۔'' اُس نے جھٹ سے دونوں کی بلائیاں لیں اور اپنی کنپٹیوں پر چٹ چٹ انگلیاں توڑیں اور اتراتے ہوئے کہنے لگیں، ''کیا کروں اللہ پیا واجد علی شاہ بھی یہاں سے چلے گئے۔ ورنہ میں اُن کے دربار جاتی اور آپ دونوں کی داستانِ عشق سناتی اور پھر پیا اُس پر ناٹک لکھتے،

داستان در عشق حیدر خان و چنبیلی خانم ۔۔''

چنبیلی کو پھر ہنسی آ گئی ۔

''مگر بجو ۔۔ اس داستان سے مجھے خوب شہرت ملتی اور ہو سکتا تھا کہ میں اُن کے محل میں پہنچ جاتی ۔''

''وہ کیسے؟'' چنبیلی نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا اور حیدر خان بھی متوجہ ہوا۔

''بجو ۔۔ اس ناٹک میں میں جو چنبیلی کا کردار نبھاتی اور واجد علی شاہ بنتے حیدر خان ۔''

بہت دنوں کے بعد دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ورنہ یہ دونوں تو ہنسنا ہی بھول گئے تھے ۔''

''بہت باتیں بنانے لگی ہو ۔'' حیدر خان نے ہنستے ہنستے کہا۔

''اجی دولہا بھائی آپ ذرا صحت یاب ہو جائیں، پھر دیکھیے میں کیا کیا کرتی ہوں ۔''

''تم بہت مزے مزے کی باتیں کرتی ہو میری چھوٹی بہنیا ۔''

''تو پھر چلیے نہ بجو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور آپا انتظار کر رہی ہیں ۔''

چنبیلی نے حیدر خان کی طرف دیکھا، اور اُس نے پھر ایک بار آنکھوں سے جانے کا اشارہ کیا۔

اور دونوں ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں ۔

کان پور کی فتح کے بعد انگریز افواج نے صرف قتل عام ہی نہیں کیا تھا بلکہ بے شمار شہریوں کو گرفتار بھی کر لیا تھا ۔ جن پر برائے نام مقدمے قائم ہوئے اور انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ انگریزوں کے جاسوس پل پل کی خبریں اُن تک پہنچا رہے تھے ایسا ہی ایک جاسوس داخل ہوا ہیولاک نے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو

اُس نے اُس کے اطراف کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔

"اوہ۔۔تم ہمارے ساتھ اس طرف اندر چلو۔"

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا اور اُس کے کان جاسوس کی آواز سن رہے تھے، "جنرل، نانا صاحب کان پور سے بٹور، اور بٹور سے فتح گڑھ بھاگ گیا ہے لیکن بُری خبر یہ ہے کہ تاتیا ٹوپے ایک بڑے لشکر کے ساتھ کان پور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمیں اپنی فوج کو الرٹ کرنا مانگتا۔"

اور ہیولاک نے فوراً اپنے مشیروں کو طلب کیا۔

مغل دربار آراستہ تھا۔ بادشاہ سلامت رونق افروز تھے۔ تمام شہزادے، عمائدین شہر، سرداران، مختلف عہدہ داران، جن میں سپہ سالار اعظم، وزیر سلطنت، بخشی فوج، میر آتش، معززین دربار سب حسبِ مراتب موجود تھے۔ بادشاہ سلامت نے میرِ عرض کی طرف دیکھا گویا دربار کی کاروائی کے آغاز کا حکم دیا۔ میرِ عرض اپنی جگہ سے اُٹھے، شاہی آداب بجالائے اور با آواز بلند کہا، "حضور کا اقبال بلند رہے! جونا پور سے فوجیوں کی پانچ کمپنیاں پورے جنگی ساز و سامان سے لدی ہوئیں دلّی میں داخل ہو چکی ہیں اور لشکرِ شاہی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اس کے علاوہ، سالار احمد خان پہاڑی انگریز افواج سے نکل کر اپنے گھوڑ سوار دستے کے ساتھ شاملِ شاہی لشکر ہو چکے ہیں۔ بنارس اور الہ آباد سے خبریں آئی ہیں کہ وہاں بھی مجاہدین سرگرم عمل ہیں اور انگریز کرنل نیل کے لیے وبال جان بن گئے ہیں۔ متھرا کی بھی خبریں ہیں کہ اُن کا رسالہ بھی لشکر شاہی میں ضم ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پانچ لاکھ کا خزانہ لے کر آیا ہے جس کی مدد سے فوجیوں کی تنخواہیں ادا کردی گئیں ہیں۔" میرِ عرض خاموش ہو گئے اور شاہی آداب بجالائے۔

بادشاہ نے سب کی جانب مسکرا کر دیکھا، "ہم ان تمام مجاہدین کا استقبال کرتے ہیں اور اُن کی خاندان مغلیہ سے وفاداری و جذبہ حب الوطنی کی قدر کرتے ہیں

اور اللہ تبارک تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اُنھیں عظیم الشان فتح سے سرفراز فرمائے۔آمین۔''

تمام درباریوں نے با آواز بلند کہا،'' آمین۔ثم آمین۔''

میر عرض پھر کھڑے ہوئے ،شاہی آداب بجالائے اور پھر گویا ہوئے ،'' حضور ظلِ الٰہی آپ کا عظیم الشان لشکر جہاں انگریز اقتدار کو نیست و نابود کرنے میں لگا ہوا ہے وہیں کچھ غدارِ وطن بھی ہیں۔اُن میں سے ایک رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اُسے حضور کے روبرو پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔''

بادشاہ کے چہرے پر جلال نمودار ہوا،'' غدارِ ملک وملت کو پیش کیا جائے۔''

میر عرض نے با آوازِ بلند اعلان کیا،'' غدار حکیم احسن اللہ خان کو پیش کیا جائے۔''

پورے دربار پر سناٹا چھا گیا۔سارے ہی لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے،اور حضور کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔حکیم احسن اللہ خان پا بہ زنجیر پیش کیا گیا۔

'' حکیم احسن اللہ خان! کم بخت تجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔'' حضور کی آواز پورے دربار میں گونجی اور احسن اللہ خان گڑ گڑانے لگا،'' حضور مجھ غریب پر رحم کیا جائے۔میں غدار نہیں ہوں۔میں حضور کا نمک خوار ہوں۔وفادار ہوں،مجھ پر یہ سراسر الزام ہے۔بہتان ہے۔'' وہ رونے لگا۔

بادشاہ نے اُس کی گریہ زاری کو نظر انداز کرتے ہوئے حکم دیا،'' فردِ جرم پیش ہو۔''

میر عرض نے کہنا شروع کیا،'' حضور عالم پناہ! آپ کے حضور اپنی بے گناہی کی رٹ لگانے والا یہ احسان فراموش جو اپنے آپ کو وفادار کہتا ہے،دراصل یہ شخص انگریزوں کے ہاتھوں بک چکا ہے۔یہ اُن کا مخبر ہے۔انگریزوں سے خفیہ خط وکتابت کرتا ہے۔''

بادشاہ نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا اور وہ پھر گڑگڑانے لگا، ''حضور ظلِ الٰہی یہ جھوٹ ہے۔ یہ غلط ہے۔ ان لوگوں نے مجھے پھانسا ہے۔ میرا گھر لوٹ لیا اور مجھے مجرم بنا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا۔''

''خاموش۔'' بادشاہ کی رعب دار آواز اُبھری، ''اطمینان رکھ، اگر تو بے گناہ ثابت ہوگیا تو کوئی سزا نہ ہوگی لیکن جرم ثابت ہوگیا تو تیرے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔ مابدولت اس کے جرم کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔''

میر عرض نے تفصیل سنانا شروع کی، ''حضور عالم پناہ چوڑی والان کے محلے ثمرو بیگم کی حویلی میں موجود بارود کے کارخانے میں آگ اسی شخص نے لگائی تھی۔ اُس کے اس جرم کے ثبوت مل چکے ہیں۔ اس شخص کی غداری کے باعث کارخانے میں کام کرنے والے سات سوٗ افراد لقمۂ اجل ہو گئے۔ اسی شخص نے بادلی سرائے میں نصب کی گئی توپوں میں بھوسہ بھرنے کی سازش کی تھی۔ اس نے توپوں میں میخیں ٹھونک دی تھیں۔ اس کے علاوہ گذشتہ دنوں انگریز افواج کا کشمیری دروازے پر اچانک حملہ اور پھر بند دروازے کا کھل جانا، یہ سب اسی کی کارستانی ہے۔ یہ اب تک اپنے جرم کی جھوٹی صفائی اور مقربِ خاص ہونے کی رعایت سے فائدہ اُٹھاتا رہا ہے۔ لیکن کل ہی جاسوسوں نے اس کا لکھا خط بھی ضبط کیا ہے۔''

''لیکن حضور اُس خط پر میرے دستخط نہیں ہیں۔''

''غدار۔۔!'' بادشاہ سلامت نے اُس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا، ''تیرا یہ اعتراف خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خط تو نے ہی لکھا۔ مابدولت ان سارے جرائم کی پاداش میں تجھے سزائے۔۔۔!''

''حضور گستاخی معاف!'' مرزا الٰہی بخش اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا، ''حکیم احسن اللہ خان خاندان مغلیہ کے پُرانے نمک خوار ہیں۔ میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں مزید تحقیقات ضروری ہیں اور تب تک انھیں سزائے موت کے بجائے حراست میں لے لیا جائے۔''

مرزا مغل نے بخت خان کی جانب لاچاری سے دیکھا اور بخت خان اپنا غصہ پی کر رہ گیا اور بادشاہ سلامت نے حکم صادر فرمایا، ''حکیم احسن اللہ خان کو حراست میں لے لیا جائے اور مکمل تحقیقات مابدولت کے حضور پیش کی جائیں۔۔ دربار برخاست۔''

بادشاہ سلامت تخت سے نیچے اُترے اور حجرۂ خاص کی طرف روانہ ہو گئے۔

حیدر خان کے زخم تقریباً اچھے ہو گئے تھے۔اب اُس کا کمرہ ہمیشہ بھرا رہتا، محفلیں جمتیں، چھیڑ چھاڑ ہوتی، قہقہے پھوٹتے، جملے بازی ہوتی، ایک دوسرے کو نشانہ بنایا جاتا، کبھی کبھی ان محفلوں میں عزیزن بھی شریک ہو جاتیں اور اپنی باتوں سے محفل کو گلزار کر دیتیں اور کبھی حدادب محفل کو سنجیدہ کر دیتا۔

ان محفلوں کی جان تھی نسترن۔ایک تو وہ عمر میں سب سے چھوٹی تھی اوپر سے نہایت تیز وطرار، کب کس سے کیا سوال کر بیٹھے گی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

آج بھی وہ حیدر خان کے سر پر سوار تھی اور اُسے مسلسل تنگ کر رہی تھی کہ اچانک اُسے چنبیلی نے حکم دیا،'' اچھی بہنا ذرا پانی تو پلائیں۔''

اُس نے دیکھا پانی کی صراحی چنبیلی کے قریب ہی رکھی ہوئی ہے۔وہ اُٹھی کٹورے میں پانی لیا اور اُسے چنبیلی کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہنے لگیں،'' بجو۔۔صراحی تو آپ ہی کے بغل میں تھی۔پھر بھی۔۔!''

''ارے میری اچھی بہن !تمہارے ہاتھوں پانی جو میٹھا ہو جاتا ہے۔''

''بجو! سارے بچپن سے آپ ہمیں بے وقوف بناتی رہی ہیں اور اپنا کام کرواتی رہی ہیں،اور اب بھی۔۔!''

چنبیلی کو ہنسی آ گئی تو وہ حیدر خان کی طرف پلٹی،'' دولہا بھائی ہمارے ایک سوال کا جواب دیں،آخر آپ نے ہماری بجو میں کیا دیکھا تھا جو اُن سے بیاہ کر لیا؟ ''

حیدر خان نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا،''یعنی بیاہ سے پہلے ہمیں یہ

دیکھنا بھی ضروری تھا۔؟''

''لو۔'' اُس نے دیدے مٹکائے، ''انھیں تو یہ بھی پتہ نہیں ہے۔؟''

''ہاں یہ غلطی تو ہوئی گئی ہم سے۔'' اُس نے چنبیلی کی طرف دیکھا، ''نسترن ہم نے تو بس ان کی صورت ہی دیکھی تھی۔''

چنبیلی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بوڑھی دادی اب اس کا کچھ علاج ہوسکتا ہے؟'' اُس نے نسترن کی جانب دیکھا۔

''اب کیا علاج ہوسکتا ہے۔؟ اب تو انھیں آپ کو ساری زندگی بھگتنا ہے دولہا بھائی۔''

چنبیلی نے اُس کی پیٹھ پر بناوٹی غصّے سے ہاتھ مارا۔

اور سب کے لبوں سے قہقہے بلند ہوئے۔

''بجو کیا اسی طرح آپ دولہا بھائی کی بھی پٹائی کرتی رہتی ہیں ؟'' نسترن نے پلٹ کر چنبیلی کی طرف دیکھا۔

''یہ بات تو آپ مجھ سے دریافت کریں نسترن۔'' حیدر خان نے چنبیلی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

''میں نے کبھی کی ہے ایسی غلطی۔؟''

'' بجو! غلطی کبھی غلطی کرنے والے کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا، ''میں نے خود بیچارے دولہا بھائی کی پیٹھ پر آپ کی اُنگلیوں کے نشان دیکھے ہیں۔''

''اب تم میرے ہاتھوں پٹوگی۔'' چنبیلی اُس پر جھپٹی، اور وہ تیزی سے پلنگ کے آخری حصّے پر پہنچ گئی اور وہاں سے کہنے لگی، ''دولہا بھائی اب آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی، ظلم ثابت ہوگیا ہے۔''

پھر سب ہنسنے لگے۔

''بجواب ہم آپ سے ایک سوال پوچھتے ہیں۔''نسترن نے شوخ نظروں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔

''اُلٹا سیدھا سوال کروگی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔''

''آپ کیا فرنگی ہوگئی ہیں جو ہمیشہ چابک اپنے ساتھ ہی رکھتی ہیں۔''

''نسترن آپ سوال پوچھیں ہم ہیں نا آپ کے طرفدار۔'' حیدر خان نے اُسے بڑھاوہ دیا۔

''بجو! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، اگر کسی نے آبرو بچائی تو کیا اُس سے بیاہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے؟''

چنبیلی نے پھر اُس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''اور پھر بجو! بیاہ کے بعد تو وہ بھی وہی کرتا ہے جو غنڈے کرنے والے ہوتے ہیں۔''

''بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہیں۔ٹھہرآپا سے کہتی ہوں۔''

''لو۔۔؟ آپا بیچاری اگر یہ بات نہ پوچھیں تو کیا آپا کی لاڈلی بھی یہ سوال نہیں پوچھ سکتی؟ بجو مجھے دونوں میں فرق بتایئے۔''

چنبیلی شرم سے دوہری ہوئی جارہی تھی۔اُسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

''چلیئے ہم ہی بتادیتے ہیں۔''نسترن نے بوڑھی عورتوں کے انداز میں کہنا شروع کیا،''بجو ایک زبردستی چاہتا ہے جبکہ دوسرا راضی مرضی سے۔لیکن بات تو۔۔!''

''اب بہت مار کھائے گی۔چُپ ہوجاؤ۔حد سے بڑھنے لگی ہیں۔''

حیدر خان کو ہنسی آ گئی،''چنبیلی کچھ بھی کہیں۔۔نسترن کی بات میں دم ہے۔'' پھر وہ نسترن سے مخاطب ہوا،''بہنا تمھیں تو ڈکیلی خوب سجے گی۔''

''ارے دولہا بھائی، میں کچھ نہیں کرسکتی، سوائے باتیں بنانے کے، بچپن سے ایک سے ایک اُستاد آئے اور اپنا ماتھا زمین پر ٹیک کر چل دیئے کہ آپا ہمیں تو معاف کردیں، یہ چھوکریا نہ ناچ سیکھ سکتی ہے نا غزل گائیکی۔''

''پھر؟''

''پھر کیا، میری آپا خود کہہ چکی ہیں کہ اسے کچھ نہ آیا تو نہ آیا کرے۔ اُس کے لیے اُس کی آپا ہی کافی ہے۔''

''ہاں بالکل سچ کہہ رہی ہے نسترن۔'' چنبیلی نے بھی تائید کی، ''آپا نے اس کی ایسی پرورش کی ہے کہ کوئی ماں باپ بھی اتنے لاڈ و پیار سے اپنے بچوں کی پرورش نہیں کر سکتے۔ اس کے ہزار نخرے وہ برداشت کرتیں، اس کی ہر ضد ہمیشہ پوری کرتیں، اس کی کونسی ایسی فرمائش تھی جسے آپا نے پوری نہ کی ہو۔ یہ جب جب بھی بیمار ہوتی، اس کے لیے رات رات جاگی ہیں وہ، اس کی خاطر بڑے بڑے نوابوں رئیسوں کے مجروں سے انکار کیا ہے اُنھوں نے۔ کسی کی مجال نہ تھی جو اسے جھوٹ موٹ ہی آنکھیں دکھائیں۔''

ٹھیک اُسی وقت عزیزن کمرے میں داخل ہوئیں اور سب خاموش ہو گئے۔ انھوں نے سب کی طرف باری باری دیکھا، ''کہیں ہم دخل در معقولات تو ثابت نہیں ہو گئے۔؟''

''ارے نہیں آپا آپ تشریف رکھیں نا۔''

''پھر ہمارے آتے ہی یہ سناٹا کیوں ہو گیا۔؟''

''کچھ نہیں آپا یہ نسترن چٹکیاں لے رہی ہیں۔''

''دیکھا آپا۔۔بجو کے پاس ہمیشہ بس ہماری ہی شکائتیں رہتی ہیں۔

عزیزن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُنھوں نے محبت بھری نظروں سے نسترن کی طرف دیکھا تو نسترن نے چنبیلی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

''ماشااللہ سے زخم بھر گئے ہیں حیدر میاں کے۔'' عزیزن نے حیدر خان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آپا اب ہمیں دلّی جانے کی اجازت دے دیں۔'' حیدر خان کی نظریں نیچے تھیں۔

''کیوں؟''عزیزن نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا ،'' یہاں کوئی تکلیف ہے میاں تمھیں۔؟''

''ارے نہیں آپا۔۔ یہ گھر تو اب میرے لیے ماں کی گود بن گیا ہے۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید میں ابھی تک زندہ بھی نہ رہتا۔''

''چپ رہو میاں۔۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔آپ کو اُس نے لمبی حیات دی ہے۔آپ ہر حال میں اچھے ہو جاتے۔''

''لیکن آپا احسان ماننا بھی تو دین کا حکم ہے۔''

''بلاشبہ۔ !تم نے ہماری چھوٹی بہن کو جو عزّت ،مرتبہ،اور وقار دیا ہے اُس کا بھی تو ہمیں۔۔''

''بس آپا! وہ آخری لفظ آپ کی زبان پر نہ آئے۔ یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اللہ جوڑے آسمان میں طئے کرتا ہے اور اُن کی ملاقات کی سبیل بھی خود ہی کرتا ہے۔''

عزیزن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے نہایت شفیق نظروں سے حیدر خان کی طرف دیکھا،''اب یقین ہو گیا ہے کہ چنبیلی تمہاری غلط تعریفیں نہیں کرتی۔''

اور موقع ملتے ہی چنبیلی نے کچھ کہنے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا حیدر خان نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''حیدر میاں تمھیں پتہ ہے ہماری نسترن بادام کا حلوا نہایت عمدہ بناتی ہے؟''

''آپا سننا اور بات ہے اور کھا کر یقین کرنا یہ دوسری بات ہوتی ہے نا ؟''

''دولہا بھائی آج آپ یہ یقین بھی کر ہی لیں۔'' وہ خوشی خوشی باورچی خانے کی طرف دوڑی۔

عزیزن نے باہر جھانک کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے کہنا شروع کیا،'' حیدر میاں آپ تو جان ہی چکے ہیں کہ یہ گھر ہی کیا اب تو لکھنؤ ہی سے طوائفوں کی

تہذیب کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس لیے میرے پاس جتنی بھی لڑکیاں تھیں۔ میں نے انھیں اچھے ٹھکانوں پر بھیج دیا ہے۔ چونکہ نسترن میری بہت ہی لاڈلی ہے اس لیے اُس کی ذمہ داری میں تمھیں دینا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی ساری جائداد اُس کے نام کر دی ہے۔ اسے تم اپنے ساتھ دلّی لے جائیں اور کسی مناسب جگہ اس کا بیاہ کر دیں۔ خرچ کی پرواہ نہ کریں۔''

حیدر خان خوشی سے پھولے نہ سمایا،'' آپا یہ بات آپ نے کہہ دی ورنہ میں خود آپ سے یہی بات کہنے والا تھا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

''حکم نہیں میاں بلکہ۔۔''

'' آپا۔ آپا۔۔!'' حیدر خان نے عزیزن کی بات کاٹی،'' آپ لفظ خواہش کہیں۔ ہم کل ہی دلّی روانہ ہو جاویں گے۔''

''میاں میں کل نہ جانے دوں گی۔ کل چہار شنبہ ہے۔ تم یک شنبہ کو یہاں سے نکلیں۔''

اتنے میں نسترن بادام کا حلوا پلیٹوں میں سجا کر لے آئی۔

''میری بہنا، اب تو تمھیں بھی ہمارے ساتھ دلّی چلنا ہے۔'' چنبیلی اپنی خوشی دبا نہ سکی۔

نسترن نے کشتی کو تپائی پر رکھتے ہوئے عزیزن کی طرف دیکھا،'' ہمیں۔'' اور عزیزن نے آنکھوں کے اشارے سے چنبیلی کی تائید کی۔

'' آپا میں دلّی نہ جاؤں گی، میں کیوں دلّی جاؤں؟''

''وہاں ہم تمہارے ان گورے گورے ہاتھوں میں مہندی لگائیں گے۔''

چنبیلی نے اُسے لپٹا لیا، لیکن وہ تیر کی طرح اُس کے پاس سے نکلی اور عزیزن سے لپٹ گئی،'' بجو! میری مہندی، میری آپا ہیں۔ میری دلّی بھی، میری آپا ہیں۔ میری ہر خوشی بھی، میری آپا ہیں۔ میں آپا کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔'' وہ رونے لگی۔

''اری روتی کیوں ہے۔'' عزیزن نے اُسے زور سے لپٹا لیا۔

''نسترن میں تمہاری کچھ نہ ہوں۔۔؟'' چنبیلی نے اُس کے سر پر سے ہاتھ پھیرا۔

''بجو۔'' اُس نے اُس کی طرف بنا دیکھے ہی کہنا شروع کیا،''ایسا ہرگز نہیں ہے کہ آپ سے مجھے محبت نہیں ہے۔ میں آپ کو بھی اُتنا ہی چاہتی ہوں۔ بھلا میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ آپ مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھائے سارے محلے کی سیر کرواتی تھیں۔ میرے لیئے نیم کے درخت پر جھولا باندھتی تھیں اور مجھے بٹھا کر کتنے پیار سے ساون کے گیت گاتی تھیں۔ کبھی آپ نے مجھے ڈانٹا نہیں، میں جو بھی کہتی اُس سے آپ کبھی نہ انکار کرتی تھیں، لیکن بجو۔۔ میں آپا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ بالکل نہیں جاؤں گی۔''

عزیزن نے اُسے پھر ایک بار نہایت محبت کے ساتھ لپٹا لیا، اُس کی بھی آنکھیں بھر آئیں وہ اُسے سمجھانے لگیں،''میری لاڈو اب یہاں کیا رہ گیا ہے۔ دیکھو تمہارے دولہا بھائی۔۔''

''آپا۔'' اُس نے زور سے کہا،''دولہا بھائی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں لیکن میں پھر بھی آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتی؟ جبکہ آپ جنگ پر بھی جاتی ہیں، جنگ میں زخم بھی لگتے ہیں، کون دیکھے گا آپ کو میرے بعد۔۔نہیں نہیں۔۔ مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔''

''ہاں آپا۔۔نسترن ٹھیک ہی کہتی ہے۔'' چنبیلی بھی روتے روتے کہنے لگی،'' آپ نے سب کا بندوبست تو کر دیا ہے لیکن کبھی تو اپنے بارے میں بھی تو سوچیں۔؟''

''آپا سوچیں یا نہ سوچیں۔۔! میں بس آپا کے پاس ہی رہوں گی۔''

''ہم بھی آپ کو آپا سے کبھی جدا نہیں کریں گے۔'' حیدر خان نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی،''اب تو اس خوشی میں بادام کا حلوا کھلائیں۔''

نسترن نے آنسوں بھرے چہرے کے ساتھ عزیزن کی طرف دیکھا تو اُس نے بھی کہا،''اچھی بیٹی ہم بھی تمھیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔''

نسترن کے آنسوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ کھل اُٹھی اور پھر سب کے ہاتھوں میں حلوے کی پلیٹیں پہنچنے لگیں۔

کان پور کی شکست نے نانا صاحب کو بددل کر دیا تھا۔ اس لیئے وہ کالپی سے بٹور اور بٹور سے فتح گڑھ پہنچ گئے تھے۔ جبکہ انگریز اس فتح سے بہت خوش تھے کہ اودھ میں مسلسل ہار کے بعد یہ فتح اُن کے حصّے میں آئی تھی۔ اُن کے حوصلے بلند ہو گئے تھے چنانچہ جیسے ہی ہیولاک کو اُس کے جاسوسوں نے خبر دی کہ تاتیا ٹوپے بٹور میں جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے تو وہ فوراً اپنی فوج کے ساتھ بٹور کی جانب نکل پڑا۔ رات کا وقت تھا۔ مشعلیں روشن تھیں اور مشعلوں کی روشنی میں لشکر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

بٹور میں تاتیا ٹوپے نہ صرف اپنی پچھلی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا بلکہ کان پور پر نانا صاحب کے اقتدار کو دوبارہ بحال بھی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے شیوراج پور کے صوبیدار سے ملاقات کی اور اُسے اپنا ہم خیال بھی بنایا، اُس کی فوج کو اپنی فوج میں شامل کیا اور ایک زبردست جنگ کا نقشہ بنانے میں مصروف تھا۔

صبح صبح ہیولاک کے فوجوں کا بینڈ باجا گونجنے لگا۔ عوام میں بے چینی پھیلنے لگی۔ مندر میں گھنٹے اور مسجدوں میں دُعاؤں کے لیے ہاتھ بلند ہونے لگے۔ عورتوں نے گھروں کے دروازوں کو اچھی طرح بند کرنا شروع کیا اور بچوں کو باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی۔ وہ جیالے جو ابھی تک بھی فوج میں شامل نہ ہوئے تھے وہ بھی ہتیار لگائے تاتیا ٹوپے کے پاس پہنچنے لگے۔

ہیولاک نے اپنی فوج کو میدان میں اُتار دیا۔ خیمے نصب ہونے لگے۔ خندقیں کھودی جانے لگی۔ توپوں کو دس دس گز کے فاصلوں سے نصب کیا جانے لگا۔ بارود، گولے، جنگی اسلحہ صحیح مقام پر پہنچا دیئے گئے۔ گھوڑ سوار اور پیادے اپنے اپنے ہتیاروں کا جائزہ لینے لگے۔ عوام پر دہشت پھیلانے کی خاطر خواہ مخواہ ہوائی فائر ہونے لگے، چھوٹی توپیں بھی داغی جانے لگیں۔ گھوڑوں کو بے مقصد دوڑایا جانے لگا۔

غرض ہیولاک ذہنی طور پر اپنی افواج کو تیار اور بٹور کے باشندوں کو خوف زدہ کرنے کی خاطر اپنے تمام حربے استعمال کر رہا تھا۔

دوسری طرف تاتیاٹوپے اپنے سفید براق گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس کے پورے بدن کو زرہ بکتر نے چھپالیا تھا۔ آج اُس کے ٹوپے میں ایک سُنہرا پر بھی لگا ہوا تھا۔ وہ جنگ سے پہلے اپنی فوج کی تیاریاں دیکھ رہا تھا۔ اُس کا گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔ وہ جس ٹکڑی کے سامنے جاتا وہ اُسے سلامی دیتی اور پچھلی ٹکڑی نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کے گھن گھرج نعرے لگاتی۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں اور اپنے توپ خانے کی طرف دیکھا تو میر آتش نے اپنا سُرخ رومال لہرا کر اُسے مکمل تیاری کا اشارہ دیا۔

ہوائیں تیز ہوگئی تھیں اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پیادے بندوقیں اُٹھا اُٹھا کر دین دین کے نعرے لگا رہے تھے۔ تاتیاٹوپے نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور فوج کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اس بار اُس نے اپنے میمنہ و میسرہ پر خصوصی توجہ دی اور توپ خانے کے قریب کھڑے ہوئے سپاہیوں کو سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں توپ خانے سے دور نہیں جائیں گے اور جو بھی انگریز ٹکڑی اُن کی طرف بڑھے گی اُسے پسپا کر دیں گے۔ آج ہر سپاہی خون کے آخری قطرے تک جنگ لڑے گا۔ کیسا ہی معرکہ ہو قدم راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

تاتیاٹوپے اپنے گھوڑے سے نیچے اُترا، آسمان کی طرف دیکھا، اُس کا دل اپنے معبودِ حقیقی کی طرف رجوع ہوا، ایک لمحے کے لیے اُس کی آنکھیں بند ہوئیں جو کچھ اُسے مانگنا تھا وہ مانگ چکا۔ پھر اُس نے میان سے تلوار نکالی، گھوڑے پر سوار ہوا، تلوار والا ہاتھ پوری قوت کے ساتھ بلند کیا، جواب میں پورا بٹور نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کے نعروں سے گونج اُٹھا اور پھر اُس نے میر آتش کو اشارہ دیا کہ حملہ ہو۔۔۔

اور توپوں سے گولے برسنا شروع ہو گئے۔

ہیولاک نے بھی اپنے توپچیوں کو حکم دیا کہ جواب دیں اور دونوں جانب سے پیادے تیزی سے ایک دوسرے کی جانب دوڑتے ہوئے نکلے اور مقابل پر حملہ

آور ہوئے۔ تلواروں کی گونج تھی، بندوقوں سے گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی اور توپ سے گولے نکل رہے تھے۔ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ میدان لاشوں سے بھرنے لگا۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ چیخ و پکار سے ہو رلرز رہا تھا۔ اپنے پچھلے تجربے کی روشنی میں ہیولاک نے اپنے گھوڑ سوار دستے کو تاتیا ٹوپے کے توپ خانے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن اُدھر سے کچھ اس طرح گولیوں، اور توپ خانے سے گولوں کی برسات ہو رہی تھی کہ کچھ ہی دیر میں ہیولاک کا گھوڑ سوار دستہ تباہ ہو گیا، اور بچے ہوئے سوار جان بچا کر واپس لوٹے۔ تاتیا ٹوپے نے اب اپنے گھوڑ سوار دستے کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھیں۔ گھوڑے برق رفتار آگے بڑھے اور ہیولاک کے پیادہ لشکر پر تباہی نازل ہو گئی۔ جنگ اس شدت سے لڑی جا رہی تھی کہ پورا میدان لاشوں اور خون سے لت پت ہو گیا۔ ہیولاک نے جب یہ دیکھا کہ اس بار مجاہدین کا ہر سمت غلبہ ہے اور اُس کی فوجیں بُری طرح کٹ رہی ہیں تو اُس نے اپنی فوج کو بچا لینے ہی میں عافیت جانی اور فوجوں کو میدان چھوڑنے کا حکم دیا۔

انگریز لشکر بُری طرح بھاگنے لگا۔ تاتیا ٹوپے کے گھوڑ سواروں نے اُن کا تعاقب شروع کیا اور بھاگتے ہوئے سپاہی گھوڑوں سے نیچے آ رہے تھے، روندے جا رہے تھے مارے جا رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف دو گھنٹوں کی جنگ نے انگریزوں کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ مجاہدین کا لشکر اپنی فتح کا بگل بجا رہا تھا اور غنیم کے مال و اسباب اور اسلحہ کو سمیٹ رہا تھا۔

اس جنگ میں انگریزوں کو شکستِ فاش ہو گئی۔

ہیولاک تیزی سے اپنی فوج کو بچاتا ہوا کان پور کی طرف بھاگ نکلا۔ تاتیا ٹوپے نے بھی اپنے لشکر کو کان پور کی راہ پر ڈال دیا اور آخر بہت جلد ہیولاک کے مقابل پہنچ گیا۔ لکھنؤ اور کانپور کی سڑک پر پھر ایک بار مقابلہ شروع ہوا۔ اس بار بھی تاتیا ٹوپے نے اپنے لشکر کو کچھ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ وہ انگریز افواج پر وار تو کر سکتے تھے لیکن انگریزوں کو وار کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کمال کی بات تو یہ تھی کہ اس بار تاتیا

ٹوپے نے اپنے پورے لشکر کو بھی جنگ میں نہیں جھونکا تھا بلکہ آدھی فوج تیار کھڑی تھی۔ ہیولاک اس بار بھی جنگ جیت نہ سکا اور وہاں سے بھی بھاگ نکلا اور اب تاتیا ٹوپے کا نہ صرف کان پور پر پھر سے قبضہ ہو چکا تھا بلکہ کان پور سے لکھنؤ جانے والی سڑک بھی اُس کے قبضے میں آ گئی تھی۔

مجاہدین اس فتح سے بہت خوش تھے۔ پورے کان پور میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ڈھول اور تاشے بج رہے تھے۔ انگریزوں کے ضبط شدہ اسلحہ کی نمائش ہو رہی تھی۔ رقص و سرور کی محفلیں شروع ہو گئیں اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ انگریز لشکر پھر ایک بار اُن کے مقابل آ سکتا ہے۔

اس کے برخلاف اس جنگ کے بعد انگریزوں نے پھر سے اپنی فوج کی تنظیم شروع کر دی اور اُسے مستحکم کرنے میں جٹ گئے۔

شاہی محل معمول کے مطابق جگمگا رہا تھا اور محل کے باہر اردا بیگنیاں نیزے اُٹھائے پہرہ دے رہی تھیں۔ اور اُن سے دس گز کے فاصلے پر ہتیاروں سے لیس سپاہی اس انداز سے پہرہ دے رہے تھے گویا محل کے چاروں طرف گردش کر رہے تھے۔ قلعہ کی دیواروں پر روشنی پھیل رہی تھی اور درختوں کے ڈال ڈال مٹی کے دیئے روشن تھے۔ حبشی کنیزیں بھی اپنے اپنے مقام پر مستعید تھیں اور آسمان پر چاند چاندنی بکھیر رہا تھا۔
محل کے چھتوں پر لٹکے ہوئے فانوسوں سے روشنی برس رہی تھی۔ ہوائیں پردوں سے کھیل رہی تھیں۔ مرصع کمانوں کے نیچے دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور ان کمانوں کے درمیان حضور بادشاہ سلامت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ اُن کی پیشانی پر شکنیں اُبھری ہوئی تھیں اور دل و دماغ میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے اپنی دونوں مٹھیوں کو سختی سے بند کرتے اور پھر کھول دیتے۔ کبھی ٹہلنے کی رفتار بڑھ جاتی اور کبھی سست قدم ہو جاتے۔ وہ اسی بے خودی کے عالم میں ٹہل ہی رہے تھے کہ ملکہ زینت محل داخل ہوئیں، شاہی آداب بجالائی اور جیسے ہی حضور کی

جانب دیکھا تو خود بھی پریشان ہوگئیں اور اُن کی زبان سے نکلا، ''حضور شہنشاہِ ہند! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں کہ جلالِ تیموری و چنگیزی پر فکر و تردود کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور جبینِ استقلال لرزہ براندام ہے۔؟''

بادشاہ سلامت نے اُن کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر ٹہلتے ہوئے زبان عالی سے ارشاد ہوا، ''جانِ ظفر! آپ بھی طنز پر اُتر آئیں ہیں۔ہم کہاں شہنشاہِ ہند ہیں ۔ہم تو بس ایک کٹھ پتلی ہو کر رہ گئے ہیں۔''

زینت محل تڑپ کر رہ گئیں، ''حضور اس کنیز کی کیا اوقات جو طنز کرے، کنیز نے جو کچھ بھی کہا پورے خلوص کے ساتھ کہا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ حضور کسی خیالِ خام میں اُلجھ گئے ہیں۔آپ شہنشاہِ ہند ہی ہیں۔کیا آپ کے جاں نثار آپ کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر نہیں لگا چکے ہیں؟ اور کئی مہینوں سے مسلسل جنگ نہیں جھیل رہے ہیں؟''

بادشاہ سلامت اپنی جگہ پر ٹھہر گئے اور پلٹ کر زینت محل کی جانب دیکھا، ''ملکہ عالیہ آپ کچھ نہیں جانتیں،قلعہ معلی سے باہر نکل کر دیکھئے، ہمارے فرامین منہ چڑھا رہے ہیں۔اُن پر کوئی عمل نہیں ہو رہا ہے۔آج بھی دلّی میں لوٹ مار اور قتل و خون ہو رہا ہے اور ہمیں افسوس ہی نہیں بلکہ شرم آتی ہے یہ کارِ ذلیل خود ہمارے شہزادے اور خاندانِ شاہی کے افراد انجام دے رہے ہیں۔تلنگی افواج بدتمیزی پر اُتر آئی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے مقربِ خاص ہم سے غداری کر رہے ہیں۔ابھی تو صرف حکیم احسن اللہ خان گرفت میں آئے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں غداری کے اس کھیل میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے ہمارے اپنے ہیں۔۔آہ۔۔کس کس کے نام گنوائیں ہم بیگم،شرم زبان بند کرواتی ہے اور بقائے سلطنت کی ذمہ داری کچوکے لگاتی ہے۔''

''حضور۔'' زینت محل اُن کے بالکل قریب پہنچ گئیں، ''ہر دن کے ساتھ رات بھی ہوتی ہے،لیکن رات ہی کی کوکھ سے چاند بھی نکلتا ہے اور اُس کی چاندنی ہر تاریک گوشے کو منور کر دیتی ہے۔اور پھر مایوسی تو کفر ہے۔اسی چاندنی میں آپ کا ایک ایک غدار سامنے آجائے گا۔بس آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھئیے ۔ یہ انقلاب

خاندان مغلیہ کی ایک نئی تاریخ لکھے گا۔''

بادشاہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، ''یہ آپ کی خوش گمانی ہے ملکہ عالیہ۔ ہم تو جو کچھ محسوس کر رہے ہیں اُس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ بیگم ہماری آنکھوں میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔آپ اس شاطر قوم کو نہیں جانتیں۔ وہ اپنی کامیابی کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہیں اور ہمارے لوگ اپنے مفاد کی خاطر کسی بھی سمجھوتے سے ہاتھ ملا سکتے ہیں۔ جانے کیوں ہمیں بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ بہت جلد خاندان مغلیہ کا چراغ گُل ہونے والا ہے۔''

زینت محل بادشاہ کے سینے سے لگ گئیں، ''حضور! کنیز آپ کی کسی بات کو رد کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتی۔ یقیناً آپ کی بصیرت جو محسوس کر رہی ہے وہ ہماری بصارت کے پرے ہے، لیکن حضور یہ کنیز یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ آپ کچھ زیادہ ہی سوچنے لگے ہیں۔ انقلاب کا چراغ روشن ہو چکا ہے اور اُس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ایک طرف اودھ کے مجاہدین انگریزوں سے اپنی قوت کا خراج وصول کر رہے ہیں تو دوسری طرف تاتیا ٹوپے اُنھیں شکست پر شکست دے رہے ہیں۔ سنا ہے کہ اُن کا تسلط پھر سے ایک بار کانپور، بٹور اور کالپی پر ہو چکا ہے۔ لکھنؤ میں احمد اللہ شاہ اُنھیں محصور کر چکے ہیں۔''

''ملکہ عالیہ!'' بہادر شاہ ظفر نے آسمان کی طرف دیکھا، ''یہ گناہ گار اپنے اللہ سے یہی دعا کر سکتا ہے کہ وہ اُن کی فتح مندیوں کو یوں ہی برقرار رکھے۔''

ٹھیک اُسی وقت ایک کنیز داخل ہوئی، شاہی آداب بجالائی، ''حضور کا اقبال بلند رہے، وزیر سلطنت محبوب خان باریابی کے طالب ہیں۔''

''اُنھیں اجازت ہے۔'' بادشاہ سلامت نے آہستہ سے کہا اور زینت محل حجرۂ خاص کی جانب قدم بڑھانے لگیں۔

وزیر سلطنت محبوب خان حاضر ہوئے، شاہی آداب بجالائے، ''حضور کا اقبال بلند رہے۔''

بادشاہ سلامت نے اُن کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا تو وہ گویا ہوئے، ''حضور آپ کی افواج کے تمام سالار چاہتے ہیں کل آپ ہاتھی پر سوار ہو کر تمام جنگی مورچوں کا معائنہ فرمائیں اور مزید مشوروں سے نوازیں۔''

بادشاہ نے اُن کی طرف مسکرا کر دیکھا، ''ہم ضرور آئیں گے۔''

محبوب خان نے شاہی آداب بجالائے اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اور بادشاہ سلامت پھر ایک بار ٹہلنے لگے۔

حیدر خان مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ اُس کے قریب ہی چنبیلی شب خوابی کے لباس میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ فانوسوں سے روشنی چھن چھن کر دونوں پر پڑ رہی تھی۔ ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اور چھت پر آویزاں فانوس ہلنے لگے تھے۔ اُن کے ہلنے ڈولنے سے روشنی بھی لہرانے لگی تھی۔ چنبیلی نے حیدر خان کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے سے روشنی کی چادر کبھی نیچے اُترتی اور کبھی نیچے سے اوپر ہوتی۔ جب بھی روشنی اُس کے چہرے پر ہوتی تو اُس کی مردانہ وجاہت اُبھر اُبھر آتی۔ چنبیلی کو اُس پر اس قدر پیار آیا کہ وہ اُس کے چہرے پر جھک گئی اور اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھنے ہی والی تھی کہ ہوا کا ایک شریر جھونکا کھڑکی کے پٹ کھول کر تیزی سے اندر در آیا اور چنبیلی کی زلفوں کو اُس کے چہرے پر بکھراتے ہوئے حیدر خان کے چہرے کو ڈھک گیا۔ اُس نے ایک دم آنکھیں کھولیں، اُس کے سامنے ایک حسن مکمل اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اُسے ابھی پوری طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ کھڑکی کو بند کرنے کی نیت سے چنبیلی مسہری سے نیچے اُتر گئی، اور خان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، ''خان ہوائیں تیز ہو رہی ہیں، کمرے کا نظام درہم برہم ہو جاوے گا۔''

حیدر خان نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا، ''ہاں۔۔ یہ ہوائیں میرے اندر بھی تو اُتر گئی ہیں۔''

چنبیلی نے اُس کی طرف محبت نظروں سے دیکھا اور پھر اُس کی زبان سے نکلا، ''ہوائیں اپنا کام پورا کر چکی ہیں خان۔''

خان نے اُسے پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچا، اور چنبیلی نے اُس کے سینے پر سے اپنا سر اُٹھایا، ''مجھے کھڑکی تو بند کرنے دیں۔''

وہ اُس کی بانہوں سے نکل گئی اور کھڑکی کے قریب پہنچی۔ اُس نے باہر جھانک کر دیکھا، ہلکی ہلکی چاندنی ماحول کو رومانی فضاء بخش رہی تھی۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، چاند مسکرا رہا تھا۔ وہ وہیں پر ٹھہر گئی اور چاند کو تکنے لگی۔

''چنبیلی۔'' حیدر خان نے اُسے آہستہ سے آواز دی۔ وہ اُس کی طرف پلٹی اور حیدر خان کو پہلی ہی نظر میں دو چاند آگے پیچھے دکھائی دیئے اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا، ''آج تو میری آنکھوں میں دو دو چاند سمائے ہوئے ہیں۔۔!''

چنبیلی نے پھر ایک بار چاند کی طرف دیکھا اور پھر اُسی عالم میں کہا، ''خان تمہاری گود میں بھی ایک چاند اُترنے والا ہے۔''

حیدر خان کے چہرے پر خوشی کھل اُٹھی۔ وہ تیزی سے مسہری سے نیچے اُترا اور اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اُسی طرح کھڑی چاند کو نہار رہی تھی۔ اُس نے اُسے پیچھے سے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اُس کے کان میں آہستہ سے کہا، ''کیا کہا تم نے۔؟''

''وہی جو آپ نے سُنا ہے۔'' وہ گھوم کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی، ''چاند کی چاہ آپ کے من بھی تو رہی ہوگی۔''

حیدر خان نے اُسے پوری طاقت سے بھینچ لیا، ''ہاں! مگر وہ آسمان کا نہ ہو۔''

چنبیلی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''میری گود میں چاند آنے والا ہے۔'' وہ خوشی سے جھوم اُٹھا اور چنبیلی کو اپنی گود میں اُٹھا لیا اور اُسے دیوانوں کی طرح چومنے لگا۔

''خان۔'' اُس نے اُس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، ''پہلے وعدہ کریں! اُسے پا کر آپ ہمیں تو نہیں بھول جائیں گے۔؟''

حیدر خان نے پھر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا، "یہی دھڑ کا تو مجھے بھی پریشان کر رہا ہے۔"

چنبیلی نے پلکیں اوپر اُٹھائیں، "خان! آپ پر سے ایسے ہزاروں چاند ہم قربان کر دیں گے۔" اور وہ اُس سے بے تحاشہ لپٹ گئی۔

"چنبیلی۔" اُس کی آواز میں محبت کے سارے ہی دریا موجزن تھے۔ چنبیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اُس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور خان اُسے مسہری پر لے آیا۔

چنبیلی کے ذہن کے کسی گوشے میں کسی مثنوی کے اشعار جھانک رہے تھے۔۔۔

کہا، رام جی کی ہے تم پر دیا
چندر ما سا بالک ترے ہوئے گا
مہاراج کے ہوں گے مقصد شتاب
کہ آیا ہے اب پانچواں آفتاب
نکلتے ہیں اب تو خوشی کے بچن
نہ ہو گر خوشی، تو نہ ہوں برہمن
نصیبوں نے کی آپ کے یاوری
کہ آئی ہے اب ساتویں مُشتری
مقرّر ترے چاہیئے ہو پسر
کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر

ہواؤں کے جھکڑ تیز ہو گئے تھے۔
کھڑکی سے چاند دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
درفانوسوں میں بند شمعوں کی لویں تھرتھرا رہی تھیں۔

☆☆☆

عزیزن کی دعائیں اور نسترن کی اُداسی لیے حیدر خان، چنبیلی اور سلیم دلّی کی طرف روانہ ہوئے۔ عزیزن نے چلتے وقت حیدر خان کو بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔ جن میں سب سے بڑی نصیحت یہ تھی کہ گو زخم ابھی بھر گئے ہیں لیکن مکمل صحت ابھی باقی ہے۔ اس لیے اُسے ابھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے انھیں گھوڑوں کی پیٹھ پر سفر کرنے کے بجائے آرام دہ تانگے کا بندوبست کر دیا تھا۔ جس میں حیدر خان اور چنبیلی سوار تھے۔ البتہ سلیم اپنے گھوڑے ہی پر تھا، اور اُن دونوں کے گھوڑے بھی ساتھ ہی تھے۔

سفر تیزی سے طئے ہو رہا تھا۔ تانگے کا کوچوان نہایت مشاقی سے گھوڑوں کو دوڑا رہا تھا۔ شہر کی مختلف گلیوں سے نکل کر وہ بڑی شاہراہ پر آ گئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے اور اُن درختوں کے پیچھے کھیت تھے۔ جہاں دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

حیدر خان نے چنبیلی کی طرف دیکھا، جو شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے مخاطب کیا، ''چنبیلی۔''

اور چنبیلی جیسے کسی خواب سے باہر نکلی۔

''ہم لکھنؤ سے باہر آ گئے ہیں۔'' اُس نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''لیکن میں ابھی تک، بھی آپا کے گھر سے باہر نہیں آئی ہوں۔'' چنبیلی نے

پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے درختوں کی جانب دیکھا، ''میری آنکھوں میں تو اب بھی آپا کا فکرمند چہرہ اور نسترن کے آنسوں دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔'' حیدر خان نے نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے منظر پر نگاہ ڈالی، اونچے اونچے درخت ہواؤں سے ڈول رہے تھے اور تانگہ تیز بہت تیز دوڑ رہا تھا، ''آپا نے جس محبت، خلوص اور اپنائیت سے ہمیں قبول کیا ہے اُس کے لیے تو الفاظ کم پڑتے ہیں۔''

''آج مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ کوئی لڑکی جب مائیکے سے سسرال جاتی ہے تو اُس کے دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔'' چنبیلی کی آنکھیں بھر آئیں۔

حیدر خان نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

سلیم نے پلٹ کر دیکھا۔ تانگہ برابر اُس کے پیچھے چلا آ رہا تھا اور تانگے میں حیدر خان اور چنبیلی پاس پاس بیٹھے ایک دوسرے کو نہار رہے تھے۔ اُس کے ذہن میں بھی نیلوفر چلی آئی۔ وہ انار کے پیڑ کے پاس کھڑی تھی اور سلیم ایک دم دروازے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ خوشی سے اُچھل پڑی، اور دوڑتے ہوئے اُس سے لپٹ گئی، ''آپ لوٹ آئے ہیں۔''

''ہاں۔'' سلیم نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''کیا ہم لکھنؤ کی جنگ جیت گئے؟ فرنگی وہاں سے بھاگ گئے؟'' اُس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نیلوفر جنگ لڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم نہ تو ابھی تک پوری طرح جنگ جیتے ہیں اور نا ہی فرنگی لکھنؤ سے غائب ہوئے ہیں۔'' اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، ''ہم جنگ کیا لڑتے ہر دم آپ کی موہنی صورت ہمارے سامنے رہتی۔ آپ کی یاد ہمیں دن رات ستاتی رہتی۔ بس اس لیے ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس آ گئے ہیں۔''

نیلوفر ایک دم اُس کی بانہوں میں سے نکل گئی اور اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟ دوسرے سپاہی تو ابھی تک وہیں پر ہیں۔ وہ بھگا ئیں گے اُنھیں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''شاباش۔'' وہ ایک دم بپھر گئی، ''اپنے ساتھیوں کو جنگ میں جھونک کر آپ چلے آئے ہیں؟ آپ کیسے سپاہی ہیں؟ آپ کو پتہ ہے، شہر کی ساری ماؤں نے اپنے بچوں کو قسم دے کر بھیجی ہیں کہ بیٹا ملک پر قربان ہو جائیں اور آپ۔۔! آپ لوٹ آئے۔؟''

''ہاں! اور دیکھ لیں ہم کسی معرکے میں بھی شریک نہیں ہوئے ہیں، ہمارے جسم پر کوئی زخم تک نہ آیا ہم جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس چلے آئے ہیں۔''

نیلوفر دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رونے لگی۔

''نیلوفر!'' اُس نے محبت سے آواز دی، ''ناراض ہوگئیں، ہم سید اختر علی کے بھتیجے ہیں۔ دیکھ لیں ہم آپ کے لیے سینے پر زخموں کے ہیرے موتی سجا کر لائے ہیں!''

نیلوفر نے اوپر دیکھا، اُس کے سامنے سلیم کا کھلا ہوا سینہ تھا جس پر بے شمار زخموں کے نشان تھے۔ وہ اُس سے ایک دم لپٹ گئی اور اُس کے زخموں کو چومنے لگی، ''یہ جنگ اتنی جلدی ختم نہیں ہوگی اب ہم دلّی ہی میں جنگ لڑیں گے۔''

اُس کے گھوڑے، کو ہلکی سی ٹھوکر لگی اور وہ تصورات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تانگہ اُس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ ویران میدانوں سے گزر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر ناکارہ توپیں پڑی ہوئی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی بیل گاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کے پنجر اور انسانی کھوپڑیاں جنگ کی ہولناکیوں کی داستان سنا رہی تھیں۔ آسمان میں اب بھی چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ جلی ہوئی کھیتیاں اور چاروں طرف سائیں سائیں کرتا ہوا سناٹا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حیدر خان کا سر چنبیلی کی گود میں تھا اور وہ اب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

بھانو پرتاب نے دیکھا ستی چورا کے گھاٹ کی سیڑھیوں پر پیر لٹکائے ایک سادھو بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں ہیں لیکن اُس کے سر پر بہت کم بال ہیں اور جسم پر بھی برائے نام گیروا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ وہ اُس کے قریب پہنچا لیکن سادھو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اُس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور آہستہ سے کہا، ''نمستے مہاراج! آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کچھ تو اپنا پریچئے دیجیے۔''

سادھو نے اُس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا،

نا میں دھرمی ، نہیں ادھرما

نا میں جتی ، نا کامی ہو

نا میں کہتا ، نا میں سنتا

نا میں سیوک ، سوامی ہو''

بھانو پرتاب کو اُس کی آواز جانی پہچانی سی لگی۔ وہ اُس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''کا ڈھونڈھے ہو بچہ۔؟ کبیرا، تو ہی کبیر و تو، تو رے نام کبیر

رام رتن تب پایئے، جد پہلے تج شریر''

بھانو پرتاب کو سب کچھ یاد آ گیا اور اُس نے آہستہ سے کہا، ''دمادم مست قلندر''

سادھو نے آنکھیں کھولیں اور بھانو پرتاب کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا، '' الکھ نرنجن !'' مہاراج بہت ہو گیا۔ اب اپنے اصلی روپ میں آ جائیں، بھگتوں سے کیا پردہ۔''

'' بچہ بھانو پرتاب! گنگا کے تٹ پر بھی سادھو سنتوں کو تنگ کرتا ہے۔ ہم سے بات کرنی ہے تو کوئی آسرا ڈھونڈھ! ہم سب کچھ تجھے بتاویں گے۔''

اور بھانو پرتاب سیدھا ایک کشتی کی طرف بڑھا، اُس کی رسی کھولی اور چپو

چلاتا ہوا گھاٹ کی اُس سیڑھی کے پاس پہنچ گیا جہاں سبحان میاں بیٹھے ہوئے تھے اور پھر اُس نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا، ''مہاراج گنگا میا سے بڑا کوئی راز دار نہیں، کشتی میں آجایئے۔''

اور سبحان میاں پھرتی سے اُس میں سوار ہو گئے۔ کشتی لہروں پر ڈولتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی اور بھانو پرتاب نے سوال کیا، ''سبحان بھائی کہاں سے آرہے ہیں اور اس بھیس کا کیا راز ہے؟''

اُنھوں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا، ''ہم بنارس میں کچھ دن رہے ہیں پھر وہاں سے سیدھا بہار پہنچ گئے تھے۔''

''کیا حال ہے بہار کا۔''

''بہار میں بوڑھا کنور سنگھ فرنگیوں کے لیے موت کا پیغام ہو گیا ہے۔''

''کنور سنگھ۔؟'' بھانو پرتاب نے سوالیہ نظروں سے اُنھیں دیکھا۔

''ہاں کنور سنگھ! بہار کے ایک چھوٹے سے علاقے کا راجہ۔ جہاں ہندو مسلم اتحاد کی گنگا جمنا بہتی ہے۔ وہاں کبھی سید احمد شہید کے معتقدین نے پٹنہ میں ایک انجمن بنائی تھی اور اُس انجمن نے بیڑہ اُٹھایا تھا کہ وہ ملک سے فرنگیوں کو نکال کر ہی رہیں گے۔ وہاں کے کمیشنر نے سات مولویوں کو گفتگو کے بہانے بلایا تھا اور اُن میں سے تین کو گرفتار کر لیا تھا۔ بس پھر کیا تھا آگ بھڑک اُٹھی۔ پیر علی نے فرنگی افسر لائل کو گولی چٹا دیا۔ فرنگیوں نے اُسے پھانسی پر چڑھا دیا۔ یہ بات جب کنور سنگھ تک پہنچی تو وہ بھڑک اُٹھا، ہاتھ میں بہادر شاہ ظفر کا جھنڈا لیا اور آرہ پر چڑھائی کر دیا۔ وہاں کا خزانہ لوٹ لیا اور جیل خانہ کو توڑ کر سارے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔''

''اور فرنگی۔۔؟ اُنھوں نے کچھ نہیں کیا۔؟'' چپوؤں پر زور لگاتے ہوئے بھانو پرتاب نے سبحان میاں کی طرف دیکھا، اور اُنھوں نے دور تک پھیلی ہوئی گنگا ندی پر نظریں ڈالیں۔ بے شمار پرندے گنگا کے اوپر منڈلاتے ہوئے نظر آئے، ''بھانو! ان پرندوں کو دیکھ رہے ہو؟ یہ کس جرأت سے بہتے پانی پر جھپٹا مار رہے ہیں اور اپنا شکار

کر رہے ہیں ۔ یہی حالت ہم ہندوستانیوں کی بھی ہے ۔ فرنگیوں کے ہاتھوں میں اقتدار ہے،اُن کے پاس بڑھیا فوج اور اسلحہ کی کمی نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم اُن کا مقابلہ کر رہے ہیں یا نہیں؟''

بھانو پرتاب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور سبحان میاں نے کہنا شروع کیا،'' راجہ کنور سنگھ یہ بات خوب جانتا تھا کہ فرنگی اپنے قلعے کو بچانے کی خاطر کمک ضرور بھیجیں گے ۔اُس نے اپنی ساری فوج کو جنگل میں چھپا دیا اور چھاپہ مار لڑائی کا آدیش دیا، جیسے ہی فرنگی فوج جنگل میں داخل ہوئی، بھیا اُن پر وہ گولیاں برسیں کے اُن کا کمانڈر بھی کھیت رہا۔ وہ سب دانہ پور کی جانب بھاگ نکلے۔''

بھانو نے دیکھا کہ اُس کی کشتی کنارے سے بہت دور نکل آئی ہے ۔ اُس نے کشتی کو کنارے کی طرف موڑا اور سبحان میاں سے پوچھا،''لیکن آپ نے یہ سادھو کا ویش کیوں لیا ہے۔؟''

اُنھوں نے پھر ایک بار نعرہ لگایا،'' دمادم مست قلندر! بچہ کنور سنگھ کی اس جنگ میں ہم بھی تو شریک تھے اور سوچ رہے ہیں کہ اب کسی اور جنگ میں حصہ لیں گے ۔ ہتیار لگا کر نکلتے تو کیا یہاں تک ہم پہنچ پاتے ۔؟ بس اس کارن سادھو بنے یہاں تک آ گئے ہیں ۔''

''سبحان بھائی یہاں تو یہ خبریں آ رہی ہیں کہ فرنگیوں کا ایک بڑا لشکر اس طرف آ رہا ہے۔''

''تو بچہ اس جنگ کو جتا کر ہی ہم دلّی جائیں گے ۔ اماں ذرا چپو تیز چلائیں کنارہ ابھی کتنی دور ہے۔''اور بھانو پرتاب کے ہاتھ تیز تیز چپو چلانے لگے۔

آسمان ابر آلود تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں ۔ حیدر خان کا چھوٹا سا قافلہ ایک کھیت میں کنویں کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ اُنھوں نے احتیاطاً اپنے تانگے اور گھوڑوں کو جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا اور کنویں سے لگ کر درخت کے نیچے فرش بچھا کر بیٹھے ہوئے

تھے۔ کھانا کھا چکے تھے۔ حیدر خان پیٹھ سیدھی کرنے کی نیت سے لیٹ گیا تو چنبیلی اور سلیم اپنی جگہ سے اُٹھے اور آم کے درخت کے نیچے کیریاں تلاش کرنے لگے۔ سڑک کے اُس پار تاحدِ نظر میدان پھیلا ہوا تھا۔ اچانک دور سے فوجی بینڈ باجے کی آوازیں آنے لگیں۔ سلیم اور چنبیلی نے آواز کی طرف دیکھا۔ پھر شور سنائی دیا اور وہ دونوں حیدر خان کے پاس پہنچے۔ اُس نے اُنھیں فوراً نیچے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گئے۔ اب تینوں کی نظریں آوازوں کی طرف تھیں۔ دور سے چونٹیوں کی قطار کے مانند انگریزی لشکر چلا آ رہا تھا۔ آگے آگے بینڈ باجا تھا، پھر پیادے تھے، اُن کے پیچھے بے شمار بیل گاڑیاں تھیں۔ اُن کے بعد ہاتھی تھے جو بڑی بڑی توپوں کو کھینچ رہے تھے اور سب سے آخر میں گھوڑ سوار تھے۔ گرد وغبار آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔

''یہ لشکر یقینی طور پر لکھنؤ کی طرف ہی جا رہا ہے۔'' حیدر خان نے آہستہ سے کہا۔

چنبیلی نے اُس کی طرف دیکھا، ''کم بخت جگہ جگہ مارے جا رہے ہیں پھر بھی اقتدار کا نشہ کم نہیں ہوتا۔''

''کیا ہم لکھنؤ واپس جائیں اور اس کی اطلاع مولانا صاحب کو دے دیں؟'' سلیم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ سلیم۔'' حیدر خان نے اُسے حکم دیا، ''مولانا کو اُن کے آمد کی اطلاع پہلے ہی سے ہو چکی ہوگی۔''

اُس نے پھر لشکر کی طرف دیکھا جو نہایت شان وشوکت اور باجے گاجے کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اُن کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

ٹھیک اُسی وقت عقب سے چمٹوں کے بجانے کی آوازیں آنے لگیں اور تینوں نے پلٹ کر دیکھا، اُن کے پیچھے سبز لباسوں میں ملبوس فقراء کی ایک ٹولی چمٹے بجاتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ وہ فوج کو بھول کر اُنھیں دیکھنے لگے۔ فقراء تیزی سے قریب آ رہے تھے اور اب اُن کے گانے کی آوازیں بھی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ چمٹے

زورزور سے بج رہے تھے اور وہ سب مل کر گا رہے تھے،

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

وہ اُن کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ اُن کی نورانی صورتیں، چہروں پر داڑھی، سر پر ہرا رومال بندھا ہوا، جسم پر ہرا کرتا، اور ہری تہبند تھی۔ اُن کے چمٹے زورزور سے بج رہے تھے اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گا رہے تھے،

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر، دام، درم کا بھانڈا ہے، بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نائک تن کا نکل گیا، جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے، نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

وہ گاتے بجاتے آگے نکل گئے اور اُن سے آگے دور فوجی لشکر جا رہا تھا۔ گرد و غبار اُڑ رہی تھی۔

حیدر خان کی نظروں میں دونوں تھے اور دونوں ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ بس گرد و غبار باقی تھا۔ وہ سوچنے لگا، ایک اقتدار کی چاہ میں موت کا سودا کرنے نکلا ہے اور دوسرا دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کر رہا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا اور اُس کا دل ڈوب گیا۔

"کس فکر میں ڈوبے ہو خان۔" چنبیلی ایک منٹ بھی اُس سے غافل نہیں رہتی تھی۔ اُسے خاموش دیکھ کر اُس نے فوراً سوال کیا۔

حیدر خان نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکا دی، "چنبیلی زندگی کتنی

آسان ہے اور ہم نے اُسے کس قدر مشکل بنا دیا ہے۔'' وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے
دیکھنے لگا، گرد و غبار ابھی تک اُڑ رہا تھا،'' انسان کو کیا چاہیئے ؟ دو وقت کی روٹی، تن بھر
کپڑا، اور سر چھپانے کو آسرا، لیکن ہم نے حرص و ہوس میں اُسے کہاں سے کہاں پہنچا
دیئے ہیں؟ اقتدار، حکومت، کوٹھی، بنگلہ، نام و نمود، جنگ و جدل ۔۔۔ اور یہ نہیں سوچتے
کہ وہ سب کچھ تو یہیں پر رہ جائے گا، اور جو ساتھ لے جانا ہے ہم نے اُس کے لیے کیا
کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔''

''خان۔'' چنبیلی اُس کے مقابل کھڑی ہو گئی،'' جو آپ سوچ رہے ہیں وہ
زندگی کا ایک رُخ ضرور ہے۔''

حیدر خان اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور وہ کہہ رہی تھی،'' لیکن ذرا سوچو،
خدا کے نائب کا کام کیا صرف یہی ہے؟ اُس نے اپنے نائب کو ایک بہتر نظام کے
قیام کا حکم بھی تو دیا ہے، اور کیا یہ نظام یونہی قائم ہو جائے گا۔؟ وہ تو ہمیں حکم دے رہا
ہے کہ نکل پڑھو خواہ تھوڑا ہی سامان ہو یا زیادہ سامان ہو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو یہ
تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو تو دیر نہ کرو۔''

خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی،'' خانم! آج میں تم میں ایک نئی چنبیلی
کو دیکھ رہا ہوں۔''

اُس نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا

''یہ سب عزیزن آپا کی تربیت کا نتیجہ ہے خان۔ وہ گائیکی اور رقص کے لیے
جہاں اُستاد کے حوالے کرتی تھیں وہیں ادبیات اور دینیات کے مولویوں کے سامنے
بھی بٹھاتی تھیں۔''

''تو چلیں دلّی میں جہاد ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔''

''ہاں چلیں۔'' وہ اُس سے علحدہ ہوئی، اور حیدر خان نے دور کھڑے
ہوئے کوچوان کو اشارہ کیا کہ سفر شروع کریں۔

دلّی کی جنگ اب مجاہدین اور انگریزوں کی جنگ نہ رہ کر عوامی سطح پر پہنچ چکی تھی۔ دیہات دیہات سے لوگ ہتیار باندھے چلے آرہے تھے۔ اس وقت دلّی میں قریب قریب چالیس ہزار کا لشکر برسرِ پیکار تھا اور اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کرنا انگریزوں کے لیے ناممکنات میں سے تھا، لیکن اُن کی خوش قسمتی اور مجاہدین کی بدقسمتی یہ تھی کہ غدار چھوٹے سے چھوٹی اور بڑے سے بڑی ہر خبر کو انگریزوں تک پہنچا رہے تھے۔ ان غداروں میں مرزا الٰہی بخش، گوری شنکر، رجب علی، تراب علی، جیون لال وغیرہ کی ایک بڑی فہرست تھی جو اپنی جان پر کھیل کر انگریزوں کے انعام کے لالچ میں اُن کی مدد کر رہے تھے۔

دوسری طرف نانگلی کے عوام نہ صرف مجاہدین کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے بلکہ اُن کے شانہ بشانہ جنگ بھی لڑ رہے تھے۔ مغل شہزادوں کے علاوہ امراء جن میں بطور خاص امین الدین خان اور تاج الدین خان اپنے لشکروں کے ساتھ شریکِ جنگ تھے۔ ہر روز ایک دوسرے پر حملے ہوتے، دونوں طرف کے فوجی مارے جاتے، زخمی ہوتے لیکن اُن کے ساتھیوں کے حوصلے اُسی طرح برقرار رہتے۔ چنانچہ دو بدو کی جنگ میں شہزادہ غلام مصطفیٰ بھی زخمی ہو گیا تھا۔ شہزادہ عظیم بیگ جو ہانسی میں تھا وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ دلّی آ گیا تھا اور بادشاہ سلامت کے لشکر میں ضم ہو گیا تھا۔ نجف گڑھ کے زمینداروں نے بخت خان کی حمایت کا صرف اعلان ہی نہیں کیا تھا بلکہ وہ اُن کے ساتھ شامل بھی تھے۔ اسی طرح پانی پت اور سونی پت کے زمیندار بھی مجاہدین کے حامی بن گئے تھے۔ بہادر گڑھ کے بہادر علی خان بھی ہر طرح سے بخت خان کے حامی و ناصر تھے۔

عوام پورے جوش وخروش کے ساتھ انگریزوں پر حملے کرتی اور اُنھیں پسپا ہوتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ سب کو کامل یقین تھا کہ انگریز دلّی میں داخل نہ ہو سکیں گے۔

قلعہ معلیٰ کے آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں لیکن اُن کی طرف کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سارے پہرے دار، سپاہی بس اپنی متعین ذمہ داری کو نبھا رہے تھے۔ سردار امین الدین اپنے گھوڑے پر سوار سپہ سالارِ آعظم مرزا مغل کے محل کی طرف جا رہے تھے۔ کنیزیں، اُردا بیگنیاں، جسولنیاں اِدھر اُدھر بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔

سپاہ سالارِ آعظم رات دیر گئے تک کشمیری دروازے کے باہر کھڑے انگریزوں کے ہر شب خون کو نا کام بناتے رہے اور جب اُنھیں اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی حملہ نہیں ہوگا تو وہ قلعہ معلیٰ لوٹ آئے تھے اور بعد نمازِ فجر بستر پر لیٹے ہی تھے کہ نیند نے اُنھیں اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ اُن کے سرہانے حضور بانو بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔ چہرا پریشان تھا اور آنکھوں سے اُس کا اظہار ہو رہا تھا۔ تب ہی ایک کنیز داخل ہوئی، شاہی آداب بجالائی، "حضور شاد و آباد رہیں۔ سردار امین الدین خان حاضر ہوے ہیں اور شہزادے عالی وقار سے ملنا چاہتے ہیں۔"

بیگم مرزا مغل نے ایک نظر شہزادے پر ڈالی اور پھر آہستہ سے کہا، "اُنھیں اطلاع پہنچا دیں کہ سپہ سالارِ آعظم فی الحال آرام فرما رہے ہیں۔ وہ بعد میں کبھی تشریف لائیں۔"

کنیز واپسی کے لیے پلٹی ہی تھی کہ شہزادے نے آنکھیں کھولیں، اور فوراً کہا، "کنیز اُنھیں مہمان خانے میں بٹھائیں اور بتائیں کہ ہم ابھی آتے ہیں۔"

کنیز تیزی سے باہر نکلی اور شہزادے نے اپنی بیگم کی جانب دیکھا تو اُسے خفگی کے آثار دکھائی دیئے۔ وہ اُنھیں سمجھانے لگے، "جانِ مغل! آپ نہیں جانتیں جنگ کا نقشہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے اور ہمارا ہر چیز سے باخبر رہنا نہایت ضروری ہے۔" اور پھر اُن کے قدم شاہی حمام کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔

امین الدین خان شہزادے کے منتظر ہی تھے کہ سردار تاج الدین خان بھی پہنچ گئے اور دونوں جنگی معاملات پر گفتگو کرنے لگے۔

کنیز دونوں کے لیے شربتِ انار اور خشک میووں کا تھال لیے حاضر ہوئی اور

اُسے سلیقے سے رکھ کر رخصت ہوئی۔ دونوں شربتِ انار کو پینے لگے۔ شربت کی مٹھاس اُن کے چہروں پر جھلک رہی تھی۔

شہزادے کی آمد کا اعلان ہوا اور وہ دونوں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شہزادہ مہمان خانے میں داخل ہوا، دونوں نے شاہی آداب بجالائے اور شہزادہ اپنے مسندِ خاص پر بیٹھ گیا اور امین الدین خان کی طرف دیکھا تو وہ گویا ہوا، ''حضور آپ کے جانے کے بعد رات کا آخری شب خون مجاہدین کے حق میں بہت مہنگا پڑا، انگریزوں نے جرنیلی سڑک پر قبضہ کرلیا ہے اور اپنے تحفظ کی خاطر اطراف کے دیہاتوں کو نذرِ آتش کر دیا ہے۔''

مرزا مغل پریشانی کے عالم میں اپنی مسند سے اُٹھ گئے اور بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگے، ''خان یہ خبر ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔''

''لیکن شہزادے حضور ایک اچھی خبر بھی ہے کہ منشی جعفر علی تھانیسر سے دلّی پہنچ گئے ہیں اور میدان جنگ کی طرف روانہ بھی ہو گئے ہیں۔ اُن کی اس آمد کو بطور نیک شگون لیا جا رہا ہے۔''

مرزا مغل ابھی کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ تاج الدین نے آہستہ سے کہا، ''حضور مبارکباد قبول فرمائیں۔''

شہزادے نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا، ''آگ اور خون کے اس طوفان میں مبارکباد کیسی تاج الدین خان؟''

شہزادے حضور انگریزوں نے نہایت احتیاط سے اپنی توپیں جمائی تھیں اور شہر پر گولہ باری کر رہے تھے۔ فصیل کے کچھ حصے تاراج بھی ہو گئے تھے۔ اور انگریز سپاہی سیڑھیوں کی مدد سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ بخت خان کا گھوڑ سوار دستہ وہاں پر پہنچ گیا اور اُن کے عقب سے اُس نے ایسا شدید حملہ کیا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ دوسری طرف اندرون شہر کے فوجیوں نے اپنے توپ خانے کی جگہ بدل کر ایسی گولہ باری کی کہ اُن کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور اُنھیں

زبردست جانی نقصان اُنھیں اُٹھانا پڑا۔''

مرزا مغل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ،'' سالار بخت خان اکثر ایسے خطرناک حالات میں کسی مسیح کی طرح پہنچ جاتے ہیں۔ چلیئے ۔۔اب ہم بھی جنگی مورچوں کی طرف چلتے ہیں۔

سلیم علی کو اُس گھر کے دروازے پر پہنچا کر حیدر خان اور چنبیلی اپنی دیوڑھی میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں پنڈت اور طالب احمد پہلے ہی سے مقیم تھے۔ بہت دیر تک اودھ کے حالات اور وہاں کی جنگوں سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ طالب احمد اچانک اپنی جگہ سے اُٹھا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ چنبیلی پنڈت کو حیدر خان کے زخمی ہونے کا واقعہ سنانے لگی پھر اُس کے علاج کی تفصیل سنا ہی رہی تھی کہ طالب احمد فوجی لباس میں ملبوس پہنچ گیا۔ حیدر خان نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا تو اُس نے بتانا شروع کیا،'' آج مجاہدین انگریزوں پر بہت بڑا حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بخت خان پوری تیاری کر چکے ہیں اگر یہ منزل طئے ہوگئی تو فرنگیوں کو پہنچنے والی رسد منقطع ہو جائے گی۔''

یہ سنتے ہی حیدر خان اپنی جگہ سے اُٹھنے لگا تو چنبیلی نے فوراً کہا،'' خان آپا نے آپ کو کچھ نصیحتیں کی ہیں۔''

حیدر خان نے اُس کی طرف خوشامدانہ نظروں سے دیکھا تو وہ طالب احمد سے مخاطب ہوئی ،

'' بھائی صاحب ! ان کے زخم ابھی اندر سے کچے ہیں اور عزیزن آپا نے انھیں ابھی کسی جنگ میں شریک ہونے سے منع کیا ہے۔''

'' ویسے بھی خان آپ آج ہی آئے ہیں۔'' طالب احمد نے حیدر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا،'' کم از کم آج آپ آرام کر لیں، یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوگی۔''

حیدر خان نے اُس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا لیکن طالب

احمد اُس سے آنکھیں ملائے بغیر ہی آگے بڑھ گیا۔ حیدر خان اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اُس کا سر جھک گیا وہ غالباً اپنے آپ پر ملامت بھیج رہا تھا۔ چنبیلی اور پنڈت اُسے چپ چاپ گھورے جا رہے تھے۔

طالب احمد کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں اُبھری اور پھر آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئیں۔ ماحول پر سناٹا چھا گیا۔

چنبیلی نے ماحول کے سناٹے کو توڑتے ہوئے پنڈت سے پوچھا، ''پنڈت جی یہ تو بتائیں دلّی کے کیا حالات رہے ہیں۔''

پنڈت شش و پنج کا شکار ہو گیا کہ بتائے یا نہ بتائے۔ اُس نے چنبیلی کی طرف دیکھا اور حیدر خان کی طرف اشارہ کیا کہ یہ برداشت کر سکیں گے۔؟

ماحول کی خاموشی کو حیدر خان نے بھی محسوس کیا اور فوراً کہا، ''پنڈت سنا نہیں تم نے، چنبیلی تم سے کچھ پوچھ رہی ہے۔ میں بھی تو جانوں آخر دلّی میں کیا کچھ ہوا ہے۔''

''حیدر بھائی۔'' پنڈت نے کہنا شروع کیا، ''دلّی کا حال اس وقت اُس مچھلی خانے جیسا ہو گیا ہے جو سرکتے سرکتے میز کے آخری سرے تک پہنچ گیا ہے، اور اُس میں بند مچھلیاں گھبرائی گھبرائی دن رات ادھر اُدھر بھاگتی پھر رہی ہیں۔ ایک کھڑکی سے وفادار ہوائیں اُس مچھلی خانے کو پوری قوت سے سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہیں تو دوسری کھڑکی سے غدار اور فرنگی ہوائیں اُسے پاش پاش کرنے کی خاطر زور لگا رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوگا۔''

حیدر خان ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کوئی قوت اُس سے بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ فوراً میدان جنگ میں پہنچ جائے۔ اُس نے پنڈت اور چنبیلی کی طرف دیکھا، ''چنبیلی اب میرے برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ رہی ہیں، میرا ضمیر مجھے آواز دے رہا ہے اور میرے ہاتھ ہتیار مانگ رہے ہیں۔''

''خان صرف کچھ دنوں ہی کی تو بات ہے۔''

حیدر خان کی آنکھیں جذبات سے بند ہو گئیں۔

''حیدر بھائی ہم دلّی والے ویسے بڑا کڑا مقابلہ کر رہے ہیں۔''

اُس نے پنڈت کی طرف دیکھا تو وہ بتانے لگا،''اسی دلّی میں ایک بوڑھی سی عورت تھی، وہ ہمیں ہر روز جوش دلاتی، خود گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر آتی۔ اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار رہتی۔ ہم سب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار اُس کی کمان میں جاتے۔ اچانک فرنگیوں پر حملہ کرتے اور وہ عورت ایسی مردانہ تلوار چلاتی کہ ہر روز کئی فرنگیوں کو اکیلے ہی جہنم رسید کرتی اور ہم بھی دس بیس پر ہاتھ صاف کرتے اور ان کے لشکر کے تیار ہونے سے پہلے ہی لوٹ آتے۔ فرنگی بڑے پریشان تھے کہ آخر وہ بوڑھی عورت کون ہے جو آندھی کی طرح آتی ہے اور موت بن کر چھا جاتی ہے اور پھر لوٹ بھی جاتی ہے۔

''پنڈت مسکرانے لگا۔

حیدر خان اُس کی باتوں کو بڑی حیرت سے سن رہا تھا اور ساتھ ہی سوچ بھی رہا تھا کہ آخر وہ کون سورما عورت ہوگی جو اکیلے ہی ہر روز ایک کارنامہ انجام دیتی ہے۔

چنبیلی اُس کی دوائیں تیار کر چکی تھیں۔

''پنڈت لیکن وہ خاتون۔۔!''

حیدر بھائی اُسے تو آج تک ہم بھی نہیں جان سکے، لیکن اُس کی آواز میں ایسی گرج اور لہجے میں ایسی کشش ہوتی کہ اُس کے بلاوے پر ہم لوگ جمع ہو جائیں اور دیوانوں کی طرح اُس کے ساتھ نکل جائیں۔ پچھلے دن کی ہی بات ہے۔'' پنڈت کی آواز بھرا گئی۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں سارا منظر اُبھر آیا۔

'' کہاں ہو میرے بہادرو!'' آواز گونجی،'' گھروں سے نکلو! فرنگیوں کی موت تمہاری راہ تک رہی ہے۔''

اور پھر گھوڑوں پر سوار نوجون گھروں سے باہر نکلے۔

''میرے بہادروں تلواریں میان سے سونت لو۔۔ چلو میرے ساتھ۔''

گھوڑے دوڑنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں کے مورچے پر پہنچ

گئے اور اچانک حملہ کر دیا۔

''شاباش میرے بہادرو!۔اُن غاصبوں پر مانند بجلی ٹوٹ پڑو۔''

نوجوانوں میں جوش بھر گیا اور اُن کے حملوں میں شدّت آ گئی۔

وہ مردانہ وار تلوار چلا رہی تھی جو بھی اُس کے مقابل آتا وہ مارا جاتا۔

جنرل نکلسن پریشان ہو گیا۔ وہ دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دریافت کیا،''ویل وہ لیڈی کون ہے۔۔؟''

''سر اُسے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ بٹ وہ دن میں کبھی بھی طوفان کے مافق آ جاتا ہے اور ہمارے کئی فوجیوں کو ہلاک کرتا ہے اور پھر اُسی رفتار سے چلا بھی جاتا ہے۔''

''اوہ۔۔آج وہ واپس نہیں جائے گا۔ابھی ہم اُس کو دیکھتا ہے وہ کیسا واپس جاتا ہے۔''

حملہ شدّت اختیار کر گیا تھا۔نوجوان اس قدر حملے پر حملے کر رہے تھے کہ انگریز پریشان ہو گئے۔اُن کے سپاہی کٹ کٹ کر نیچے گر رہے تھے اور وہ چلا رہی تھی، ''شاباش میرے بہادرو! اُس وقت تک اُن کو مارتے رہو جب تک تمہارے بازوؤں میں دم ہے۔''

نکلسن فوراً توپچیوں کے پاس پہنچا اور حکم دیا،'' اُس بوڑھی عورت کو ختم کردو۔''

وہ اپنے ساتھیوں سے کچھ دور تھی۔انگریز اُس پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے اور زمین پر گر رہے تھے۔ بوڑھی کے وار کو روکنے کی کسی میں بھی طاقت نہیں تھی۔ اُس کے مقابل میں آنے کا مطلب ہی تھا موت۔ اُس کی تلوار بجلی کی مانند کوند رہی تھی۔

توپ کا گولہ اتنی زور سے پھٹا کہ لاشوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر گرنے لگے اور اُس کے سارے ساتھی ایک ساتھ چلائے:'' امّاں۔۔امّاں۔۔۔امّاں۔''

اور پھر اُنھوں نے دیکھا ڈھول اور گرد میں اُس کی تلوار چمک رہی ہے۔ وہ اُسی طرح گھوڑے پر سوار ہے اور گرد و غبار سے باہر نکل رہی ہے۔ اُس کے سارے ساتھی پھر ایک بار خوشی سے چلائے، ''اماں۔۔ اماں۔۔ اماں۔'' وہ سب اُس کی طرف پہنچنے لگے تو اُس نے اُنھیں قریب آنے سے منع کیا، ''میرے بہادرو! میرے سے دور رہو۔۔ لیکن ان کو چھوڑو مت۔'' اُس نے گھوڑے کا رُخ موڑا اور پھر ایک حملے کے لیے ایڑ لگا دی۔ توپ کا گولہ پھر پھٹا وہ اس بار بھی سلامت تھی۔ نوجوان گھبرا گئے، ''ڈرو مت بہادرو! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ توپ کے یہ گولے میرے نزدیک صرف آتش بازی ہے۔ ان سے کس طرح بچنا یہ میں خوب جانتی ہوں۔ وہ پھر ایک بار گرد و غبار میں غائب ہو گئی۔

توپ کے گولے گر رہے تھے اور وہ ہر بار بچ کر نکل آتی اور انگریزوں پر ٹوٹ پڑتی۔ یہاں تک کہ نکلسن غصّے سے پاگل ہو گیا۔ توپ خانے کے قریب کھڑے ہوئے گھوڑ سوار دستے کو حکم دیا، ''جاؤ اور اُسے ہو سکے تو زندہ گرفتار کرو۔''

گھوڑ سوار دستہ تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔

اُس نے جان لیا تھا کہ آج کا کام پورا ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ واپس چلو اور نوجوان تیزی سے واپسی کے لیے پلٹے اور اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔

وہ بھی اُن کے پیچھے آ رہی تھی کہ گھوڑ سوار دستے نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ اکیلی ہی اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیے جا رہی تھی اور وہ کٹ کٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ وہ کسی بھی طرح اُن کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر ایک انگریزی سپاہی نے اپنا پستول نکالا اور اُس کے ہاتھ پر فائر کر دیا، اُس کی تلوار گر گئی اور سپاہیوں نے اُسے دبوچ لیا۔''

پنڈت ابھی تک آسمان ہی کو گھور رہا تھا اور اُس کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

حیدر خان نے اُس کے مونڈھے کو تھپتھپایا تو وہ کہنے لگا،" حیدر بھائی فائر کی آواز سن کر ہم چونکے تھے لیکن ہم بہت دور نکل گئے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اُسے اپنے مورچے کی طرف لیے جا رہے تھے اُس کا بدن لہولہان تھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا،" پتہ نہیں اُنھوں نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ حیدر بھائی آج اُس کی آواز نہیں آئی تو ہم میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا۔" وہ روئے جا رہا تھا اور اُس کی ہر سانس سے اماں۔۔اماں۔۔۔اماں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ حیدر خان کی مُٹھیاں بار بار کھل بند ہو رہی تھیں اور چنبیلی کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

سلیم جونہی گھر میں داخل ہوا نیلوفر اُسے صحن میں انار کے درخت کے پاس ہی نظر آ گئی۔ اُس نے اُسے آواز دی اور جیسے ہی نیلوفر نے اُسے دیکھا وہ رونے لگی اور دوڑتے ہوئے جا کر اُس سے لپٹ گئی۔

"روتی کیوں ہو نیلوفر! دیکھو ہم اپنے سینے پر تمہارے لیے زخموں کے نشان لے کر آئے ہیں آپ یہی چاہتی تھیں نا؟"

لیکن نیلوفر نے اُس کے سینے کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی وہ بس روئے جا رہی تھی۔ وہ اُسے سمجھانے لگا،" نیلوفر اس طرح روتے نہیں۔ یاد کرو آپ نے ہم سے کیا کہا تھا کہ جب ہم جنگ سے واپس آئیں گے تو آپ ہمارا خوشی خوشی استقبال کریں گی کیا آپ وہ سب کچھ بھول گئیں۔"

نیلوفر کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی،" سلیم۔۔!" اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

" دیکھو نیلوفر اب ہم کہیں نہیں جائیں گے اسی دلّی میں فرنگیوں سے جنگ لڑیں گے۔ اب تو آپ خوش ہو جائیں۔"

اُس نے سلیم کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر روتے روتے کہنے لگی،" سلیم ۔۔ابا جان شہید ہو گئے ہیں۔" وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

سلیم کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ بھی دھاڑیں مار مار کر روئے لیکن وہ رو بھی نہ سکا اور نیلوفر کو کسی طرح دالان تک لے آیا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ دوڑتے ہوئے جا کر پانی لایا اور اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اتنی دیر میں اُس کی امّی جان بھی وہاں پہنچ گئیں اور وہ بھی رونے لگیں، ''بیٹا سلیم ہم تباہ برباد ہو گئے۔ ہمارے سر سے آسمان سرک گیا رے، اب ہم کیا کریں۔''

وہ ماں سے لپٹ گیا ۔ اُس کے بھی آنسو رواں ہو گئے اور وہ روتے روتے کہنے لگا، ''امّی جان صبر کیجیے اور نیلوفر کو سنبھالیے گا۔ یہ کیا حالت ہو گئی ہے اُس کی ،مجھ سے تو دیکھی نہیں جاتی ۔''

اور سلیم کی امّی جان نے نیلوفر کو اپنے سینے سے لپٹا لیا، ''نہ رو میری گڑیا نہ رو، کب تک روتی رہو گی ،ہم ہیں نا تمہارے سر پر۔'' وہ اُسے سمجھانے لگیں۔

سلیم اپنا سامان گھوڑے کی پیٹھ سے اُتار لایا اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

نیلوفر اُسی طرح اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تارا اور دینا ناتھ ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے اور جیسے ہی راہ داری میں اُنھوں نے قدم رکھا دینا ناتھ نے تارا کی طرف دیکھا، ''ہمارے اچانک آ جانے سے حیدر بھائی بہت خوش ہو جائیں گے۔''

تارا نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا، حالانکہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی وہ جذباتی ہو گئی تھی اور خوشی اُس کے روم روم سے پھوٹ رہی تھی ۔ اُس کے قدموں کی رفتار بڑھ گئی تھی ۔ دینا ناتھ گھوڑوں کو لیے اصطبل کی طرف بڑھا اور تارا تقریباً بھاگتی ہوئی صحن کی جانب بڑھی۔ وہ خوشی کے مارے چلانے لگی، ''حیدر بھائی ۔۔حیدر بھائی ۔۔۔حیدر بھائی۔''

چنبیلی کنویں پر کھڑی پانی نکال رہی تھی ۔ اُس نے ڈول وہیں پر چھوڑا اور تیزی سے تارا کی طرف بڑھی۔

حیدر خان نے بھی اُس کی آواز سُن لی تھی۔ وہ بھی خوشی خوشی دالان تک پہنچ گیا۔

تارا چنبیلی سے لپٹ گئی اور خوشی کے مارے اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں چنبیلی کی گردن پر گرنے لگے، اُس نے اُسے اپنے سینے سے علیحدہ کیا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ تارا کے آنسوں ابھی تک بہہ رہے تھے۔ چنبیلی نے تڑپ کر پوچھا، ''تارا سب خیریت تو ہے نا۔؟ تم اکیلی ہی آئی ہو۔؟ دینا ناتھ کیسا ہے۔؟ تارا کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ؟ تم۔۔تم کیوں اس طرح رو رہی ہو۔؟''

تارا کا آنسوں بھرا چہرا مسکرانے لگا، ''بھابھی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب مزے میں ہیں۔ بس مجھے حیدر بھائی اور آپ کی یاد بہت آ رہی تھی۔ وہاں آپ لوگوں کے بنا میرا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ حیدر بھائی کیسے ہیں؟''

حیدر خان ایک دم اُس کے سامنے آ گیا، ''میری لاڈو بہنا۔'' اور اُس نے اُسے آگے بڑھ کر لپٹا لیا، ''میری بہنا سب کُشل منگل ہے نا؟''

''ہاں بھیا۔''

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

''بھیا اُس کا شکر تو میں بعد میں ادا کرتی ہوں۔ میرے بھگوان تو آپ ہی ہیں بھیا۔ آپ ہی تو ہیں جس نے مجھے نیا جیون دیا ہے ورنہ اُس نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔''

حیدر خان نے اُس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، ''میری بہنا ایسی باتیں نہیں کرتے، وہ ناراض ہو جائے گا۔ ہم کیا ہیں کچھ نہیں۔۔ سب کچھ تو وہی کرتا ہے۔ تم نے مہابھارت تو پڑھی ہے۔؟۔۔۔ پڑھی نا۔؟''

تارا نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''تو کرشن کی وہ باتیں یاد کرو، جو ارجن سے اُس نے کہا تھا کہ اس سنسار میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ میں ہی کرتا ہوں، میں ہی سکھ دُکھ بانٹتا ہوں، میں ہی صبح شام

کرتا ہوں، میں ہی بھوشیہ لکھتا ہوں اور میں ہی سنکٹ میں ڈالتا ہوں، آشا بھی میں نراشا بھی میری، میں میں میں اور بس میں، دوجا نہ کوئی۔۔تو بہنا ہم سب تو اُس کے کھلونے ہیں وہ جیسا چاہے ویسا کھیل کھیلتا ہے۔''

''آپ دونوں کیا یہیں ساری پٹاریاں کھول لیں گے۔۔ اندر چلیں۔''

چنبیلی نے دالان کی جانب قدم اُٹھایا اور وہ دونوں بھی اُس کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھانے لگے اور اُن کے پیچھے سے دینا ناتھ کی آواز اُبھری،''ارے اس گھر میں داماد کی کچھ عزّت ہے کی نہیں؟''

''میرے بھیّا تم بھی میرے گلے لگ جاؤ۔''

دینا ناتھ اُس کے گلے لگ گیا۔خوشی کے مارے حیدر خان کے آنسوں نکل پڑے،''میں تم سے بہت خوش ہوں بھیا اور اگر تم مجھے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہو تو بس میری بہنیا کو خوش رکھیں۔''

دینا ناتھ جذباتی ہوگیا،''حیدر بھائی ہم دونوں کا بھی بس یہی ارمان ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں، آپ کی ساری پریشانیاں بھگوان ہمیں دے دیں۔''

''ارے ارے۔۔!''حیدر خان نے اُسے زور سے لپٹا لیا،'' بھیّا یہ کیا کہہ رہے ہو، میری دعاؤں کو اس طرح تو نہ لوٹاو۔''

وہ دونوں بھی دالان میں پہنچے اور دیکھا، تارا حمام میں سماور تیار کر رہی ہے اور چنبیلی باورچی خانے میں گھسی ہوئی ہے۔

''پہلے آپ لوگ نہا دھو کر تر و تازہ ہو جائیں پھر خوب باتیں کریں گے۔''

اور دینا ناتھ سیدھا حمام کی طرف دوڑا۔

لکھنؤ میں عزیزن کی خواتین کی فوج دن رات مصروف تھیں۔وہ جہاں اپنی فوج کی تعداد بڑھا رہی تھیں وہیں گھر گھر پہنچتیں اور فوجیوں کی امداد کے لیے رقمیں جمع کرتیں اور اُنھیں فوج کے سالاروں تک پہنچا دیتی تھیں۔

عزیزن کی فوج سے سارا اودھ بے حد خوش تھا اور اُس کی عزّت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سب مردانہ لباس استعمال کرتیں، کبھی بے تھکان گھوڑے دوڑاتیں، بندوقیں چلاتیں، نشانہ بازی کی مشقیں کرتیں، دشمن کے گھیراؤ سے کیسے بچا جا سکتا ہے اور اگر کوئی گھر جائے تو اُسے کس طرح نکالا جا سکتا ہے۔ اُس کا عملی سبق لیتیں، کچھ خواتین توپ چلانے کی مشق بھی کر رہی تھیں۔

دیکھا جائے تو پورا اودھ ہی ایک بڑی فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مولانا احمد اللہ شاہ ابھی تک ریسیڈنسی کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ روز جھڑپیں ہوتیں، اور دونوں طرف کے سپاہی کبھی زخمی ہوتے اور کبھی لقمہء اجل ہو جاتے تھے۔ مجاہدین کے حوصلے بلند تھے اور وہ فرنگیوں کو ہر طرح سے پریشان کیے ہوئے تھے۔

دیوڑھی میں محفل جمی ہوئی تھی۔ سبھی بے فکری سے بیٹھے ہوئے تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ حیدر خان نے ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر کہنے لگا،"آج مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ میری بہن، بہنوئی، بھائی سب موجود ہیں۔"

چنبیلی نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر اچانک اُسے سبحان میاں کی غیر موجودگی کا احساس ہوا، اور اسی احساس کے ساتھ بجلی زور سے کڑکی، اور اُس نے اُن ہی کے انداز میں نعرہ لگایا،"دمادم مست قلندر، دمادم مست قلندر۔!"

سب کے سب ہنسنے لگے۔

حیدر خان نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا تو وہ کہنے لگی،"میں سوچ رہی تھی کہ آج سبھی موجود ہیں۔ کمی ہے تو بس سبحان بھائی کی اور جیسے ہی اُن کا نام میرے ذہن میں آیا، آسمان میں بجلی نے زور سے سلامی دی اور میں سمجھ گئی سبحان بھائی ہماری محفل میں کڑکے ہیں۔"

ایک بار پھر سب کے لبوں سے قہقہے بلند ہوئے۔

"وہ کیا ابھی تک بنارس ہی میں بیٹھے ہیں؟"

''کہاں۔'' دینا ناتھ نے افسوس کرتے ہوئے کہا،'' اِدھر ہمارا بیاہ ہوا تھا اور وہ اُدھر مجاہدین کے ساتھ مورچہ بندی میں مصروف ہو گئے تھے۔''

''اور کنیادان؟ اسی بہانے سے تو وہ بنارس گئے تھے۔'' چنبیلی نے سب کی جانب دیکھا۔

''کیا نا، کسی طرح وہاں سے آئے، تارا کا کنیادان کیا اور پھر کہا کہ بھیا اب ہمیں اجازت دیں، بیٹی کے سسرال میں تو پانی بھی نہ پینے کی رسم ہے اور بنارس سے نکل گئے۔''

''خدا جانے کہاں بھٹکے رہے ہونگے۔؟''

''حیدر بھائی یہ جو آپ کی بہن ہے نا، یہ جب بھی سوچتی ہے کچھ نرالا ہی سوچتی ہے اور جو سپنا دیکھتی ہے وہ بھیا تک۔''

تارا نے اُسے مصنوعی غصّے سے دیکھا تو دینا ناتھ نے بھی مسخرے انداز میں دیدے مٹکاتے ہوئے کہا،'' ارے۔۔! بھائی کے گھر پہنچتے ہی شیرنی ہو گئی کیا؟''

''بھیّا! میری نندبلّی کب تھی۔؟'' چنبیلی نے بھی جواباً مسخرے پن کا مظاہرہ کیا۔

پھر سب کے سب ہنسنے لگے۔

''تاریخ تو ٹھیک سے یاد نہیں ہے بھابھی لیکن جولائی کا مہینہ رہا ہوگا۔ دن تمام برسات کی جھڑی لگی رہی، کوئل کوکی، پپیہے نے پیہو پیہو پکارا، اور یہ بھیّا بھیّا بھیّا کہتی رہی، میں اُدھر اُسارے میں کھڑا اُسے تکتا رہا، لیکن اس بندی نے یک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا، رات ہوئی ہم دونوں بستر پر لیٹے ہی تھے کہ یہ نیند کی پریاں کے ساتھ سپنوں کی نگری میں چلی گئی اور ہمارے پڑوسی اُستاد اللہ رکھا خان لوگوں کی نیند کی پرواہ کیے بغیر راگ گوری گلا پھاڑ پھاڑ گاتے رہے۔ ہائے رام میں کا کروں۔؟ نہ نیند آوے نہ چین آوے۔ من ہی من میں رام جی کا جاپ کرتا ہوا بس نیند کو بُلا ہی رہا تھا کہ یہ زور سے چلائی۔۔ حیدر بھائی! اور اُٹھ کر بیٹھ گئی اور لگی رونے، میں اُسے

سمجھانے لگا کہ کیا ہوا؟ ارے کیوں رو رہی ہو، کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا کیا، مگر بتایا تو کچھ نہ، بس رٹ لگا دی کہ دلّی چلو، دلّی چلو، حیدر بھائی واپس آ گئے ہونگے، ایک تو حالات ایسے، اب آپ ہی کہیے بھابھی میں انھیں اُسی سمئے دلّی کیسے لاتا۔۔؟''

چنبیلی نے تارا کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی، ''بہن کو بھائی کی یاد تو آنے ہی والی نا؟''

''ہاں وہ تو ہے، مگر تارا یہ تو بتائیں آخر تم نے سپنا میں کیا دیکھا تھا۔؟''

''بھابھی ہم بتائیں گے تو آپ سب مذاق اُڑائیں گے۔''

''نہیں نہیں۔۔کوئی مذاق نہیں اُڑائے گا۔''

تارا نے ایک بار پھر سب کی طرف شک و شبے کی نظروں سے دیکھا۔

''ارے سنائیں نا۔'' پنڈت نے زور سے کہا۔۔

''بھابھی وہ سپنا ایسا تھا کہ جیسے بھیّا کسی جنگ میں شریک ہیں۔'' تارا نے کہنا شروع کیا، ''وہ لڑتے بھڑتے دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں کہ اچانک دشمن کے سپاہیوں نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آپ گولی داغنے ہی والی تھیں کہ آپ کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور آپ گر گئیں۔ حیدر بھائی اکیلے ہی سب کا مقابلہ کیے جا رہے ہیں تبھی اُن کی تلوار کا اوپری حصّہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا اور دشمن اُن پر ٹوٹ پڑے۔ بھیّا ٹوٹی تلوار سے اپنے بچاؤ کا جتن کرتے ہیں لیکن کب تک؟ وہ اب گرے کہ جب گرے، بس وہ ہم سے دیکھا نہیں گیا اور ہماری چیخ نکل گئی۔'' تارا خاموش ہو گئی اور اُس کی نظریں جھک گئیں۔

''دیکھا بھابھی یہ سپنے بھی دیکھتی ہے تو کیسے ادھ بھوت سپنے۔'' دینا ناتھ اُسے چھیڑنے کے موڈ میں تھا، ''ارے سپنے تو سپنے ہوتے ہیں، مگر نہیں، یہ تو رونے کو بیٹھ گئی کہ ابھی چلو، مجھے بھیّا کی بہت یاد آ رہی ہے پتہ نہیں وہ کیسے ہونگے۔؟''

چنبیلی اور حیدر خان نے ایک دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھا اور پھر اُس نے کہنا شروع کیا، ''بہن آپ کے جیسا پیار ہر بھائی کو نصیب ہو جائے تو یہ دنیا یہیں پر

جنت بن جائے گی۔

خان آپ واقعی بڑے نصیب والے ہیں۔'' پھر وہ تارا سے مخاطب ہوئی، ''بہن تمہارا سپنا بالکل سچا سپنا تھا۔ خان دشمن کے نرغے میں ایسے ہی پھنسے تھے جیسے تم نے سپنے میں دیکھا ہے۔ میرے گھوڑے کو ٹھوکر لگنا اور میرا نیچے گرنا وہ بھی بالکل سچ ہی تھا۔ اور یہ بھی سچ ہی ہے کے حیدر خان کو یہ نئی زندگی ملی ہے۔''

پنڈت اور دینا ناتھ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

تارا اپنی جگہ سے اُٹھی اور حیدر خان سے لپٹ کر رونے لگی۔

''پگلی! اب تو میں بالکل اچھا ہو گیا ہوں۔ ہاں لیکن اُس وقت اگر چنبیلی اور سلیم نہ ہوتے تو شاید میں جیتا نہ رہتا۔''

وہ پھر ایک بار حیدر خان سے لپٹ گئی اور روتے روتے کہنے لگی، ''بھگوان کرے آپ کو میری ساری عمر لگ جائے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دینا ناتھ نے جو یہ دیکھا کہ ماحول غمگین ہوتا جا رہا ہے تو اُس نے تارا کو چھیڑتے ہوئے کہا، ''اے دکن والی چاند بی بی! اپنی ساری عمر یا بھائی کے حوالے کر دو گی تو یہ بیچارہ شوہر کدھر جائے گا؟''

سب ہنسنے لگے تھے۔

''تم بھی اپنی ساری عمر یا میرے بھیا کو دے دیں، ہم پھر ایک ہو جائیں گے۔''

پنڈت کو انتہائی حیرت ہوئی، ''واہ تارا بجو، کیا جواب دیا ہے۔ واہ۔''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''شاید طالب احمد آئے ہیں۔''

چنبیلی دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ گنگنانے لگی، مالنیا میں کالا دے بیلا کا پھول ۔۔ مالنیا میں کا ۔۔ جیسے ہی اُس نے دروازہ کھولا، سامنے سلیم تھا اور اُس کے پیچھے کوئی برقعہ پوش لڑکی تھی۔ چنبیلی خوشی سے چہکی، ''سلیم ۔۔ آؤ آؤ، ارے بھیا مان

گئے۔تم ہو بڑے کمالی، اپنی محبوبہ کو بھی ہم سے ملانے لائے ہو۔؟''

'' بجو۔۔اب یہ میری بیوی ہوگئی ہے۔'' اُس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، پھر وہ نیلوفر سے مخاطب ہوا،'' نیلوفر یہ میری بڑی بہن ہیں۔''

اور نیلوفر نے جھک کر چنبیلی کو آداب کیا اور چنبیلی نے اُسے اپنے گلے لگا لیا،'' اللہ تم دونوں کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے۔'' پھر وہ وہیں سے چلائی،'' خان! دیکھو کون آیا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی سلیم اور میرے لیے پھول جیسی نازک سی بھاوج بھی لایا ہے۔''

سلیم کا نام سنتے ہی حیدر خان بھی خوشی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تارا، دینا ناتھ، اور پنڈت بھی کھڑے ہو گئے۔

حیدر خان نے سلیم کو سینے سے لگا لیا اور نیلوفر کے سر پر سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا،'' میٹھو گڑیا تم تو ہم سب کی بہت ہی لاڈلی ہو۔''

''ارے نیلوفر برقعہ تو اُتارو۔''

سبھی اُس کو دیکھتے رہ گئے۔ چاند زمین پر اُتر آیا تھا۔

''سلیم میاں اللہ دلہن کو نظر بد سے بچائے۔ ہمارا تو جی خوش ہو گیا۔''

سلیم کے چہرے پر مسرت دوڑ رہی تھی۔

''کیا بھیا آتے ہی بیاہ رچا لیا۔''

''بجو! میں کیا کرتا، امّی جان کا یہی حکم تھا۔''

'' ارے کیوں باتیں بناتے ہو چھوٹے بھیا، حکم امّی جان کا تھا یا۔۔ ہوں۔۔۔؟'' اُس نے ہوں کو دیر تک کھینچا اور اُس کی آنکھیں مٹکنے لگیں۔

سب نے پھر زوردار قہقہے لگائے اور نیلوفر شرما کر زمین کو تکنے لگی، تارا اور چنبیلی کمرے میں گئیں اور مٹھائی کی کشتی لیے پہنچ گئیں۔ دولہا اور دُلہن کا منہ میٹھا کیا، تو دینا ناتھ نے چٹکیاں بجانا شروع کیا،'' حیدر بھائی پھر ایک بار ہو جائے، آج رنگ ہے ری ماں آج رنگ ہے۔''

اتنا سنتے ہی چنبیلی نے کھونٹی سے ڈھولک کو نیچے اُتارا اور اُسے بجانے لگی، تارا نے گیت چھیڑا اور چنبیلی اُس کی آواز میں آواز ملانے لگی۔۔۔۔

چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن
سکھی میکے میں جی گھبراوت ہے
چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن
چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن
اب سانچے نگر کو ہے کوچ بھیو
یہ تو جھوٹا نگر کہلاوت ہے
چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن
چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن
سکھی میکے میں جی گھبراوت ہے
سکھی میکے میں جی گھبراوت ہے
چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن
چلی پی کے نگر، سج بن کے دُلہن

سب کے سب ہنسنے لگے۔ نیلوفر شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ چنبیلی وہاں سے اُٹھی اور اپنے کمرے میں گئی اور ایک خوبصورت سا سونے کا ہار لے کر آئی اور اُسے نیلوفر کے گلے میں پہناتی ہوئے کہنے لگی، ''اے میری ننھی منّی بھاوج! یہ تحفہ قبول کرو۔''

سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

لیکن پنڈت نے مسخرے پن سے اپنے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔

''پنڈت گھبراو مت، میرے پاس ڈھیروں زیورات پڑے ہیں، تمہاری دُلہن آئے گی تو اُسے بھی پہنا دوں گی، لیکن پہلے دُلہن تو لاو۔''

سب ہنسنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ اب دسترخوان بچھنا ہی چاہیے۔'' حیدر خان نے سب کی طرف دیکھا، ''دلہن کے ساتھ کھانا کھائیں گے تو کچھ اور ہی مزا آئے گا۔''

نیلوفر نے کچھ کہنا چاہا تو تارا نے اُسے ٹوک دیا، ''اب تمہاری مرضی نہیں چلے گی بنو رانی، یہ تمہاری سسرال ہے۔۔ سمجھیں؟''

نیلوفر نے شرما کر گردن جھکا دی، اور سب ہنسنے لگے۔

سلیم نے حیدر خان کی طرف دیکھا جو نہایت شفیق نظروں سے نیلوفر کو دیکھ رہا تھا۔

اور چنبیلی دالان کے اوپری حصے میں دسترخوان سجا رہی تھی۔

☆☆☆

(۱۸)

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا اور سبھی طالب احمد کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اُس کے بارے میں سبھی کے دلوں میں عجیب عجیب سے خدشات پیدا ہونے لگے تھے لیکن اظہار کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور ہوائیں خاموش تھیں۔ عجیب سا حبس ہو رہا تھا۔ ماحول پر عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی اور اسی وحشت ناک سناٹے میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی۔

''غالباً طالب احمد ہی ہے۔''

اور وہ طالب احمد ہی تھا۔ اُس کا گھوڑا ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور وہ اُسے اصطبل میں پہنچا کر جونہی صحن میں آیا تو سب نے اُسے گھیر لیا۔

''طالب احمد آج کی جنگ کی کیا تفصیل ہے؟''

''حیدر بھائی ہم آج بھی پسپا ہو گئے ہیں۔ انگریزوں نے ہمیں بہت ہی کراری شکست دی ہے۔ وہ بھگ دڑ مچی تھی کہ بہت سارا اسلحہ بھی وہیں چھوڑ کر آئے ہیں۔''

تارا نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا، ''کیا ہمارے حوصلے پست ہو گئے ہیں؟''

''نہیں تارا بہن! اُن کی فوجی طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ پنجاب اور دوسرے علاقوں سے اُن کو مدد پہنچ رہی ہے۔ بے حساب فوجی دستے اُن کی مدد کے لیے آ رہے ہیں۔''

''طالب احمد آپ کو آنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی گئی ہے۔؟'' چنبیلی نے اُس کی طرف دیکھا۔

''بھابھی جنگ میں ہمارے قدم اُکھڑ گئے تھے۔ بھاگ دوڑ میں میں اتفاق سے ایک کھڈ میں گر گیا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ لوگ سمجھے شاید میں مر گیا۔''

''تم یقیناً کوئی بہت ہی اہم خبر لے کر یہاں آئے ہیں۔''

''ہاں حیدر بھائی! لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ خبر جنرل بخت خان تک کیسے پہنچاؤں۔''

حیدر خان اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، ''میں جانتا ہوں، جنرل بخت خان رات کے وقت عام طور پر کس جگہ پر ہوتے ہیں۔ ہم ابھی ان کے پاس چلتے ہیں۔''

''ہاں ہاں چلیں۔۔'' وہ سب اُٹھ کر اصطبل کی طرف دوڑے اور پھر ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

''حیدر بھائی ہم جنرل صاحب کے پاس تو جا رہے ہیں لیکن سوال یہی ہے کہ کیا وہ ہماری باتوں پر یقین کریں گے۔؟''

''طالب احمد تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ برابر یقین کریں گے۔ آخر کوئی اتنی رات گئے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر فوجی چھاؤنی کیوں آ جائے گا؟''

گھوڑے اُسی طرح دوڑ رہے تھے۔

''طالب احمد بس ایک بات ہوگی۔''

''کیا۔''

''یہی کے پہلے وہ ہماری خبروں کی تصدیق کریں گے اور اُس کے بعد ہی ہمیں وہاں سے جانے کی اجازت دیں گے۔''

''اُس سے کوئی فرق نہ ہوگا حیدر بھائی۔ میں ساری باتیں اپنے کانوں سے سُن کر آ رہا ہوں۔''

گھوڑوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''لو بھیا ہم فوجی چھاؤنی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔''

طالب احمد نے دیکھا تا حدِ نظر خیمے نصب ہیں۔ مشعلیں روشن ہیں، توپیں کھڑی ہیں، گھوڑے بندھے ہوئے ہیں اور پہریدار پہرہ دے رہے ہیں۔

وہ جیسے ہی چھاؤنی کے صدر دروازے پر پہنچے، پہریداروں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور اُنھیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔

حیدر خان نے فوراً اپنا سفید رومال لہرایا، ''دوست۔۔!''

''دوست۔'' پہریدار نے سخت لہجے میں کہا، ''اتنی رات گئے دوست ادھر کیوں آئی۔؟''

''ہمارے پاس بہت ہی اہم خبر ہے۔ ہم اُسے جنرل صاحب تک پہنچانا چاہتے ہیں۔'' طالب احمد نے جواب دیا۔

''واللہ ہم کو بتادو، ہم اُن تک پہنچادے گی۔''

حیدر خان نے اُسے پہچان لیا تھا، وہ اُس کے قریب پہنچا، ''اکبر خان! کیا تم مجھ پر بھی شک کرتے ہو۔؟''

''اوئے حیدر خان تم۔۔؟'' اُس نے بھی اُسے پہچان لیا، ''معاف کرنا ہم تم کو پہچانی نہیں تھی۔

تم ادھر ہی ٹھہرو، ہم ابھی خان کو خبر کرتی۔''

اکبر خان تیزی سے چھاؤنی میں داخل ہو گیا۔ بقیہ پہریدار خاموش نظروں سے اُن سب کی طرف دیکھ رہے تھے اور پھر اُنھوں نے اپنی تلواریں میان میں رکھ لی تھیں۔

دینا ناتھ اور پنڈت سوچ رہے تھے کہ اگر بخت خان نے اُن پر شک کیا تو اُس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کہیں ہم پھنس تو نہیں جائیں گے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اکبر خان واپس آ گیا اور کہنے لگا، ''خان صاحب تم لوگوں کو اندر بُلائی ہے۔''

وہ سب بخت خان کے خیمے میں داخل ہوئے۔ رات کے باوجود خان پوری

طرح فوجی لباس میں تھا۔ حیدر خان نے اُسے سلام کیا اور اُس نے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور پوچھا، ''کیا خبر لائے ہو تم لوگ۔''

حیدر خان نے آہستہ سے کہا، ''راز داری !''

''یہاں کوئی نہیں ہے بے فکر ہو کر بتاؤ۔''

طالب احمد اپنی جگہ سے اُٹھا، ''سپہ سالارِ اعظم، صبح کی جنگ میں میں بھی شریک تھا اور جب ہمارے قدم اُکھڑ گئے اور بھگ دڑ مچی تو عجلت میں میں ایک گہرے کھڈ میں گر گیا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو کافی رات ہو چکی تھی اور چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں نے دیکھا اُس کھڈ میں اُن کے بھی کچھ سپاہی مرے پڑے تھے۔ میں نے اُن میں سے ایک کے بدن پر سے اُس کی وردی اُتاری اور اُسے اپنے کپڑوں پر چڑھا لیا اور جیسے ہی باہر آیا کچھ ہی فاصلے پر ایک خیمے کو روشن پایا۔ میں چھپتے چھپاتے وہاں تک پہنچا۔ اُس خیمے میں کوئی ہمارا غدار بھی موجود تھا ۔ جسے میں نہ دیکھ پایا۔ وہ انگریز افسر سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے خیمے پر کان لگا دیئے اور مجھے انگریز افسر کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا، ''ویل مرزا کا مسیج بتاتا ہے کہ ابھی ہم کو لاہوری اور کابلی دروازے پر حملہ روک دینا مانگتا۔ ابھی ہم موری دروازے کے دمدموں کو تباہ کرے گا۔ مرزا کا آدمی موری دروازے پر لگی ہوئی توپوں کو ناکارہ کر دے گا۔ اُن میں لوہے کا راڈ پھنسا دے گا۔''

''ویل اس سے کیا فائدہ ہوگا۔؟''

''باغی لاہوری اور کابلی دروازے کی حفاظت کرے گا اور ہم موری دروازے کے راستے دلّی میں داخل ہو جائے گا۔ انڈر اسٹینڈ۔''

''ونڈر فُل۔'' پہلے افسر نے تعریف کی، ''ہماری فوج کا پوزیشن کیا ہے؟''

''سر ابھی ہمارے پاس پنجاب سے نیا کُمک پہنچ گیا ہے۔ چھ ہزار پانچ سو پیادہ، ایک ہزار گھوڑ سوار، اور چھ سو توپچی آ گیا ہے۔''

''اور ان میں انگریز سولجرس۔؟''

''سر! تین ہزار تین سو ستر ا ہے۔''

''گڈ! اور کیا تیاری کیا ہے تم؟''

''سر! ہمارا انجنیئر ز دس ہزار لکڑی کا گٹھا اور ایک لاکھ ریت سے بھرے ہوئے تھیلوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ بہت سا سیڑھیاں بھی تیار ہیں سر۔ ہمارا فوجی اُن پر چڑھ کر دلّی میں داخل ہو جائے گا۔''

''اور حملہ کبھی کرے گا؟''

''ہم سورج نکلنے سے پہلے حملہ کر دے گا۔ بٹ فوج کو آدھی رات کے بعد خاموشی سے مارچ کا حکم دے گا۔''

اور پھر دونوں کے قہقہے سنائی دیئے تھے۔''

''جنرل صاحب! میں وہاں سے بچتے بچاتے نکلا۔ اور دلّی میں پہنچ گیا۔''

بخت خان اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُسے شاباشی دی، ''نوجوان! بخت خان آپ کا احسان مند رہے گا، آپ نے بہت اہم خبر لائی ہے، ہم موری دروازے پر تلنگی دستے کو روانہ کرتے ہیں۔''

''خان صاحب!'' حیدر خان نے کہنا شروع کیا، ''جب تک ہماری بات کی تصدیق نہ ہو جائے ہم یہیں پر ٹھہرتے ہیں۔''

''نہیں۔'' بخت خان نے باری باری سب کو دیکھا، ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ لوگوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی سچائی کو ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

اور سب بخت خان کو سلام کرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔

تلنگی رجمنٹ موری دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ اُنھوں نے تیزی سے توپیں فصیل پر چڑھا دیں۔ چھوٹی توپیں فصیل کے سوراخوں میں لگا دیں، گھوڑسوار دستہ عین دروازے کے سامنے ننگی تلواریں لیے کھڑا ہو گیا۔ پیادے فصیل سے لگ کر کھڑے

ہو گئے ۔ رات تاریک تھی ۔ اُنھوں نے دیکھا ، دور۔ انگریزی افواج مشعلوں کی روشنی میں اسلحے سے لدی ہوئی چلی آ رہی ہیں ۔ دروازے پر مکمل تاریکی کا راج تھا۔ فوجی سرداروں میں منشی جعفر علی ، سعادت خان ، راجہ نائر سنگھ ، اخوند کے کچھ سردار دو ہیں پر موجود تھے ۔ انگریز لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ سفر طئے کر رہا تھا اور مجاہدین اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

رات کی تاریکی آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی ۔ فوجی وردیوں میں ملبوس حیدر خان ،چنبیلی ، دینا ناتھ ، ، پنڈت اور طالب احمد اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچ چکے تھے ۔ انگریزوں کا لشکر بے خوف چلا آ رہا تھا۔ اُنھیں پتہ ہی نہیں تھا کہ توپیں درست کر لی گئیں ہیں اور اب بہت جلد اُن پر موت بن کر چھانے والی ہیں ۔ وہ خوشی خوشی آگے بڑھ رہے تھے۔

جیسے ہی مجاہدین نے محسوس کیا کہ اب وہ پوری طرح اُن کی زد میں آ چکے ہیں اُنھوں نے اپنے توپچیوں کو حکم دیا کہ گولے برسانا شروع کر دیں ۔ اُن پر اندھا دھند گولے برسنے لگے اور عین ممکن تھا کہ اُن کے قدم اُکھڑ جاتے لیکن جنرل نکلسن نے اُنھیں حکم دیا کہ وہ اُسی طرح آگے بڑھتے رہیں اور وہ بڑھتے رہے ۔ توپیں اُن پر برستی رہیں اور آخر اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور اُنھیں سخت ہزیمت اُٹھانا پڑی ۔ اُن کا یہ حملہ بُری طرح ناکام بنا دیا گیا۔

مجاہدین نے یہ نہیں دیکھا کہ اُن کی فوج کی ایک ٹکڑی کشمیری دروازے کی طرف بڑھ رہی ہے اور آخر اُنھوں نے پانچ سو گز کے فاصلے پر موجود پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔

ثمن برج کے جھروکے سے حضور بادشاہ سلامت دلّی کا نظارہ کر رہے تھے کہ ملکہ عالیہ زینت محل اُن کے قریب پہنچ گئیں ۔ شاہی آداب بجالائیں اور سوال کیا ،'' حضور بادشاہ سلامت کس نظارے میں محو ہیں؟''

بادشاہ سلامت نے ایک نظر اُن کی طرف دیکھا ،'' دیکھو بیگم ۔۔ تم بھی

دیکھو۔! ہماری دلّی کو دیکھو۔''

ملکہ نے سامنے نظریں دوڑائیں۔

''ملکہ عالیہ! دلّی صرف دلّی نہیں ہے۔ ہمارا دل ہے اور ملاحظہ فرمائیں ہمارا دل کس قدر خون کے آنسوں رو رہا ہے۔ وہ۔۔ وہ دیکھو! بکھرے ہوئے فوجی اسلحہ، اور وہ لرزتی ہوئیں خوبصورت عمارتیں، وہ باغ، وہ تالاب اور وہ بہتی ہوئی جمنا۔۔ خدا جانے ہمارے اس دل کا کیا انجام ہونے والا ہے۔''

ملکہ کا لہجہ بدل گیا، ''حضور بادشاہ سلامت! آپ کیا صرف وہی دیکھتے ہیں جو آپ کا دل سوچتا ہے۔؟ قسمت وہی فیصلہ کرے گی جو ہم سوچتے ہیں۔ ہم یہ جنگ جیت جائیں گے۔''

''بیگم خدا آپ کی دعائیں قبول فرمائے، لیکن فتح قسمتوں سے نہیں تدبیروں سے حاصل ہوتی ہے۔ ویسے بھی آپ جنگ کیا جانیں؟ آپ نے جنگ کو دیکھا ہی کب ہے۔؟''

''بس کیجیے جہاں پناں! آپ کی ان مایوس باتوں سے ہمارا دل بھی بیٹھنے لگا ہے۔ ویسے جنگ کا انجام خواہ کچھ ہو ہم اپنا انتظام کر چکے ہیں۔''

بادشاہ نے پلٹ کر زینت محل کی طرف دیکھا لیکن تب تک وہ وہاں سے رخصت ہو چکی تھیں اور بادشاہ سلامت خاموش کھڑے دلّی کی تباہی کو دیکھ رہے تھے۔

آخر دلّی پر وہ وقت آ ہی گیا تھا۔ دلّی دہل رہی تھی۔ انگریزوں کی فوج میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اُن میں بڑی تعداد اُن ہندوستانیوں کی تھی جو اب بھی اُن کی غلامی میں جنت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے مجاہدین کے جذبات کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ اُن کی حب الوطنی اور جذبۂ آزادی اُن کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ انگریزوں کی قیادت میں اپنے ہی بھائیوں سے لڑنے دلّی کی طرف آ رہے تھے۔ بیرون دلّی انگریز افواج مستحکم ہو چکی تھی اور آخر کار اُنھوں نے دلّی کے خلاف مکمل جنگ کا اعلان کر دیا۔ بادلی سرائے کی جانب سے فوجیں بڑھنا شروع ہوئیں۔ سخت حملہ ہوا۔

مجاہدین کو انگریز افواج نے سنگینوں پر روک لیا، توپیں چھین لیں اور گھیرا ڈال کر پیچھے سے بھی حملہ کر دیا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بے قاعدہ فوج کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ سب شہر کی طرف دوڑ پڑے۔

جنرل بخت خان اپنی افواج کو لے کر قدسیہ باغ کی طرف بڑھا کیونکہ انگریزوں نے وہاں اپنا مورچہ بنالیا تھا۔ وہ اُسے تاراج کرنے پہنچا۔

گھمسان کا رن پڑا، توپیں داغی جانے لگی، مجاہدین ایک ایک انچ کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہے تھے۔ قدسیہ باغ پر انگریزوں کو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ پھر بھی پوری طرح تباہ نہیں ہوئے تھے۔

ٹھیک اُسی وقت جنرل بخت خان تک اطلاع پہنچی کہ کشمیری دروازے کا گڑگج خاموش ہو گیا ہے اور انگریزوں کا لشکر بہت زور مار رہا ہے۔ کیا کیا جائے۔؟

بخت خان کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کے غداروں نے توپوں کو ناکارہ کر دیا ہے لیکن اُس نے ہمت نہیں ہاری اور حکم دیا کہ تمام چھوٹی توپیں فصیل کے سوراخوں میں لگادی جائیں اور گولے برسائیں انشاءاللہ فتح ہماری ہی ہوگی۔

دن تمام مختلف مورچوں پر جنگ ہوتی رہی۔ دلّی کی زمین سرخ ہوگئی۔ جدھر بھی نگاہ اُٹھتی انسانی خون کے دھبے ہی دھبے نظر آتے یا پھر لاشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ آخر رات ہوگئی۔ جنگ تھم گئی۔ اور دونوں فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئیں۔

رات دیر گئے تک سارے ہی انگریز سالار دن بھر کی جنگ کا جائزہ لیتے رہے۔ اُن میں ہڈسن بھی تھا، ولسن بھی تھا، جنرل نکلسن بھی تھا اور مٹکاف بھی موجود تھا۔ وہ سب سمجھ رہے تھے کہ اُنھوں نے مجاہدین کو تباہ و برباد کر دیا ہے لیکن جب ولسن نے جنگی رپورٹ پیش کی تو نکلسن جیسے جابر جنرل کے بھی ہوش اُڑ گئے۔ رپورٹ بتا رہی تھی کہ انگریزوں کا توپ خانہ برباد ہو چکا ہے۔ ۳۳۹ انگریز سپاہی مارے گئے

ہیں۔البتہ مرنے والے ہندوستانی سپاہیوں کی تو شاید گنتی بھی نہیں کی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے مجاہدین کے طریقے جنگ اور اُن کے وسائل کا بھی جائزہ لیا تھا۔ جنرل نکلسن نے بتایا کہ مجاہدین کی بڑی توپیں تو ہم ناکارہ کر چکے ہیں لیکن اُنھوں نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ چھوٹی توپوں کو فصیل کے سوراخوں میں لگا دیا ہے اور گولے برساتے ہیں۔ انگریز سپاہیوں کو نہ تو اُن کی وہ توپیں نظر آتی ہیں اور نا ہی توپچی۔ جس کی وجہ سے اُن پر حملہ نہیں ہو پاتا۔

ہڈسن نے اپنے سالاروں کی طرف دیکھا، ''ہم اس کا بھی بندوبست کرتا ہے۔ ابھی ہمارا دو انجنیئر رات ہی کو مرزا الٰہی بخش کے پاس جائے گا اور کشمیری دروازے کے گڑ گج اور دریائی گڑ گج کا معائینہ کرے گا۔ فصیلوں کے کتنے سوراخوں میں وہ توپیں لگایا ہے اُس کی گنتی کرے گا اور رات ہی کو رپورٹ کرے گا۔''

یہ رات دلّی پر خوف و دہشت کی رات تھی۔ تمام شہریان لرز رہے تھے۔ اپنے اپنے معبدوں کے آگے گڑگڑا رہے تھے اور کچھ سازشی ذہن اپنا کام کرنے میں مصروف تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے اپنے ایک خاص آدمی کے ساتھ اُن دونوں انجینئروں کو جائزہ لینے بھیج دیا تھا، لیکن مجاہدین نے اُنھیں پہچان لیا اور اُنھیں پکڑنے کے لیے دوڑے لیکن وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور جاتے جاتے اُنھوں نے فصیلوں میں لگی توپوں کی گنتی اور اُن کے مقام بھی دیکھ لیے تھے۔

یہ قیامت کی رات بہت آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ آنے والا سویرا دلّی کی تقدیر بتانے کے لیے بے تاب تھا۔ مجاہدین کے گھوڑے رات تمام دلّی کی گلیوں میں دوڑتے رہے۔ فوجی مورچوں کی نہایت باریک بینی سے جانچ ہوتی رہی۔ شہر کے سارے ہی دروازوں پر توپیں چڑھائی جا رہی تھیں۔ فوجیوں کو تعنیات کیا جا رہا تھا۔ مرزا مغل اور بخت خان باہم مشورے بھی کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اور بھی بہت سارے سردار تھے۔ ہر سالار اپنی فوجی ٹکڑی کو شہیدوں کے مرتبے اور غازیوں کی شان کے بارے میں سمجھا رہا تھا، اور ہر سپاہی اقرار کر رہا تھا کہ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ

بھی ملک اور قوم کی خاطر نچھاور کر دے گا۔

صبح جب حیدر خان گھوڑے پر سوار ہوا تو دینا ناتھ نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کے ذہن میں اُسی کا کہا ہوا جملہ گردش کرنے لگا، ''بھگوان آپ کی ساری مصیبتیں میری جھولی میں ڈال دے۔'' تارا دوڑتی ہوئی اُس کے پاس آئی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، ''بھیّا وجے ہو۔'' اُس نے ایک نظر حیدر خان کے چہرے پر ڈالی اور دل ہی دل میں گڑگڑاتی رہی۔ اُس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ حیدر خان نے اُس کے سر پر سے ہاتھ پھیرا اور پھر اُس کے سامنے سے اپنا گھوڑا آگے نکال لیا، پھر چنبیلی، پنڈت، دینا ناتھ، اور طالب احمد کے گھوڑے دروازے سے باہر نکلے۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور اُنھیں دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ سب اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور عجیب عجیب سے وسوسے اُس کے دل و دماغ میں اُبھرنے لگے۔ وہ بے چین سی ہوگئی اور سوچنے لگی، بھیّا میں نے آپ کے حکم پر اپنے آپ کو جنگ میں شریک ہونے سے تو روک لیا، لیکن یہ جنگ کیا نتیجہ دکھائے گی، یہ کوئی نہیں جانتا آپ کی زندگی سے بڑھ کر اس دنیا میں میرے لیے کوئی چیز قیمتی نہیں ہے۔ میں نے دینا ناتھ سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ سائے کی طرح آپ کے پیچھے رہے اور وقت پڑنے پر اپنی جان آپ پر سے نچھاور کر دے اور اگر ایسا ہوا تو میں آنسوں نہیں بہاؤں گی بلکہ تمہاری موت پر فخر کروں گی۔ سچ پوچھو تو بھیّا آپ کے کردار کا پرتو پھر کسی مرد میں مجھے نظر ہی نہیں آیا۔ بھگوان آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اُس کے دل نے کہنا شروع کیا، شاستروں میں لکھا ہے کہ پرارتھنائیں بلائیں ٹال دیتی ہیں۔ اے پربھو میں نے آج تک کوئی پرارتھنا نہیں کی اپنے ہر دُکھ کو چپ چاپ سہن لیا ہے لیکن اے پربھو آج میں کچھ مانگتی ہوں۔ تو خود میرے دل میں جھانک لے کہ میں تجھ سے کیا مانگ رہی ہوں۔ اُس نے اپنی آنکھیں موندلیں تو آنکھوں کا اندھیرا ایک دم روشن ہوگیا اور اُس میں بھگوان شری کرشن، سنت

ایک ناتھ کے ملازم شری کھنڈیا کے روپ میں دکھائی دیئے۔ اُن کے سر پر پانی کا گھڑا تھا اور چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ تارا نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ پانی زندگی کی علامت ہے۔ دھنیہ بھگوان آپ نے مجھے اشارہ دے دیا۔ اُس نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی طاقت کو محسوس کیا اور پھر اُس نے اپنے آپ سے کہا، بھیّا میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتی۔ حالات نے مجھے شاید بزدل بنا دیا ہے، میں دل کی کمزور سہی لیکن ہوں تو فوجی تربیت یافتہ۔ بھیا میں وعدہ خلافی کر رہی ہوں، زندہ بچی تو آپ سے معافی مانگ لوں گی اور اگر۔۔۔تو بھیّا مجھے معاف کر دینا۔ وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچی اور فوجی لباس تبدیل کرنے لگی۔

۱۴، ستمبر کا وہ منحوس دن تھا۔ جنگ کا بگل بجا۔ تازہ دم پنجابی فوجیں نئے آزمودہ ہتیاروں کے ساتھ مقابل میں آئیں اور مجاہدین کی پہلی استقامت کو اُکھاڑ پھینکا۔ بے شمار مجاہدین لقمۂ اجل بن گئے۔

انگریزوں کا لشکر تیزی سے آگے بڑھا۔ جنرل نکلسن نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ وہ کشمیری دروازے کی طرف کوچ کریں۔ یہاں اُن کا مقابلہ بخت خان کی فوج سے ہوا مجاہدین نے اس قدر شدید جوابی حملہ کیا کہ انگریزوں کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ مجاہدین نے بے شمار انگریز اور سکھ سپاہ کے سر اُتار لیے۔ دروازے کی فصیلوں سے چھوٹی چھوٹی توپوں کے گولے انگریزوں کے لیے پیغامِ اجل لا رہے تھے لیکن اس کے باوٴجود نکلسن اپنی فوجوں کے ساتھ کسی طرح کشمیری دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ انگریزوں نے سیڑھیاں لگانا شروع کیا اور جنرل چیخ چیخ کر حکم دے رہا تھا، سیڑھیاں چڑھو، آگے بڑھو، دروازے کے اندر پہنچو، دلّی پر قبضہ کرلو۔ بخت خان نے بندوق برداروں کو حکم دیا کہ وہ اس طرح گولیوں کی برسات کریں کہ انگریزوں کو سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملے۔ بخت خان کے بندوق برداروں نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے سارے ہی سپاہیوں کو بھون کر رکھ دیا۔

ٹھیک اُسی وقت بخت خان کو خبر پہنچی کہ انگریزوں کے لیے تازہ کُمک پہنچ چکی

ہے اور اُن کے سپاہ کسٹم کوٹھی سے آگے بڑھ رہے ہیں اُنھیں روکنا بے حد ضروری ہے۔

اُس نے فوج کی کمان مرزا مغل کے حوالے کی اور خود اپنے فوجی دستے کو لیے کسٹم کوٹھی کی طرف بڑھا۔

ادھر کشمیری دروازے پر انگریزوں کے لشکر کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ حملہ آوروں کے سیلاب کو روکنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ مقابلہ پوری طاقت سے ہو رہا تھا۔ لاشوں کے کشتے کے پشتے لگ رہے تھے۔ گولہ باری پوری ہنر مندی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیری دروازے کی کھڑکی اُڑ گئی اور ایک بڑا خلا ، پیدا ہو گیا اور انگریز ، سکھ، اور دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے ہندوستانی سپاہی تلواریں ، نیزے سامنے کیے تیزی سے دلّی میں داخل ہونے لگے۔

حیدر خان نے جب یہ صورت دیکھی تو اپنے دونوں ہاتھوں میں پستول سنبھال لیا اور گولیاں چلاتا ہوا تیزی سے اُس خلاء کی طرف بڑھنے لگا اور اُس کے مقابل سے ایک فوجی برچھے کی انی سامنے کیے تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ حیدر خان کے پستول گولیاں اُگل رہے تھے اور ایک لمحہ ایسا آ گیا کہ فوجی کا برچھا اُس کے سینے کے آر پار ہو جاتا، لیکن ٹھیک اُسی وقت کسی نے حیدر خان کے گھوڑے پر چپٹی تلوار ماری اور وہ بدک کر دوسری طرف نکل گیا لیکن جو پیچھے تھا برچھے کی انی اُس کے سینے کے آر پار نکل گئی۔ اُس کی چیخ بہت دور تک سنائی دی اور انگریزوں کا لشکر اُسے روندتا ہوا، خون بہاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا۔

حیدر خان نے چیخ سن لی تھی۔ وہ دینا ناتھ تھا۔ اُس نے بھی جواباً چلایا تھا، دینا ناتھ۔۔ دینا ناتھ۔۔ دینا ناتھ۔۔۔۔ لیکن اُس کی لاش فوجیوں کے گھوڑے پامال کر چکے تھے۔ اُسے چکر سے آنے لگے تھے۔ وہ نیچے گرنے ہی کو تھا کہ چنبیلی نے اُسے سنبھال لیا اور اُسے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی۔

جنرل نکلسن کو دلّی کی فتح اب بالکل قریب دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے اپنی فوج کا رُخ اجمیری دروازے کی طرف موڑ دیا۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ توپیں

آگ برسارہی تھیں ۔ لوگوں کی چیخ و پکار تھی ۔ زخمیوں کی تکلیف میں ڈوبی ہوئی آوازیں دلوں کودہلا رہی تھیں ۔کربلائے ثانی کا سورج سوا نیزے پرآچکا تھا۔

نکلسن کی فوجیں قتل عام کرتی ہوئی اجمیری دروازے کے قریب پہنچ گئیں ۔مجاہدین کے فوجی دستوں نے اُن کا نہایت مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہیں لوگوں نے دیکھا ایک نقاب پوش لڑکی سیاہ مردانہ لباس میں ملبوس گھوڑے پر سوار نہایت جرأت کے ساتھ حملے پر حملے کیے جارہی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ لڑتی بھڑتی صفوں کو چیرتی ہوئی بے خوف جنرل نکلسن کے مقابل پہنچ گئی اور اِس سے پہلے کہ جنرل اُسے اپنی بندوق کا نشانہ بناتا ، اُس نے اُس کا سر اُتار لیا تھا۔نکلسن کے مرتے ہی انگریز فوج بے ترتیب ہوگئی ۔لیکن پھر بھی اُنھوں نے اُس بہادر نقاب پوش کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اُسے بچانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی ہی مقابلہ کیے جارہی تھی ۔ آخر تھک کر چور چور ہوگئی اور زمین پر آرہی ۔ زمین پر آتے ہی گھوڑ سوار دستہ اُسے روندتا ہوا کابلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ نقاب پوش کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا تھا ایک سوار تیزی سے اُس کے قریب پہنچا ،رُک کر ایک نظر اُسے دیکھا،'' آہ۔۔۔تارا بجو! آپ بھی شہید ہوگئیں۔''

اور پھر وہ بھی آگے بڑھ گیا۔

نکلسن کے مرتے ہی اگرچہ اُس کی فوج کابلی دروازے میں پناہ لینے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن جنرل منکاف اپنی فوج لے کر جامع مسجد تک پہنچ گیا اور وہاں رُک کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔ جامع مسجد میں ہزار ہا مسلمان نماز پڑھنے کے لیے جمع تھے۔ اُنھوں نے باہر جھانک کر دیکھا، انگریزوں کا لشکر کھڑا تھا اور کسی بھی وقت توپ کے گولے مسجد پر برس سکتے تھے ۔ٹھیک اُسی وقت طالب احمد موزن کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوگیا اور چلا کر کہنے لگا ،'' مجاہدو! اب ہمارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔کل تک یہ ہمارے مذہب سے کھیل رہے تھے اور آج ہماری عبادت گاہوں پر فوج کشی کرنے آگئے ہیں۔ میں تم کو مرنے کا بلاوہ دیتا ہوں۔تم میں سے کون کون اپنی

عبادت گاہ کو بچانے کی خاطر جان دینا چاہتا ہے وہ میرے ساتھ شمالی دروازے کی طرف آجائے اور جس کو جان پیاری ہے وہ جنوبی دروازے کی طرف نکل جائے۔ اُدھر کوئی دشمن نہیں ہے۔''

پھر اُس نے نعرہ لگایا، نعرۂ تکبیر ۔۔۔

اور سب نے جواب دیا، اللہ و اکبر

نعرۂ تکبیر۔اللہ و اکبر

نعرۂ تکبیر۔اللہ و اکبر

مسلمان جوش میں بھرے ہوئے، ہاتھوں میں تلواریں لیے، نعرے لگاتے ہوئے جیسے ہی شمالی دروازے سے باہر نکلے، انگریزوں کا توپ خانہ حرکت میں آ گیا اور پہلے ہی ہلّے میں دوسو سے زاید نمازی مسجد کی سیڑھیوں پر لاشوں میں تبدیل ہو گئے اور بقیہ مسلمان نعرے لگاتے ہوئے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ دوبدو جنگ شروع ہو گئی۔ بہت دیر تک خون خرابہ ہوتا رہا اور آخر انگریزوں کا دلّی پر قبضہ ہو گیا۔

حیدر خان کے ہوش گم تھے۔ دینا ناتھ کی قربانی نے اُسے توڑ دیا تھا۔ وہ اُس کا دوست تھا، لاڈلی بہن تارا کا شوہر تھا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ہی اُس کی بہن کا سنسار تباہ ہو گیا تھا، حالانکہ اُسے ابھی تارا کے ختم ہونے کی اطلاع نہیں تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چنبیلی اُسے لیے دیوڑھی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ سلیم نے اُسے دیکھ لیا وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا اُس کے قریب آیا اور اُسے اطلاع دی، '' بجو! انگریزوں کا دلّی پر قبضہ ہوئی گیا ہے۔''

تارا نے اُس سے فوراً کہا، '' بھیا تم اپنی بیوی کو لے کر سیدھا درگاہ نظام الدین پہنچو۔ یہ وقت یہاں ٹھہرنے کا نہیں ہے۔ میں بھی وہیں پہنچ رہی ہوں۔ انگریز اب قتل عام کریں گے۔ سلیم جس قدر جلد ہوسکتا ہے اُس قدر جلد یہاں سے نکلو۔ جاؤ۔۔۔''

سلیم کا گھوڑا آگے نکل گیا۔

انگریزوں نے دلّی پر وقبضہ کرتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سرکاری عمارتوں کو اپنے قبضے میں لینا شروع کیا۔ ساتھ ہی اُن کے سامنے جو بھی آتا وہ اُسے قتل کرتے جاتے تھے۔

چنبیلی نے دلّی سے باہر نکلنے کا بہت صحیح فیصلہ کیا تھا۔ پھر اُس نے دیکھا ہزار ہا افراد بھاگے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ دیوڑھی پہنچی۔ ضروری سامان ساتھ لیا اور تیزی سے چل پڑی۔

لاہوری دروازے سے دیوان عام تک پہریدار کھڑے ہوئے ہیں۔ سب کے چہرے اُداس ہیں۔ فضاء میں بارود کی بو بسی ہوئی ہے۔ سب ہی کے ذہن میں ایک خوف ایک ڈر بسا ہوا ہے۔ خبریں قلعے تک پہنچ چکی ہیں لیکن زبان کون کھولے؟ بادشاہ کے حضور کون پہنچے؟ اور کون یہ منحوس خبر گوش گزار کرے۔؟ حضور بادشاہ سلامت لمبے لمبے قدموں سے بے تابانہ ٹہل رہے ہیں۔ چہرے پر فکر و تردد دکھائی دے رہا ہے لیکن ہمدردی کے دو لفظ کہنے کا بھی کسی کو یارا نہیں ہے۔ دور سے مرزا الٰہی بخش آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ چہرے پر بظاہر ملال ہے لیکن دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ وہ حضور کے روبرو پہنچ گیا اور نہایت ادب سے کہا، ''حضور کا اقبال بلند رہے! لیکن آج جو خبر اس غلام کی زبان سے نکلنے کے لیے بے تاب ہے، وہ خبر برداشت کرنے کی خود اس غلام میں بھی طاقت نہیں ہے۔''

بادشاہ سلامت نے رُک کر مرزا الٰہی بخش کی طرف دیکھا، ''مرزا! کاتب تقدیر کے نوشتہ کو سنانے میں کیسی خجالت! بے خوف کہو، یہ بوڑھا بادشاہ اللہ کے ہر فیصلے پر صابر و شاکر رہے گا۔ بیان کرو۔''

مرزا الٰہی بخش کی گردن جھک گئی اور آواز آہستہ سے نکلی، ''حضور بادشاہ سلامت! ہم دلّی ہار گئے ہیں۔''

''کیا۔'' بادشاہ سلامت پر گویا سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اُنھوں نے صدمے

سے آنکھیں بند کرلیں اور پوری دلّی اُن کی آنکھوں میں بھیانک شور کے ساتھ گردش کرنے لگی۔ اُنھیں چکر سے آنے لگے۔ اُنھوں نے لرزتے ہاتھوں سے مرزا کے کندھے پکڑ لیے اور اُن کی زبان سے نکلا،''مرزا۔''

''جی ہاں حضور ہم دلّی ہار چکے ہیں۔'' وہ مزید وضاحت سے بیان کرنے لگا ''شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ پورے شہر میں قتل عام ہو رہا ہے۔ لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ پھانسی کے پھندے لٹک رہے ہیں اور آپ کے وفاداروں کی گردنیں ناپی جا رہی ہیں۔''

بادشاہ سلامت نے آسمان کی طرف دیکھا۔ خود کو سنبھالا اور پوچھا،''اور وہ ہمارے سپہ سالارِ اعظم بخت خان۔؟''

''بخت خان؟'' مرزا نے بُرا سا منہ بنایا،''ناکامی کے بوجھ سے دبے ہوئے مارے مارے پھر رہے ہوں گے یا پھر انگریزوں سے معافی کے خواستگار ہوں گے۔''

بادشاہ سلامت کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

اور تب ہی ایک کنیز داخل ہوئی، شاہی آداب بجالائی اور عرض کیا،''حضور جنرل بخت خان باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔''

''اُنھیں اجازت ہے۔'' حضور نے بہت ہی آہستہ سے کہا

''تب تو حضور ہمیں اجازت دیں!'' مرزا الٰہی بخش آداب کے لیے جھکا ہی تھا کہ بادشاہ نے اُسے روک دیا،''نہیں مرزا، تم بھی یہیں پر موجود رہو گے۔''

بخت خان حاضر ہوا، شاہی آداب بجالایا،''حضور کا اقبال بلند رہے۔''

بادشاہ سلامت نے اُس کی طرف دیکھا،''بخت خان اب تو اقبال ہی نہیں رہا تو کیسی بلندی! آہ۔۔۔ تم سے بھی کچھ نہ ہو سکا۔''

بخت خان نے گردن جھکا دی،''حضور نا اُمید نہ ہوں۔ اگرچہ انگریزوں نے شہر پر قبضہ کرلیا ہے لیکن اس سے ہمارا زیادہ نقصان نہیں ہوا تمام ہندوستان آپ کے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی نظر آپ پر اور آپ کے حکم پر لگی ہوئی ہے۔ حضور کچھ تردد نہ

فرمائیں، میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔ میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی زبردست مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی وہاں نہ آسکے گا۔ حضور دلّی پایۂ تخت ہے فوجی قلعہ نہیں۔ لڑائیوں کے لیے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے۔۔ اگر حضور میرے ساتھ چلیں تو چند روز میں ہر چیز درست کر دوں گا اور آپ کو ہر فکر اور تکلیف سے محفوظ رکھوں گا۔''

''جنرل بخت خان!'' حضور کی آواز لرز رہی تھی، ''تم واقعی ہمارے وفادار ہو۔ تم مقبرۂ ہمایوں میں ہم سے ملیں، ہم تب تک کچھ غور کر لیں گے۔''

''جو حکم۔'' بخت خان نے شاہی آداب ادا کیے اور وہاں سے لوٹ گیا۔

اُس کے جاتے ہی مرزا الٰہی بخش نے پھر ایک بار اپنا پانسا پھینکا اور نہایت ادب سے کہا، ''حضور اگر لب کشائی کی اجازت دیں تو کچھ عرض کروں۔؟''

حضور نے آنکھوں کے اشارے سے اجازت دے دی۔

''حضور میں آپ کا خون ہوں۔'' اُس نے کہنا شروع کیا، ''آپ کے حق میں زیادہ مناسب مشورہ دے سکتا ہوں۔ آپ جنرل بخت خان کی باتوں میں نہ آئیے۔۔۔ حضور فرنگیوں سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں جنرل صاحب سے کہہ کر آپ کے تمام معاملات کی صفائی کر دوں گا۔''

بے بس بادشاہ، مرزا الٰہی بخش کو دیکھتا رہا اور لال قلعے کی سنگی عمارتیں اُس بادشاہ کو غور سے دیکھ رہی تھیں جو مخلص اور مکار کو پہنچاننے کی تمیز بھی کھو چکا تھا۔ اسی دیوان عام میں مغل تاجداروں نے کیسے کیسے اہم فیصلے کیے تھے۔ اسی دیوان عام میں کس کی جرأت تھی جو عالم پناہ کو پناہ دینے کی پیش کش کر سکے۔ آسمان میں بے شمار پرندے اُڑ رہے تھے۔ آوازیں کر رہے تھے۔ لیکن اُن کی بولیوں کو کون سمجھتا؟ وہ خدا سے دعائیں کر رہے تھے یا غداروں پر لعنتیں بھیج رہے تھے۔ یا بے بس بادشاہ کی قسمت پر واویلا کر رہے تھے۔

دلّی میں قتل عام اس بے دردی سے ہو رہا تھا کہ نادر شاہ کی تاریخ بھی بے معنی لگنے لگی تھی۔ جو جہاں ملا قتل ہوا، کوئی بندوق کی نذر ہوا، اور کوئی پھانسی پر جھول رہا تھا۔ شہر میں جگہ جگہ لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان ہی لاشوں میں حکمت یار خان کی بے گردن لاش بھی پڑی ہوئی تھی اور اُن کا مرغ جہانگیر اُن کی لاش کے قریب کھڑا اذان دے رہا تھا۔ خواتین کی لاشیں گوشے پردے سے بے نیاز پڑی ہوئی تھیں۔ انگریز فوجیوں کے گھوڑے دندناتے ہوئے سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ قصوروار بے قصور، شریف رذیل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ پھانسی کے پھندے درختوں پر لٹک رہے تھے۔ سپاہی جسے چاہتے پکڑ لاتے اور پھانسی پر چڑھا دیتے تھے۔ عورتوں کی رونے بلبلانے کی صداؤں سے پوری دلّی ایک ماتم کدہ بن چکی تھی۔ آہ وفغاں کا بازار گرم تھا۔ اور ایسے میں مرزا الٰہی بخش اپنے محل میں بیٹھا اپنی سازش کا آخری پھندا پھینک رہا تھا۔ اُس کے سامنے رجب علی مردود کھڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا، ''رجب علی! آپ فوراً ہڈسن صاحب کے حضور پہنچیں اور اُنھیں ہمارا پیغام دیں کہ ہم نے کٹھ پتلی بادشاہ کو بخت خان سے آزاد کرالیا ہے۔ وہ اب ہماری اُنگلیوں کے اشارے پر ناچے گا۔ رجب علی آپ اُن سے یہ بھی کہیں کہ صبح مقبرہ ہمایوں میں بخت خان مشرقی دروازے سے داخل ہوگا اور ناکام واپس ہو جائے گا۔ آپ مغربی دروازے پر انتظار کریں۔ میں خود بادشاہ کو گرفتار کرادوں گا۔''

رجب علی نے مرزا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو اُس نے اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی اُس کے طرف اُچھال دی اور وہ وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

چنبیلی کے پیچھے بے سروسامانی کے عالم میں ہزار ہا افراد ننگے سر ننگے پاؤں کچھ پاپیادہ، کچھ جانوروں پر سوار کچھ بیل بنڈیوں میں لدے بھاگے جا رہے تھے۔ بچے بلک رہے تھے۔ خواتین خوف سے لرزتی ہوئیں قدم بڑھا رہیں تھیں۔ عجب قیامت کی گھڑی تھی۔ وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتیں لیکن اُن کے پیچھے بھی کیا تھا۔؟ اُن

ہی کی طرح بے بس چہرے، خوف و دہشت کے مارے بس بھاگے جا رہے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آخر اُن کی منزل کیا ہوگی؟ وہ کہاں پہنچیں گے۔؟ پہنچیں گے بھی یا پھر کوئی فرنگی فوج آئے گی اور انھیں دبوچ لے گی۔ وہ بس دلّی سے بھاگ رہے تھے۔ جدھر بھی نگاہ اُٹھتی لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ دونوں کے گھوڑے برق رفتار دوڑ رہے تھے۔ کوچہ چیلاں کو الوداع کہتے ہوئے وہ دونوں جب سرائے کالے خان تک پہنچے تو سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ وہ اندھا دھند گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ دور سے اُنھیں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کا گنبد نظر آنے لگا۔ چنبیلی نے حسرت بھری نظروں سے گنبد کی طرف دیکھا۔ زمین تا آسمان عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ دونوں نے کچھ لمحوں کے لیے اپنے گھوڑوں کو روک لیا۔ دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ چنبیلی نے آسمان کی طرف دیکھا، آسمان میں سورج نہیں تھا۔ اُس نے نظریں سامنے کیں۔ دور۔۔۔ اُفق کے اُس پار سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ سوچنے لگی، آج دلّی کے سر سے عظمتوں کا تاج اُتر گیا ہے۔ دلّی جو شاہانِ مغلیہ کی آن بان کی بولتی تصویر تھی جو اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی، وہ دلّی جس کے شاہوں نے ایک گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھایا تھا۔ وہ دلّی آج قتل ہوگئی ہے۔ یا حضرت نظام الدین آپ کی دلّی آج سے مرحوم دلّی کہلائے گی۔ آہ۔۔ آپ۔۔۔ اُس نے ایک نگاہ گنبد پر ڈالی تو آسمان کی وسعتوں سے ماتمی شور بلند ہوا،

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

حیدر خان اور چنبیلی کے ساتھ ہی ساتھ سلیم اور نیلوفر گھوڑے سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگے اور اُن کے پیچھے بے یار و مددگار، شکست خوردہ، پریشان حال افراد کا ایک قافلہ چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

(۱۹)

چلچلاتی دھوپ میں یہ قافلہ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ٹھہر گیا۔ دور دور تک ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔ ندی کے کنارے اونچے اونچے درخت تھے۔ ان درختوں کے نیچے یہ لٹے پٹے گھبرائے ہوئے افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ تین تین پتھروں کے چولہے روشن تھے۔ عورتیں اُن پر کھانا پکا رہی تھیں اور بچے ندی میں پانی سے کھیل رہے تھے۔

ایک درخت کے نیچے حیدر خان اور سلیم بیٹھے ہوئے تھے۔ چنبیلی اور نیلوفر کچھ پکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ حیدر خان کے چہرے پر اب بھی وہی مایوسی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ سلیم نے حیدر خان کی طرف دیکھا اور پوچھا، '' بھائی جان آپ جانتے ہیں یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔؟''

''ابھی تک تو کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ آگے شاید معلوم ہو جائے۔''

سلیم نے پریشان حال قافلے پر طائرانہ نظریں ڈالیں۔ زندگی، زندگی سے نبرد آزما تھی۔ اُس کے لبوں سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ اُس نے پھر ایک بار حیدر خان کی طرف دیکھا، ''بھائی جان! کیا دلّی کی ہار مجاہدین کی مکمل ہار قرار دی جائے۔؟''

حیدر خان نے بہت دور تک دیکھا، اُسے دور دور تک پھیلی ہوئی وحشت ہی دکھائی دی، ''سلیم میاں! مغل بادشاہ کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن پھر بھی مرکزیت باقی تھیں۔ لوگ اُن کے نام ہی پر جمع ہو رہے تھے۔ اب وہی نہیں رہے تو مرکزیت ہی

کہاں رہ گئی ۔ اب تو انگریز کیا اودھ، اور کیا جھانسی اور کیا کانپور سب کچھ فتح کر لیں گے ۔ ہمارا ایک ایک سورما مارا جائے گا یا غدارِ وطن اُس کی نشاندہی کریں گے اور وہ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے گا اور وہ راجے رجواڑے، نواب جاگیردار، جو کل تک مجاہدین کے ساتھ تھے اپنی بقاء کے لیے انگریزوں سے مل جائیں گے ۔'' اُس نے نظریں جھکا دیں، ''ملک کی آزادی کا خواب اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ۔''

سلیم خاموش ہو گیا ۔ اُس نے اوپر سے بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھا جو راستے میں حائل چٹانوں کی پرواہ کیے بغیر اپنا راستہ بناتے ہوئے بہہ جا رہی تھی ۔ بچوں نے ایک نیا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ وہ پانی کے دھارے کو ریت کی دیوار بنا بنا کر روکنے کی کوشش کرتے اور پانی کا دھارا کچھ لمحوں کے لیے رُک جاتا لیکن پانی کی طاقت پھر ایک جگہ جمع ہوتی اور ریت کی اُس دیوار کو بھی بہا لے جاتی اور اُس کی روانی حسبِ معمول ہو جاتی ۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو سلیم میاں ۔'' حیدر خان نے سلیم کے کندھے کو تھپتھپایا ۔

سلیم کے چہرے پر معنیٰ خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، ''بھائی جان ! ایک بات کہیں ۔'' اُس نے حیدر خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، ''یہ فرنگی خواہ چٹان بن کر سامنے آ جائیں، خواہ وقت دیواریں کھڑی کر دے ۔ ہندوستانیوں کی آزادی کی چاہ میں بہنے والا یہ دھارا ہرگز نہیں رُکے گا بھائی جان ! ایک نہ ایک دن انگریزوں کو یہاں سے جانا ہی پڑے گا ۔''

حیدر خان نے سلیم کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی ۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا، ''میرے بھیا! میں نے اپنے پیچھے آنے والی نسل کو تو دیکھا ہی نہیں تھا اور ہمت ہار بیٹھا تھا ۔ سچ کہتے ہو تم، جب تک اس ملک میں تمہارے جیسے نوجوان پیدا ہوتے رہیں گے ایک فرنگی تو کیا ہر سامراجی طاقت کو یہاں سے جانا ہوگا ۔ شاباش ! سلیم تم نے مجھے دوبارہ زندگی سے جوڑ

دیا۔ اب ہم بے سمتی کا سفر نہیں کریں گے۔''

دونوں کے چہروں پر اُمید بھری مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دونوں اُس چھوٹی سی لیکن بہتی ہوئی ندی کو دیکھنے لگے۔

کتابیات

سلسلہ نشان	نامِ کتب	مصنف/مرتب
۱)	تاریخ جنگِ آزادی اٹھارہ سو ستاون	سید خورشید مصطفیٰ رضوی
۲)	داستان اٹھارہ سو ستاون	(مرتب) فاروق ارگلی
۳)	انسائکلو پیڈیا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی شخصیات	مسعود الحسن خان روہیل
۴)	۱۸۵۷ء شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی	(بارہ یادگار کتابیں۔ نیا ایڈیشن شائع کردہ۔۔خواجہ حسن ثانی نظامی
۵)	۱۸۵۷ء نکات اور جہات	(مرتب) حسن مثنیٰ
۶)	۱۸۵۷ء پہلی جنگِ آزادی۔ واقعات وحقائق	میاں محمد شفیع
۷)	۱۸۵۷ء تاریخِ بغاوت ہند	پنڈت کنہیا لال
۸)	سرگزشت دلی	(مرتب) ڈاکٹر درخشاں تاجور
۹)	خدنگِ غدر	معین الدین حسن خان (مرتب) پروفیسر ابن کنول
۱۰)	۱۸۵۷ء پہلی جنگِ آزادی	(مرتب) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
۱۱)	صحیفہ کتاب ۱۸۵۷ء	(مرتب) رفاقت علی
۱۲)	نوبت پنج روزہ (وداع ظفر)	علامہ راشد الخیری
۱۳)	مونوگراف۔۔ بہادر شاہ ظفر	ڈاکٹر نگار عظیم

(۱۴	قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں	عرش تیموری (مرتب) اسلم پرویز
(۱۵	۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات	سید ظہیرالدین دہلوی
(۱۶	لال قلعے کی ایک جھلک	حکیم خواجہ سید ناصر۔ نذیر فراق دہلوی
(۱۷	گذشتہ لکھنؤ	مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی
(۱۸	داراشکوہ	قاضی عبدالستار
(۱۹	ظفر کا فسانۂ غم	مولانا عبداللہ فاروقی
(۲۰	کبیر	شکیل الرحمان
(۲۱	امیر خسرو کی جمالیات	شکیل الرحمان
(۲۲	جہان امیر خسرو	(مرتب) فاروق ارگلی
(۲۳	کبیر	مصنف۔ پربھاکر ماچوے مترجم۔ سید خواجہ معین الدین
(۲۴	سارے دن کا تھکا ہوا پُرش	صلاح الدین پرویز
(۲۵	انتخاب کلام نظیر اکبرآبادی	فاروق ارگلی
(26	Indian Army through the ages	By- LT Col. Gautam Sharma

☆☆☆

تعارف

نام : سید نورالحسنین نقشبندی

قلمی نام : نورالحسنین

والد : سید نورالوحید نقشبندی (مرحوم)

والدہ : غوثیہ بیگم (مرحومہ)

تاریخِ پیدائش : ۱۹/مارچ ۱۹۵۰ء اورنگ آباد (مہاراشٹر)

تعلیم : ایم۔اے (اردو)

ملازمتیں : معین العلوم ہائی اسکول اورنگ آباد

اناونسر آکاش وانی اورنگ آباد

گیان وانی اورنگ آباد

نصف بہتر : یاسمین حسنین (وفات۔ یکم اگست ۱۹۹۴ء)

اولادیں : سید نورالوحید فرحاج۔ سیدہ بتول فاطمہ

سید نورالفرید فرحان۔ سیدہ عائشہ فاطمہ

دیگر کتابیں :

☆ سمٹتے دائرے (افسانے) ۱۹۸۵ء

☆ مور رقص اور تماشائی (افسانے) ۱۹۸۸ء

☆ گڑھی میں اُترتی شام (افسانے) ۱۹۹۹ء

☆ فقط بیان تک (افسانے) ۲۰۱۲ء

☆ خوش بیانیاں (خاکے) ۲۰۰۳ء

☆ آہنکار (ناول) ۲۰۰۵ء

☆ انسان امر ہے (ڈرامے اور فیچرز) ۲۰۰۹ء

☆ بچوں کے لیے ”گڈو میاں“ (کہانیاں) ۱۹۸۸ء

☆ حضور کا اقبال بلند رہے (ڈرامے) ۲۰۰۸ء

☆ چوتھا شہزادہ (کہانیاں) ۲۰۰۹ء

☆ نیا افسانہ۔ نئے نام (تنقید) ۲۰۱۲ء

☆ اقبال متین سے اُنسیت (اقبال متین پر تنقیدی کتاب) ۲۰۱۲ء

اعزاز وانعام : مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو ساہتیہ اکادمی کا ''شاد سراج اورنگ آبادی'' ریاستی ایوارڈ (۲۰۰۹ء)

''سمٹتے دائرے''۔ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی

اتر پردیش اردو اکادمی

''مور رقص اور تماشائی''۔ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی

''گڑھی میں اترتی شام''۔ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی

صحافت : مزاحیہ کالم۔ فرمایا نورالحسنین نے (روزنامہ: آج)

مزاحیہ کالم ''بات سے بات''، روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز

مدیر : ولرس۔ کتابی سلسلہ (سہ ماہی)

درسی نصاب میں شمولیت : افسانہ۔ گڑھی میں اترتی شام۔ ایم۔اے (اردو)

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

ڈرامہ۔ حضور کا اقبال بلند رہے۔ بی۔اے (سالِ دوم)

ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

افسانہ۔ بارش۔ گیارہویں جماعت (مضمون اردو)

مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، پونا (مہاراشٹر)

رہائش: مکان نمبر: 1-12-31، پرگتی کالونی۔ محلہ گھاٹی

اورنگ آباد (مہاراشٹر) پن کوڈ: 431001

موبائل نمبر: 09890849736

E-mail:- noorulhusnain@ymail.com
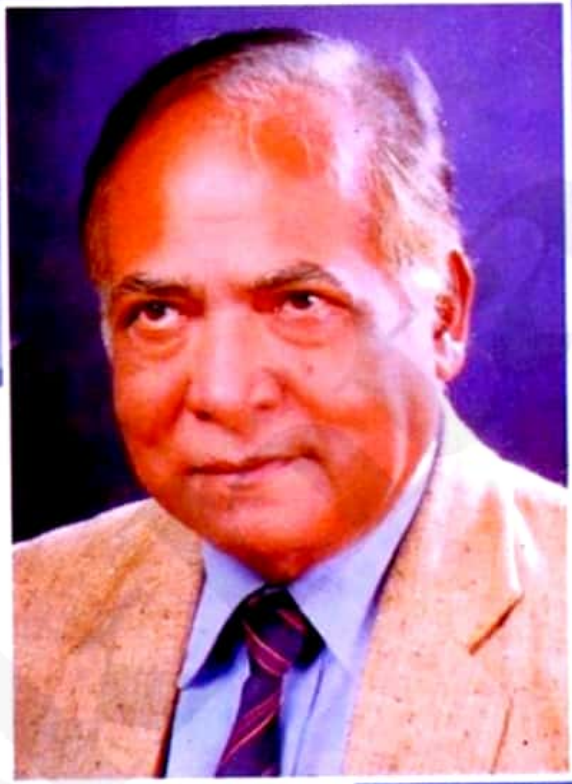
ماضی اور تاریخ کے حوالے سے ایک
ایسی کائنات کی تشکیل، جہاں صدیوں
کا درد حقیقت کی بے رحم کہانی سنانے کو
موجود ہو تو یہ کام کوئی آسان کام نہیں۔
اس ذمے داری کو وہی قبول کر سکتا ہے جو ماضی کے استعارے سے
ہر ممکن تخلیقی امکانات کو ناول کا موضوع بنانے میں مہارت رکھتا ہو...
.. اور یہ کام نورالحسنین نے اس ناول میں بخوبی انجام دیا ہے.....
1857 جہاں آزادی کے احساس کے ساتھ ایک بڑی نظریاتی
تبدیلی غلام ملک کے سماجی اور سیاسی ڈسکورس کا حصہ بن رہی تھی...
ماضی اور حال کی کشمکش کے آئینے میں یہ ناول حقیقت اور اظہار کا ایسا
راست بیان ہے جس سے کسی ملک کی تعمیر میں مضمر تخلیقی اور تہذیبی
عمل کو بااسلوب سمجھا جا سکتا ہے۔
-مشرف عالم ذوقی
Aiwaanon Ke Khoabeeda Charagh
Noorul Hasnan
arshia publications
ISBN 978-93-81029-37-0
9 789381 029370
A for Arshia Publications